ادب اور نفسیات: منتخب کالم نگاروں کے ہاں یوٹوپیا کے رجحان کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اردو)

مقالہ نگار

صباحت مشتاق

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اکتوبر، ۲۰۲۲ء

ادب اور نفسیات: منتخب کالم نگاروں کے ہاں یوٹوپیا کے رجحان کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

مقالہ نگار

صباحت مشتاق

یہ مقالہ

پی ایچ۔ڈی (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان وادب)

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اکتوبر، ۲۰۲۲ء

©صباحت مشتاق

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں۔ اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: ادب اور نفسیات: منتخب کالم نگاروں کے ہاں یوٹوپیا کے رجحان کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

پیش کار: صباحت مشتاق رجسٹریشن نمبر: 879 PhD/Urd/F19

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان وادب

ڈاکٹر نازیہ یونس ____________________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ____________________

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

میجر جنرل شاہد محمود کیانی، ہلال امتیاز (ملٹری)(ر) ____________________

ریکٹر

تاریخ ____________________

اقرار نامہ

میں، صباحت مشتاق حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی کام ہے۔اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کی پی ایچ ڈی اسکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر نازیہ یونس کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

صباحت مشتاق

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

صفحہ نمبر	عنوان
ii	مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم
iii	اقرار نامہ
iv	فہرست ابواب
viii	Abstract
x	اظہارِ تشکر
۱	**باب اول: موضوعِ تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث**
۱	**الف۔ تمہید**
۱	i. موضوع کا تعارف
۲	ii. بیان مسئلہ
۲	iii. مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق
۳	iv. تحقیق کی اہمیت
۴	v. تحدید
۴	vi. مقاصد تحقیق
۴	vii. تحقیقی سوالات
۵	viii. نظری دائرہ کار
۶	ix. پس منظری مطالعہ
۸	x. تحقیقی طریقہ کار
۸	**ب۔ بنیادی مباحث**

ا۔ کالم کی تعریف	۸
کالم نگاری۔ روایت اور اقسام	۱۱
کالم نگاری اور معاشرہ	۱۹
پاکستان کے اہم اخبارات اور کالم نگاری	۲۶
ادب اور نفسیات	۲۹
ج۔ یوٹوپیا	۳۱
یوٹوپیا کے عناصر	۳۳
اقبال کا تصور آئیڈیلزم	۳۵
تکمیل پسندی	۳۷
یوٹوپیا کی سماجی تعبیر	۳۸
یوٹوپیا کی نفسیاتی تعبیر	۴۱
یوٹوپیا کی سیاسی تعبیر	۴۸
ادب اور یوٹوپیا	۵۰
یوٹوپیائی ادب کی خصوصیات	۵۲
افلاطون کا یوٹوپیا	۵۵
تھامس مور کا یوٹوپیا	۵۶
اردو کالم اور یوٹوپیا	۷۷
د۔ منتخب کالم نگاروں کا مختصر تعارف	۷۷
حوالہ جات	۸۲

باب دوم: منتخب مذہبی و ادبی کالموں میں یوٹوپیا کے رجحان کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ ۸۶

۱۔ اسلاموٹوپیا کے بنیادی رجحانات کا جائزہ ۸۶

۲۔ منتخب مذہبی و ادبی کالم نگاروں کے ہاں اسلاموٹوپیا یوٹوپیا کے رجحان کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (اوریا مقبول جان، خورشید احمد ندیم، کشور ناہید) ۹۱

حوالہ جات ۱۶۰

باب سوم: منتخب سیاسی و سماجی کالموں میں یوٹوپیا کے رجحان کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ ۱۶۳

۱۔ سیاسی و سماجی یوٹوپیا کے رجحانات کا جائزہ ۱۶۳

۲۔ منتخب سیاسی و سماجی کالم نگاروں کے ہاں یوٹوپیا کے رجحان کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (جاوید چوہدری، ہارون رشید، ارشاد بھٹی) ۱۶۷

حوالہ جات ۲۴۵

باب چہارم: منتخب فکاہی کالموں میں یوٹوپیا کے رجحان کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ ۲۴۸

۱۔ فکاہی کالم نگاری کی تکنیک ۲۵۰

۲۔ منتخب کالم نگاروں کے ہاں یوٹوپیا کے رجحان کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (عطاء الحق قاسمی، منو بھائی) ۲۵۴

حوالہ جات ۲۸۷

ماحصل ۲۸۹
الف۔ مجموعی جائزہ ۲۸۹
ب۔ نتائج ۳۰۱
ج۔ سفارشات ۳۰۲
کتابیات ۳۰۳
انٹرویو ۳۱۱

ABSTARCT

The topic of this research thesis is:

"A Research and analysis of Utopian elements in the columns of 21st century".

The main objective of this research paper is to identify and search for this trend in the columns of 21st century. Utopia is known as human activity and a psychological trend also. This trend is found in both English and Urdu literature. In this perspective the purpose of selecting this topic for the present research is to critically analyse this trend in Urdu- columns in order to elaborate its relationship with society. For this purpose,main research questions have been formed as under:

1. To search utopia as a shared trend in the discipline of psychology and literature.
2. To identify the reasons working as a background for this psychological trend in the selected columnists of 21st century.
3. To apprehend their philosophy and ways of life by the presence of this trend.
4. To highlight this literary and psychological trend in individuals, literature and society respectively.

As an individual of 21st century, today's man is facing more problems than that of the past. These problems are mostly related to his inner-self. He is fighting with loneliness, strangeness and absurdity. The sole purpose of this research study is to analyse how well the columnists of 21st century have depicted their contemporary life and further to evaluate how successful they have been in the realistic depiction of their society. In this way, it will be found out how they have escaped from present dystopia and in this process finally how successful they are in creating an ideal society with the help of escapism and utopian-trends.

Basically the nature of this research is not quantitative and statistical one. Keeping this fact in mind, all columns of selected columnists written in the 21st century will be critically evaluated and analysed. So qualitative research methodology along with descriptive method will be applied in this research. After collection and compilation of relevant research materials, analytical research methodology will be also applied. Further, research questions will be

addressed by the help of documentary research method. To make this research absolute, reliable and authentic, related columnist will be approached to get their personal views about the topic. Authentic critical books from libraries will also be consulted to make research findings more fruitful.

اظہارِ تشکر

سب سے پہلے مجھ پر خدائے بزرگ و برتر کا شکر واجب الادا ہے کہ جس کے خاص لطف و کرم نے تحقیق کے تمام مشکل مراحل کو میرے لیے آسان بنایا اور مجھے اس قابل کیا کہ ڈاکٹریٹ کے مقالہ کو تکمیلی شکل دے سکوں۔

اس مقالے کی تکمیل میں میری مشفق و گرامی قدر استاد و راہنما ڈاکٹر نازیہ یونس نے حسب توقع ہر موقع پر میری راہنمائی و دستگیری فرمائی جس بنا پر آج مجھے یہ سعادت حاصل ہوئی ہے ۔ میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ان کی شکر گزار ہوں کہ اس راہِ پُرخار میں ہر سطح پر انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے ہر بار نئے عزم سے نوازا۔ رب العزت کی بارگاہ میں ان کی صحت و سلامتی کے لیے دعاگو ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ شعبے کی صدر محترمہ ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان کی نہایت شکر گزار ہوں کہ ان کے تعاون اور شفقت سے یہ بار گراں اٹھایا جاسکا۔ میں محترم ڈاکٹر محمد شفیق انجم، ڈاکٹر ظفر احمد اور ڈاکٹر صوبیہ سلیم کی بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے عنوان کے انتخاب میں میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔ میں اپنے تمام اہل خانہ کے پُر خلوص تعاون اور اعلیٰ جذبات کے لیے بے حد مشکور ہوں کہ انھوں نے مجھے منزل تک پہنچنے کے راستے فراہم کیے۔ سب سے زیادہ اپنے پیارے بیٹے ارمغان عادل کی مشکور ہوں کہ وہ وقت جس پر اس کا حق تھا میں نے اس کام میں صرف کیا۔ اللہ ان سب کو جزائے خیر دے! (آمین)

صباحت مشتاق

باب اول

موضوعِ تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

i۔ موضوع کا تعارف(INTRODUCTION)

زیر نظر تحقیقی مقالے کا موضوع " ادب اور نفسیات: منتخب کالم نگاروں کے ہاں یوٹوپیا کے رجحان کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ " ہے۔ نفسیات انسانی ذہن کے مطالعہ کا علم ہے۔ فرد کے ذہن اور اس کے افعال کا مطالعہ علم نفسیات کے دائرہ کار میں آتا ہے۔ اسی طرح ادب معاشرے کا عکاس اور اس کی تنقید ہے۔ علم نفسیات فرد کی سوچ اور اس کے رویے کے مطالعہ کا نام ہے۔ افراد مل کر معاشرہ تشکیل دیتے ہیں اور یوں فرد کے وہ انفرادی معاملات جنہیں علم نفسیات زیر بحث لاتا ہے، ادب مجموعی طور پر ان رویوں کی فنکارانہ عکاسی کرتا ہے۔ ادب کو اسلوب اور موضوع کے لحاظ سے دو اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔(۱) افسانوی ادب۔ (۲) غیر افسانوی ادب۔

افسانوی ادب کے دائرے میں داستان، ڈراما، ناول اور افسانہ آتے ہیں جب کہ غیر افسانوی ادب میں سفر نامے، کالم، انشایئے اور مضمون وغیرہ شامل ہیں۔

صحافت کی اصطلاح میں کالم سے مراد وہ تحریر ہوتی ہے جس میں کوئی لکھاری کسی اخبار کے ادارتی صفحے پر یا کسی اور صفحے پر حالاتِ حاضرہ، سیاست، معیشت، معاشرت، ادب، کتاب و صاحبِ کتاب، کسی شاعر ادیب یا دیگر موضوعات پر مختصر تجزیہ کسی بھی ایک عنوان کے تحت قلم بند کرے۔اس طرح کی تحریر لکھنے والا کالم نگار کہلاتا ہے۔

موضوعات کے لحاظ سے کالم کی مختلف اقسام ہیں جن میں سیاسی، معاشی، معاشرتی، دینی، ادبی، سائنسی، طبی اور کھیل کے موضوعات پر لکھے گئے کالم شامل ہیں۔

الغرض کالم کسی اخبار یا رسالے میں مستقل عنوان کے تحت لکھی جانے والی تحریر کو کہا جاتا ہے جو کسی موضوع یا عنوان پر تبصرہ کرنے کے ساتھ ساتھ واقعات کے اسباب و محرکات پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ اخبارات میں درج کالم زندگی اور معاشرے کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ان کا اسلوب مزاحیہ ،طنزیہ اور سنجیدہ ہو سکتا ہے۔ حالاتِ زندگی پر تبصرہ کرنے کے ساتھ ساتھ ایک کالم نگار کالم کے ذریعے اپنا نقطۂ نظر

بھی بیان کرتا ہے۔ ملکی حالات کے تجزیے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ذاتی رائے دیتا ہے، اصلاحِ احوال کے لیے تجاویز پیش کرتا ہے، مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کرتا ہے۔ وہ موجودہ حالات کو کس طرح بدلنا چاہتا ہے یا مثالی معاشرے کے بارے میں اس کا نقطہ نظر ہے اور ایک مثالی معاشرے کی تشکیل میں موجودہ حالات میں کیا تبدیلیاں یا اصلاحات لانے کا خواہاں ہیں، یہ سب کچھ اس کا یوٹاپیا ہی ہے اور یہی زیر نظر تحقیق کا موضوع بھی ہے۔ علم نفسیات میں اس رجحان کو Michael Barclay نے ۱۹۹۳ء میں پیش کیا۔ وہ میامی یونیورسٹی کے ماہر نفسیات تھے۔ دراصل یہ رجحان فرد کے موجودہ حالات اور مسائل سے فرار حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہے جس میں ذہن ایک ایسی دنیا تخلیق کر لیتا ہے جو وقتی طور پر اس کو ان مسائل سے نجات دلا کر ایک ایسے مقام پر لے جاتی ہے جسے صحیح معنوں میں جنتِ ارضی کہا جا سکتا ہے۔ ادب چونکہ معاشرے کا عکاس ہوتا ہے، اس لیے کالم نگار بھی معاشرے میں موجود رجحانات سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔

ii۔ بیانِ مسئلہ (Statement of Problem/THESIS STATEMENT)

اکیسویں صدی کا فرد ہونے کے ناطے آج کا انسان پہلے کی نسبت ایسے مسائل کا زیادہ شکار نظر آتا ہے جو خارجی سے زیادہ داخلی نوعیت کے ہیں۔ فرد کا فرد کے ساتھ رابطہ کٹ چکا ہے۔ آج کا فرد تنہائی، اجنبیت اور لایعنیت کے گھمبیر مسائل میں گھرا نظر آتا ہے۔ زیر نظر تحقیق میں اس مسئلہ کا حل نکالنا مقصود ہے کہ اکیسویں صدی کے کالم نگاروں نے ان مسائل کو کس طرح پیش کیا ہے ؟ وہ عصری زندگی کی حقیقی پیش کش میں کس حد تک کامیاب ہیں ؟ وہ عصری زندگی کے مسائل سے فرار کی راہ کیسے اختیار کرتے ہیں اور اس فرار کی کوشش میں ایک مثالی معاشرے کی تشکیل کیوں کر کرتے ہیں۔

iii۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق (WORKS ALREAD Y DONE)

گو کہ مذکورہ موضوع پر قبل ازیں کوئی تحقیق کام نظر سے نہیں گزرا، البتہ سندی تحقیق کے حوالے سے کچھ ایسے مقالے لکھے گئے ہیں جو زیر نظر موضوع کی مختلف جہات کو پیش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں سرحد یونیورسٹی پشاور میں ۲۰۱۹ء میں زینب بی بی نے "خیبر پختونخواہ میں فکاہیہ کالم نگاری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ اسی سال علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے "اردو ناول میں ناسٹلجیا، قیام پاکستان کے بعد (2000-1947)" کے عنوان سے غزالہ شفیق نے ایم فل کا مقالہ لکھا۔ "جدید اردو نظم کا بدلتا منظر نامہ: یوٹوپیا سے ناسٹلجیا تک" کے عنوان سے مقالہ برائے ایم فل ملک عمر خان نے مکمل

اسلام آباد میں ۲۰۱۷ء میں جمع کروایا۔

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز سے ہی ۲۰۱۵ء میں نثار احمد "اردو کالم نگاری (ادبی اور لسانی تجزیہ)کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے چکے ہیں۔ بہاؤالدین زکریایونیورسٹی سے "جنگ اخبار میں مزاحیہ کالم نگاری" کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا ایک مقالہ لکھا جاچکا ہے۔ہندوستان میں حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی میں "حیدر آباد میں کالم نگاری"کے عنوان سے شیخ محمد سراج الدین نے ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھاہے۔

ارم ناہیدنے "زاہدہ حنااور کشور ناہید کے کالموں کا تقابلی مطالعہ "کے عنوان سے بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی ملتان سے ۲۰۱۵ءمیں ایم فل کیا۔جب کہ زاہدہ حناکے کالموں پرہندوستان میں بھی پی ایچ ڈی کا ایک مقالہ لکھا گیا۔یہ مقالہ "زاہدہ حناکے کالموں کا تجزیاتی مطالعہ "کے عنوان سے رخسانہ بیگم نے حیدر آباد دکن میں ۲۰۱۴ءمیں جمع کروایا۔اسی سال ان کی کالم نگاری پہ کراچی یونیورسٹی میں بھی ایم فل کا ایک مقالہ لکھا گیا۔

علاوہ ازیں ناسٹیلجیا کے موضوع پر انگریزی میں ظفر حسین ہرل کا ایک مقالہ بھی نظر سے گزرا جو گجرات یونیورسٹی میں لکھا گیا۔ اس کا عنوان ہے: "Echoes on Nostalgia, Essence of Lukhnow Culture."ہے۔

مندرجہ بالا مقالہ جات کی فہرست سے یہ بات واضح ہے کہ مجوزہ تحقیقی عنوان پر تاحال کوئی تحقیقی و تنقیدی کام کسی بھی جامعہ میں نہیں کیا گیاہے۔

iv۔ تحقیق کی اہمیت (SIGNIFICANCE OF STUDY)

اکیسویں صدی کے ادب میں فرد کی داخلی کشمکش نمایاں ہے۔عصرحاضر کے مسائل جن کونفسیات کی زبان میں ڈسٹوپیا کہا جاتا ہے،سے راہِ فرار کی کوشش میں فرد یوٹوپیا اور ناسٹلجیا جیسے رجحانات کی طرف راغب نظر آتا ہے۔زیرِ نظر تحقیق میں اس رجحان کی کالموں میں کار فرمائی کو علم نفسیات کے نقطہء نظر سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ادب کے نمائندہ تخلیق کار جن کے ہاں یہ رجحان نمایاں نظر آتا ہے،ان کا مطالعہ کیا گیا ہے۔یہ مطالعہ ایک جانب تو بین العلومی ہے کیوں کہ اس کی مدد سے نفسیات اور ادب کا رشتہ جوڑا گیا ہے تو دوسری جانب ادب میں ان نفسیاتی رجحانات کا مطالعہ فکر کے لیے نئے امکانات کے در وا کر سکتا ہے۔

v۔ تحدید (DELIMITATION)

زیر نظر تحقیق میں ان کالم نگاروں کا انتخاب کیا گیا ہے جن کے ادبی پاروں میں یہ رجحان ان کے فلسفہ زندگی کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس نفسیاتی رجحان کی مدد سے عصر حاضر کے مسائل کے حل میں وہ کسی حد تک کامیاب ہو سکتے ہیں۔ علم نفسیات اور علم فلسفہ کے مطابق ذہنِ انسانی مکمل علم کا حامل ہے، اس لیے اس کی اختراع قابلِ قبول اور سند کا درجہ رکھتی ہے اور اس کی مدد سے وہ ایک مثالی معاشرہ تشکیل دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجوزہ تحقیق کے لیے ۲۰۰۰ء سے ۲۰۲۰ء تک منتخب کالم نگاروں کے کالموں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے۔ مجوزہ تحقیق میں سیاسی، سماجی، تانیثی، فکاہی یوٹوپیا اور اسلاموٹوپیا کے عناصر کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

vi۔ مقاصدِ تحقیق (RESEARCH OBJECTIVES)

زیرِ نظر تحقیق میں مذکورہ مقاصد پیشِ نظر رہے:

۱۔ ادب اور نفسیات کے میدان میں یوٹوپیا بطور متفرق رجحان کے تلاش کرنا۔

۲۔ منتخب کالم نگاروں کے ہاں اس نفسیاتی رجحان کی موجودگی کی وجوہات تلاش کرنا۔

۳۔ اس رجحان کی مدد سے کالم نگاروں کے نقطہ نظر اور فلسفہ زندگی تک رسائی حاصل کرنا۔

۴۔ فرد، معاشرے اور ادب میں مذکورہ رجحان کی نشاندہی کرنا۔

vii۔ تحقیقی سوالات (RESEARCH QUESTIONS)

زیرِ نظر مقالے میں درج ذیل سوالات کو مدِ نظر رکھا گیا ہے:

۱۔ یوٹوپیا کا رجحان منتخب کالم نگاروں کے فراریت کے رجحان کی نمائندگی کیسے کرتا ہے؟

۲۔ یہ نفسیاتی رجحان منتخب کالم نگاروں کے فلسفہ ءحیات اور ان کے آئیڈیلزم کا عکاس کیسے بنتا ہے؟

۳۔ کالموں میں اس رجحان کی موجودگی کس طرح معاشرے اور کالم نگار کی ناآسودگی اور بے اطمینانی کی علامت ہے؟

۴۔ مختلف موضوعات (سیاسی، سماجی, دینی) پر لکھے گئے کالموں میں یوٹوپیا کا رجحان کس طرح ایک مثالی معاشرے کی تشکیل میں رہنمائی فراہم کرتا ہے؟

viii۔ نظری دائرہ کار (THEORETICAL FRAMEWORK)

ناسٹلجیا اور یوٹوپیا کے رجحانات کی اردو ادب میں کار فرمائی نظر آتی ہے۔ یہ رجحانات چوں کہ انسانی ذہن کی صناعی ہیں اس لیے اس کا تعلق براہِ راست انسانی نفسیات سے ہے۔ امریکی ماہر نفسیات (David Newman) کے مطابق:

"Utopia is a negative emotion as people are most likely to think of good old days when something goes wrong in present"

ڈیوڈ نیومین (DavidNewman)(۲۰۲۰) کے مطابق یوٹوپیا ایک منفی ذہنی رجحان یا رویے کا نام ہے جو حقیقت سے فرار کی علامت ہے۔ اس لیے مذکورہ تحقیق میں ان رجحانات کو فراریت کے نظریے کے پس منظر میں دیکھا گیا ہے۔ نظریہء فراریت (Escapism) کے مطابق یوٹوپیا ایک معاشرتی رجحان اور انسانی ذہن کی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے وہ زندگی کے اُن حقائق سے خواب، خیال، تصور یا ایسے ہی دوسرے ذہنی اعمال کی مدد سے حقائق سے فرار حاصل کرتا ہے جو اس کو موجودہ مسائل سے فرار اور ایک نئی رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ وہ ایک حقیقتِ ارضی کی تشکیل چاہتا تھا اور حقائق سے پردہ پوشی کرتا ہے۔ Escapism کے نظریے کی ابتدا (1516) میں تھامس مور نے سماجی مسائل پر تنقید کرتے ہوئے کی۔ اس نے معاشرے کو درپیش مسائل کا حل یوٹوپیا کے ذریعے پیش کیا، جس کے اثرات فلسفے کے نظریے Solipsism پر نظر آتے ہیں جو F.H. Bradley نے پیش کیا تھا۔

یہ نظریہ انیسویں صدی میں ترویج پایا۔ سترہویں صدی کا نامور ڈاکٹر کلاڈ برنٹ (Claud Brunet) اس نظریے کے حامیوں میں سے تھا۔ ایف، ایچ بریڈلی (F.H. Bradley) نے اس نظریے سے متعلق مندرجہ ذیل الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے:

> "Solipsism is an extreme form of subjective idealism that denies that human mind has any valid ground for believing in the existence of anything but itself".

جس کا لبِ لباب یہ ہے کہ حقیقت فقط وہ ہے جس کو انسانی دماغ قبول کرتا ہے۔ یہ نظریہ فرائڈ کے نظریہء فراریت کی حمایت کرتا ہے۔ ناسٹلجیا اور یوٹوپیا دراصل ایک ذہنی رجحان کا نام ہیں جو انسانی ذہن کی اختراع ہیں۔ اس نظریے کے مطابق حقیقت وہی ہے جو ہمارا ذہن قبول کرتا ہے۔ اسی نظریے کی بنیاد پر انگریزی ادب میں فراریت پر مبنی ادب (Escapist Literature) وجود میں آیا۔ دراصل فراری ادب وہ

ادب ہے جو انسان کو حقیقت سے فرار اور اس کے متبادل حقیقت مہیا کرتا ہے اور ادب کی یہ صنف صحیح معنوں میں ناول ہی ہے جو فرد کے مسائل کا بوجھ اپنے کندھوں پر لے کر اسے مصنف کے خیال کے مطابق سجائی گئی دنیا میں دھکیل دیتا ہے۔ ناروے کے ماہر نفسیات (Frode Stenssberg) فراریت کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اس کے مطابق یہ ذات کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے:

(1) Self Expression (2) Self Expansion

مشہور ماہر نفسیات فرائڈ اس ذہنی وجود کے پھیلاؤ کے رجحان کو انسانی سوچ اور وجود کے اظہار کا حصہ گردانتا ہے۔

> "Freud considers a quota of escapist fantasy as necessary element in life of humans".

یوٹوپیائی رجحانات پر مبنی ادب دراصل مصنف کی وہ مکمل گفتگو ہے جس میں وہ معاشرے اور انسانوں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے اور یہ عمل متن کی غیر منقولیت کے ذریعے عمل پذیر ہوتا ہے۔ اس عمل کی بنیاد پینسوپزم (Pansopianism) کے فلسفے پر ہے جس کے مطابق انسانی ذہن ہمہ گیر علم کا حامل ہے۔ Omniscient تمام عالم ہے، وہ حتمی علم کے مرتبے پر فائز ہے اور یوں یہ نفسیاتی نظریہ (Behaviorism) طرزِ عمل اور علمیت پسندی (Cognitivism) کے نظریات کی یکسر نفی کرتا ہے۔ اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ انسانی ذہن کی اختراع حتمی ہے اس لیے اس کو کسی تجربے کی کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ فراریت (Escapism) اور سولبزم (Solipsism) کے نظریات کے مطابق یوٹوپیا (Eutopia) اور ناسٹلجیا (Nostalgia) مصنف کے ذہن کی اختراع ہیں اور انسانی ذہن Absolute Position حتمی مقام پر ہے اس لیے جو کچھ ذہن سوچتا ہے وہ سب سے بڑی حقیقت ہے۔ ان نظریات کی روشنی میں اکیسویں صدی کے کالموں میں ان رجحانات کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

ix۔ پس منظری مطالعہ (LITERATURE REVIEW)

ادب میں ناسٹلجیا اور یوٹوپیا کے رجحانات کے متعلق جن مغربی مفکرین نے اپنی آرا دی ہیں، ان میں پاول ریسور (Paul Resaure) کا نقطہ نظر نمایاں ہے۔

"یوٹوپیا خود فراموشی کا ایک طریقہ ہے جو حقائق سے پردہ پوشی سکھاتا ہے۔"

وہ اس رجحان کو فراریت کے نزدیک تر سمجھتا ہے جبکہ لنڈا ہچن ماضی کو انسان کی زندگی کا ناقابلِ

فراموش حصہ سمجھتا ہے جسے انسان اپنی ذات سے کبھی علیحدہ نہیں کر سکتا۔ قاضی جاوید بھی لنڈا ہچن کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"یوٹوپیا کا احساس بھی ہماری سماجی زندگی کو متاثر کرتا ہے۔"

یہ ہمیں ماضی کے لمحوں اور مقامات میں ایسے اجزا تلاش کرنے پر آمادہ کرتا ہے جو ہماری موجودہ صورت حال کی ناگواری کا مداوا کر سکے۔ ان ناقدین کی آرا کے مطابق یہ رجحان ایک راہِ فرار ہے جو موجودہ ڈسٹوپیا سے نجات دلانے کا ذریعہ ہے۔ جب کہ بعض ناقدین سمجھتے ہیں کہ یہ رجحان موجودہ ابتر صورت حال کے خلاف ایک مزاحمتی رویہ ہے اور حقیقی صورت حال کی نفی کرتا ہے۔ یوٹوپیا کے متعلق فرانسیسی ماہر نفسیات(Riot-Sarcey) کی رائے کے مطابق:

"یوٹوپیا کا لفظ کثیر معنوی ہے جو معاشرتی اور اجتماعی زندگی کے پہلوؤں کی تشکیل کرتا ہے بعض اوقات یہ ایک کسک کی صورت میں بیدار ہوتا ہے جن کے اجزا منتشر اور باہم مختلف ہوتے ہیں۔"

اس کے مطابق روز مرہ زندگی کے وہ ناخوش گوار اور تلخ واقعات جن کو فرد بھلانا چاہتا ہے، کے لیے یوٹوپیا کا سہارا لیتا ہے۔ جرمن فلاسفر Ernest Block کے مطابق، یوٹوپیا میں:

"ماضی کی آرزو میں مستقبل کو ایک نامکمل وعدے کے طور پر دریافت کیا جاتا ہے۔"

اور یہ وہ مقام ہے جب ناسٹلجیا اور یوٹوپیا باہم مدغم ہو جاتے ہیں کیونکہ یوٹوپیا ایک آئیڈیل جگہ ہے اور جب مصنف ڈسٹوپیا سے خواب ناک ماضی میں جاتا ہے تو یہ یوٹوپیا کی ایک صورت ہے۔

علم نفسیات میں یہ رجحان فرد کے اعصابی اور ذہنی تناؤ سے نجات دلانے کے لیے اس کو خوابوں، خیالات، تصور یا ایسے دوسرے ذہنی اعمال کے ذریعے حقیقی دنیا سے دور لے جاتا ہے۔

مشہور ماہر نفسیات فرائڈ نے تجزیہ نفسی (Psychoanalysis) کے عنوان پر اپنے مضمون میں مندرجہ ذیل الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے:

"They cannot subsist on the scanty satisfaction they escape from reality"

جب حقیقت فرد کے ناکافی اطمینان کا باعث بنتی ہے تو وہ حقیقت سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مشہور جرمن(Theodor Fontanne) کے مطابق:

"His followers saw rest and wish fulfillment as useful tools in adjusting traumatic upset".

ٹراما کی صورت حال میں یہ طریقہ کار کافی اچھے نتائج کا حامل نظر آتا ہے۔ بعد میں آنے والے کئی ماہرین نفسیات نے بھی اَن چاہے موڈ مثلاً غصہ اور یاس کی کیفیت میں خیالی پلاؤ (Daydreaming) کی سرگرمی کو کافی مفید قرار دیا ہے جس کی مدد سے ان جذبات میں کسی قدر کمی کر کے اس کی تخفیف (Catharsis) کر سکتا ہے۔

x۔ تحقیقی طریقہ کار (RESEARCH METHODOLOGY)

زیر نظر تحقیق میں یوٹوپیا بطور نفسیاتی رجحان کے، بنیادی موضوع ہے۔ تحقیق کے لیے مختلف کالم نگاروں کا انتخاب کیا گیا ہے جن کے ہاں مذکورہ نفسیاتی رجحان بنیادی موضوع کی حیثیت رکھتا ہے اور جنہوں نے اس رجحان کے ذریعے ایک مثالی معاشرے کی تشکیل کو عصر حاضر کے مسائل کا حل تجویز کیا ہے۔ اس تحقیق کا تعلق کسی مقداری یا شماریاتی تحقیقی نوعیت سے نہیں ہے اس لیے دورانِ تحقیق اکیسویں صدی(۲۰۲۱-۲۰۰۰) کے دوران تحریر ہونے والے منتخب کالموں کا جائزہ لے کر علمی طریقہ تحقیق کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ مواد کی جمع آوری اور ترتیب کے بعد تجزیاتی طریقہ تحقیق اختیار کیا گیا ہے۔ مزید براں دستاویزی طریقہ تحقیق کو بھی بروئے کار لاتے ہوئے اٹھائے گئے سوالات کے جواب تلاش کیے گئے۔ حتمی، مستند اور قابلِ قبول تحقیق کے لیے اہم کالم نگاروں سے براہِ راست رابطہ بھی کیا گیا۔ مختلف لائبریریوں (نمل، مقتدرہ، اکادمی ادبیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی) سے متعلقہ موضوع کے حوالے سے دستیاب تنقیدی کتب سے بھی نقطہء نظر حاصل کیا گیا۔ انٹرنیٹ بھی اس دور میں محقق کے لیے مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ انٹرنیٹ پر دستیاب تنقیدی کتب اور مضامین سے بھی استفادہ کیا گیا۔ کالم نگاروں سے انٹرویو اور سوالات کا طریقہ کار اپنا کر ان کی ذاتی رائے بھی لی گئی۔

ب۔ بنیادی مباحث

کالم کی تعریف

کالم اخبار میں شائع ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی مضمون جب تک اخبار میں شائع نہ ہو، اس کو کالم کے زمرے میں شامل نہیں کیا جاتا۔ کالم انگریزی زبان کا لفظ ہے۔ پندرہویں صدی سے یہ لفظ انگریزی زبان میں صفحے کی عمودی تقسیم، ستون یا کھمبے کے لیے زیرِ استعمال رہا۔ لاطینی زبان کا لفظ Columna، جدید فرانسیسی

زبان کے Column سے ملتے جلتے معنوں میں ہی مستعمل تھا۔ ۱۷۸۵ء سے لفظ کالم اخبار کے لیے لکھے گئے تحریری مواد کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

آکسفورڈ ایڈوانسڈ ڈکشنری لفظ کالم (Column) کے مندرجہ ذیل معانی بتاتی ہے۔

"A tall, solid, vertical post, usually round and orade of stone, which supports or decorates a building or stands alone as a monument."(۱)

میر اقبال قادری نے کالم کی یہ تعریف بیان کی ہے:

"کالم انفرادی صحافت کا بہترین نمونہ ہے۔ کالم نویس اپنے کالم نے ذریعے اپنے ذاتی خیالات کا اظہار پوری توجہ سے کھلم کھلا کرتا ہے"۔ (۲)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کالم کالم نویس کی پسند اور سوچ کا عکاس ہوتا ہے اور اس پر اخبار کی پالیسی کا اثر زیادہ نظر نہیں آتا۔ یہ کسی معاملے، واقعے پر کالم نگار کا تجزیہ اور اس کی ذاتی رائے کا اظہار ہوتا ہے اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ مصنف کی شخصیت کی جھلک کالم میں نظر آتی ہے۔ کالم کا لفظ اخبار میں شائع ہونے والی تحریروں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ یہ تحریریں کسی مستقل عنوان کے تحت کالم نویس کے نام کے ساتھ شائع کی جاتی ہیں۔ انہیں خیالات کا اظہار صحافی فرہاد زیدی نے کچھ یوں کیا ہے:

"اخبارات و رسائل میں کسی مستقل عنوان کے تحت اپنے خیالات و افکار کو ضبط تحریر میں لانے کا نام کالم نویسی ہے اور جو شخص یہ مشغلہ اختیار کرتا ہے اُسے کالم نویس کہتے ہیں"۔ (۳)

مندرجہ بالا حوالے کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ کالم اخبار کا وہ باقاعدہ حصہ ہوتے ہیں جو کوی خاص منتخب موضوع پر لکھے جاتے ہیں اور جس میں کالم نگار کا مخصوص نقطہ نظر واضح ہوتا ہے۔ کالموں کا انداز تحریر اور موضوع پر بحث اسے دیگر اصناف صحافت سے متاثر کرتے ہیں۔ کالم انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی کھمبا، مینار اور ستون کے ہیں۔

"فیروز الغات میں کالم کے معنی صفحے کا ایک حصہ ہے اور فوج کے دستے کو بھی کالم کہتے ہیں"۔ (۴)

تکنیکی اعتبار سے کالم اخبار کے صفحے کا وہ حصہ جو عمودی شکل میں صفحے کو چھ، سات یا آٹھ حصوں میں برابر تقسیم کرتا ہے۔ دو کالموں کے درمیان یا تو لیکر ڈال دی جاتی ہے یا خالی جگہ چھوڑ دی جاتی ہے۔

کالم نویسی کے ضمن میں یوں تو شعبہ صحافت سے تعلق رکھے والے ماہرین نے کافی کچھ تحریر کیا ہے لیکن یہاں پر کالم کی تعریف کو واضح کرنے کیلئے چند مستند مصنفین کا حوالہ دیا جارہا ہے اور مقصد کالم کی تعریف کو واضح اور آسان کرنا ہے۔ اسی ضمن میں مفتی ابولبابہ شاہ منصور نے اپنی تصنیف "تحریر کیسے لکھیں" میں کالم نویسی کے باب میں لکھا ہے:

"کسی اخبار میں لکھنے والے کے نام کے ساتھ ایک مستقل عنوان کے تحت باقاعدگی سے شائع ہونے والی ایسی تحریر کو کالم کہتے ہیں جو تازہ حالات و واقعات پر اظہار کیال کے لیے وقف ہوتی ہے۔ کالم مزاحیہ بھی ہو سکتا ہے اس میں مختلف موضوعات ادب و اخلاقیات اور دوسرے امور پر تفصیل قسم کی بحث، دلائل، مشورے بھی ہو سکتے ہیں۔ ایک کالم لازمی طور پر لکھنے والے کی علمیت اور نقطہ نظر کا عکس ہوتا ہے۔ خواہ یہ لازمی موضوعات سے متعلق ہو یا معاشرے کے رجحانات سے"۔ (۵)

اس حوالے سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ کالم کالم نگار کی ذاتی پسند اور رائے عکاس ہوتا ہے اس کے ساتھ کالم نگار کو متعلقہ موضوع پر عبور ہونا چاہیے۔ ایک کالم نگار کا اسلوب اس کو دوسرے کالم نگاروں سے ممتاز کرتا ہے مثلاً عطاء الحق قاسمی کا اسلوب فکاہی ہے اور اوریا مقبول جان کا سنجیدہ اور مدلل۔ کالم نگار کا اسلوب کسی حد تک اس کا موضوع بھی متعین کرتا ہے اور کسی حد تک اس کی اپنی ذات اور انداز۔

محمد اسلم ڈوگر نے کچھ کالم نگاروں کے حوالے سے کالم کی مندرجہ ذیل تعریف نقل کی ہے:

ڈاکٹر یونس بٹ کا کہنا ہے، جو کچھ کالم نویس لکھتے ہیں، وہی کالم ہے۔ (۶)

احمد ندید قاسمی کی رائے میں، کالم کی کوئی ایک تعریف نہیں کی جاسکتی۔ (۷)

عالی رضوی کے خیال میں: کالم نگاری صحافت کا وہ اسلوبِ نگارش ہے جو ہر کالم نگار اپنی پسند اور مزاج کی مناسبت سے مستقل طور پر اپنالیتا ہے۔ (۸)

ڈاکٹر شفیق جالندھری اس بحث کو سمیٹتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شگفتگی، منفرد اسلوب اور لکھنے والے کی شخصیت کے رنگ والی تحریروں کے علاوہ ان میں بالکل الگ تھلگ، طبی، قانونی، نفسیاتی یا کسی بھی ایک شعبہ کے لیے وقف مستقل عنوان سے شائع ہونے والی تحریریں بھی ایسی ہیں جنھیں کالم کہا جاتا ہے"۔ (۹)

مندرجہ بالا تعریفوں کے مطابق کالم سے مراد مستقل عنوان کے تحت کسی اخبار یا رسالے میں باقاعدگی سے شائع ہونے والی شگفتہ و سنجیدہ تحریر کو کہتے ہیں جو عموماً لکھنے والے کے نام یا قلمی نام کے ساتھ شائع ہوتی ہے۔

ایک کالم نگار اپنے کالم میں اصلاحِ احوال کے لیے تجاویز پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے علم کو بروئے کار لاتے ہوئے حالات کی جان کاری دیتا ہے یا یوں کہیے کہ مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کرتا ہے۔ اپنے کالموں میں جہاں وہ حالات کی ستم ظریفی اور سنگینی کو بیان کرتا ہے، وہاں ان کو بدلنے کا عندیہ دیتا ہے یا دوسرے لفظوں میں مثالی معاشرے کے بارے میں اپنا نقطہء نظر بیان کرتا ہے۔ کالم نگار عطاء الحق قاسمی کے مطابق:

> "تین چیزیں ہوتی ہیں: اداریہ، کالم، تجزیہ۔ اداریہ ادارے کی رائے، تجزیہ تجزیہ نگار کی رائے مگر اعداد و شمار کے حوالے سے، جب کہ کالم ذاتی چیز ہے۔ نہ تجزیہ نہ ادارے کی رائے، شگفتہ تحریر جیسے دریا کوزے میں بند ہو۔"(۱۰)

جاوید اقبال کے مطابق:

> "وقت کے گزرتے لمحات میں معاملات پر تبصرہ کرنا اور مستقبل کی راہ دکھانے کی کوشش کرنا کالم نگاری ہے۔"(۱۱)

اور یہی مستقبل کی راہ ایک مثالی معاشرے کی تشکیل کی طرف اہم قدم ہوتی ہے۔

خورشید ندیم نے کالم نگاری اور یوٹوپیا کے تعلق کو اس طرح بیان کیا ہے:

> "یہ لوگ خوابوں کی سوداگری کرتے ہیں، کچھ لوگ معاصر مغرب کے قصے سناتے ہیں اور کچھ ماضی کی کہانیاں۔"(۱۲)

کالم نگاری:

روایت اور اقسام

کالم نگاری کی روایت

برصغیر میں صحافت کا باقاعدہ آغاز ۱۷۸۰ء میں ہوا۔ اس سال ۲۹ جنوری کو جیمز آگسٹس ہکی نے ہفت روزہ "ہکی گزٹ" یا "کلکتہ جنرل ایڈورٹائز" کی اشاعت کا انگریزی زبان میں آغاز کیا۔ کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر اس اخبار کو ۱۷۹۳ء میں بند کر دیا گیا۔ انگریز حکمران فارسی زبان سے خائف نظر آتے تھے کیونکہ فارسی مغلوں کی زبان تھی جنھوں نے صدیوں اس خطہ پر حکومت کی تھی اور جو قوم صدیوں تک حاکم رہ چکی ہو وہ

دوسرے کی غلامی قبول کرنے میں اپنی توہین محسوس کرتی ہے۔اس لیے اُن کو اس سے بغاوت اور مخالفت کی بو آتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے ۱۸۳۷ء میں فارسی زبان کی بجائے اردوزبان کو رائج کرنے کا سیاسی فیصلہ لیا۔یوں ثقافتی اور معاشرتی طور پر ایک عہد کے خاتمے اور دوسرے عہد کا آغاز ہوا۔

اردو برصغیر کے لوگوں کی بول چال کی زبان تو تھی مگر اب تک ادب یا صحافت میں اس کو عمومی طور پر اظہار کا ذریعہ نہیں بنایا جاتا تھا۔ برصغیر کا پہلا اردو اخبار "جام جہاں نما" تھا جس نے ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو اشاعت کا آغاز کیا تھا۔

برصغیر میں کالم کے ارتقا کا جائزہ لیا جائے تو کالم نگاری کئی تبدیلیوں سے گزرتی نظر آتی ہے۔ انیسویں صدی تک کالم کی دو صورتیں نظر آتی ہیں۔ آغاز میں خبری کالم نگاری تھی جس سے مراد ہے کہ خبروں کو کالم کی صورت میں درج کرنا تھا۔ تاہم ان میں سے بعض خبروں میں فکاہیہ کالم کی سی شگفتگی بھی نظر آتی ہے۔

کالم نویسی کے دوسرے دور میں کالم نے ایک باقاعدہ صورت اختیار کی جس کے بعد کالم ایک مستقل عنوان کے ساتھ کالم نویس کے نام کے ساتھ شائع ہونے لگا۔ قیامِ پاکستان کے بعد کالم نویسی کے تیسرے دور کا آغاز ہوا جس کے بعد کالم کو مختلف تبدیلیوں سے گزرتا ہوا آج صحافت کی ایک انتہائی اہم صنف کے طور پر رائج ہے۔

خبری کالم کا دور

برصغیر میں خبری کالم کے دور کا آغاز ۱۸۳۰ء کی دہائی میں ہوا۔ برصغیر کے پہلے اردو اخبار "جامِ جہاں نما" کے مدیر منشی سدا سکھ تھے۔ یہ ہفت روزہ تھا جو ۲۳ جنوری ۱۸۳۸ء میں بند ہو گیا۔ پروفیسر شفیق جالندھری اپنی کتاب "کالم نویسی" میں کالم کی روایت اور خبری کالم کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> "اردو صحافت میں کالم نویسی کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں ہوا لیکن اردو اخبارات کی تحریریں شروع دن سے ہی اپنے اندر کالم کا رنگ ڈھنگ اور طرز و اسلوب سموئے ہوئے تھیں۔ ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو اردو کا سب سے پہلا اخبار "اخبارِ جام جہاں نما" جاری ہوا۔"(۱۳)

اس وقت خبری کالم کے نام سے کوئی آشنا نہ تھا اور نہ مستقل عنوانات کے ساتھ کالم کی اپنی کوئی علیٰحدہ حیثیت تھی مگر کالم کا وجود اخبار کی خبروں اور مضامین کے اسلوب و بیان، مواد اور فکر و خیال میں یوں موجود تھا جیسے جسم انسانی کے رگ و ریشہ میں روح و جان۔ ابتدا میں اردو اخبارات نے خبر کی تازگی، جامعیت یا تکنیک

پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اُس زمانے میں خبروں کا اسلوب آج کے کالم سے ملتا جلتا تھا۔ خبریں محض واقعاتی حقائق کا بیان ہی نہیں تھیں بلکہ ان میں کالم کی طرح خیال آرائی اور تنقید و تبصرہ بھی شامل کیا جاتا تھا۔ کالم کے شگفتہ اسلوبِ بیان نے ان ابتدائی خبروں ہی سے جنم لیا تھا جب خبر کو خالص بنانے کے لیے اس کی بنیاد واقعاتی حقائق پر رکھی گئی تھی۔ بعد ازاں تنقید و تبصرہ، خیال آرائی اور زبان و بیان کے حسن و رعنائی کو اس سے الگ کیا گیا تو نئے زمانے کی خبروں میں نہ سمائے جانے والی پرانی خبر کے الگ کیے گئے اوصاف نے کالم کا روپ دھار لیا۔ ابتدائی دور کی اکثر و بیشتر خبریں اور مکتوب ہر لحاظ سے کالم کی ہیئت اور اسلوب میں لکھے جاتے تھے۔

کالم کے دوسرے دور کا آغاز سر سید احمد خان کے کالم سے ہوا تھا۔ سر سیّد احمد خان نے اردو صحافت کے اسلوب میں نئے اضافے کیے۔ ان کا اسلوب منطق اور دلیل پر مبنی تھا جس کی بنا پر اُن کی تحریریں اداریے سے قریب تر نظر آتی ہیں۔

۱۸۸۵ء میں منشی نول کشور نے "اَودھ پنچ" اخبار جاری کیا تھا۔ یہ ہفت روزہ، بر صغیر کا پہلا اخبار تھا جس کے صفحات کی تعداد اڑتالیس تھی۔ اس کی خبروں میں کالم کا اسلوب نظر آتا تھا اور یہیں سے فکاہی کالم نگاری کا آغاز ہوا۔

بیسویں صدی میں کالم نویسی

بیسویں صدی میں بر صغیر میں سیاسی شعور بیدار ہو رہا تھا۔ بر صغیر کے باسی خصوصاً مسلمان ایک بڑی سیاسی تبدیلی کے خواہاں تھے۔ وہ علیحدہ ملک کے حصول کے خواہش مند تھے۔ جس کے لیے مسلمان عملی سیاست میں داخل ہوئے اور اس کے اثرات اردو صحافت پر واضح نظر آتے تھے۔ اردو خواں طبقے میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ اُس دور میں مولانا ابو الکلام آزاد کے اخبار "الہلال" کو اردو صحافت میں نمایاں مقام حاصل ہوا۔ کالم کے جدید انداز کے بانی بھی مولانا ابوالکلام آزاد سمجھے جاتے ہیں۔ مولانا کا کالم "افکار و حوادث" کے عنوان سے "الہلال" ۱۹۱۲ء کے علاوہ جریدے "البلاغ" ۱۹۱۶ میں شائع ہونا شروع ہوا۔ ان دونوں رسالوں کے ذریعے اردو صحافت کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔ الہلال نے مسلمانوں کے دلوں میں ہمت اور سر میں سودا پیدا کیا۔ مسلمانوں کے مسائل کو اس دور بینی، بلند نگاہی اور کشادہ دلی سے اپنے صفحات پر پیش کیا کہ انگریز حکومت اس کو بند کرنے پر مجبور ہو گئی لیکن مولانا کے کالم "افکار و حوادث" نے عوام کے دلوں میں زندگی کی وہ مشعل روشن کر دی جو ظلم و ستم کی آندھیوں سے بجھنے والی نہ تھی۔

اسی دوران ملاامروزی نے ایک اچھوتے انداز سے فکاہی کالم نگاری کا آغاز کیا۔ ان کی گلابی اردو کے کالم ظلمت شکن تھے جو قارئین اور سرکار دونوں کو حیران وپریشان کر دیتے تھے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں خواجہ حسن نظامی کا نام اردو صحافت کے افق پر ایک روشن ستارے کی طرح طلوع ہوا۔ خواجہ حسن نظامی کا عنصر دانداز ان کو دوسرے کالم نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔ علامت نگاری کے ساتھ شریعت کا حسن بھی شامل ہے کیونکہ اس نظم ونثر دونوں پر عبور تھا صرف مزاح نہیں تھا۔ "اَودھ پنچ" اخبارات کی تحریروں کے برعکس ان کے کالمی مضامین میں ظرافت اور مزاح ومتانت کے پردے میں سامنے آئے۔ ۱۹۱۷ء میں مولانا ظفر علی خان نے "ستارہ صبح" کے نام سے اخبار جاری کیا جس میں "مکافات" اور "جواہر ریزے" کے نام سے مستقل عنوانات کے تحت صفحہ اول پر کالم شائع ہوتے رہے۔ ۲۱-۱۹۲۰ء میں چراغ حسن حسرت ایک نمایاں کالم نویس کے طور پر ابھرے۔ انہوں نے "سندباد جہازی" کے نام سے کلکتہ کے روزنامہ "نئی دنیا" میں کالم لکھنے شروع کیے۔ اسی دور میں وہ "عصرِ جدید" میں "جہاں گرد" کے قلمی نام سے فکاہیہ کالم لکھتے تھے۔

اردو صحافت کی تاریخ میں پہلا باقاعدہ کالم "افکاروحوادث" تھا جو بتیس سال تک جاری رہا جس کا آغاز ۱۲ ستمبر ۱۸۹۴ء میں انقلاب اخبار سے کیا اور یہ کالم ان کی پہچان بن گیا۔ ان کے منتخب شدہ کالموں کا مجموعہ "اخبار وحوادث" کے عنوان سے محمد حمزہ فاروقی نے ۱۹۹۱ء میں مرتب کیا۔ ابتدا میں یہ کالم "زمیندار" میں کبھی کبھی شائع ہوتا تھا۔ ۲۵ فروری ۱۹۲۴ء کو جب اخبار کے سائز میں اضافہ ہوا تو یہ کالم باقاعدگی سے روزانہ شائع ہونے لگا۔

مولانا عبدالمجید سالک نے کالم نویسی کو جس بامِ عروج پر پہنچا دیا، اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

مولانا عبدالمجید سالک کے کالم کی مقبولیت سے اردو صحافت میں کالم نویسی کی اہمیت اس قدر بڑھ گئی کہ کالم کے بغیر اخبار کا وجود نامکمل تصور کیا جانے لگا۔ "انقلاب" کے اجرا کے بعد جب مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر "زمیندار" اخبار سے علیحدہ ہو گئے تو "زمیندار" میں مولانا ظفر علی خاں نے فکاہیہ کالم کا عنوان "افکار وحوادث" کی بجائے "فکاہات" کر دیا جس میں کبھی کبھی خود مولانا ظفر علی خان، نقاش کے فرضی نام سے قلم کی جولانیاں دکھاتے اور کبھی "زمیندار" کے نائب مدیر اپنے سابقین کی پیروی کرتے نظر آتے۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۲۸ء سے "زمیندار" میں "فکاہات" کے عنوان سے یہی کالم مولانا چراغ حسن حسرت لکھنا شروع کیا۔

بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں کالم اپنا علیحدہ تشخص قائم کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اکثر اخبارات میں کالم، کالم نویس کے نام یا پھر نام کے مستقل عنوان کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ خبر اور کالم کا فرق واضح ہونے کے ساتھ ساتھ تبصرے کے لیے صحافت کی دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ کالم سے بھی کام لیا جانے لگا۔

مولانا محمد علی جوہر اپنے اخبار روزنامہ "ہمدرد" میں ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۹ء تک "کشکول" کے عنوان سے کالم لکھتے رہے۔

کالم نویسی کے اعتبار سے ۱۹۳۴ء میں بلال احمد زبیری کی ادارت میں شائع ہونے والے دہلی کے مسلم روزنامہ "الجمیعت" کے ادارتی صفحہ پر شائع ہونے والے مستقل کالم "حوادث واحکام" کی بھی اہمیت ہے۔ اس کا شمار ابتدائی دینی کالموں میں ہوتا ہے۔

۱۹۳۵ء میں لاہور کے روزنامہ "احسان" کے کالم "مطالبات" نے خاصی شہرت حاصل کی۔ یہ کالم مولانا چراغ حسن حسرت اپنے قلمی نام 'سندباد جہازی' سے لکھتے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں جب انہوں نے ہفت روزہ "شیرازہ" جاری کیا تو مولانا سالک اس میں تقریباً دو سال تک "حوادث و افکار" کے عنوان سے فکاہیہ کالم لکھتے رہے تھے۔ مولانا چراغ حسن حسرت خود اس میں "اشارت" کے عنوان سے کالم لکھا کرتے تھے۔ اس دور میں علمی، سائنسی اور تحقیقی کالموں کا بھی آغاز ہوا۔ باری علیگ نے احسان میں "گردوپیش" کے مستقل عنوان سے کالم لکھے۔ شبلی بھی ہفت روزہ "خیام" میں "حاصلِ مطالعہ" کے نام سے کالم لکھتے رہے۔

۳۹-۱۹۳۸ء میں ابو ظفر نازش روزنامہ "سیاست" میں رازو نیاز کے عنوان سے فکاہی کالم لکھتے رہے۔ تقریباً اسی دور میں معروف افسانہ نگار حیات اللہ انصاری نے لکھنؤ کے اخبار "قومی آواز" میں 'بھاجی' کے قلمی نام سے فکاہی کالم "گلوریاں" لکھنا شروع کیا جو مزاحیہ اور شگفتہ کالم تھا۔

حمید نظامی نے ابتدائی طور پر بحیثیت کالم نویس نوائے وقت اخبار سے شہرت حاصل کی۔ انہوں نے ۱۹۴۰ء میں پندرہ روزہ نوائے وقت کا اجراء کیا جس میں وہ "ہمایوں" لاہور میں "جہنم میں" کے مستقل عنوان سے فکاہی کالم لکھتے تھے۔ بعد ازاں انھوں نے ہفت روزہ نوائے وقت میں "سخن ہائے گفتنی" کے عنوان سے بھی کالم لکھا جسے بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔

قیامِ پاکستان کے بعد کالم نویسی

پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد لاہور کو صحافتی مرکز کا درجہ حاصل ہوا۔ اس وقت یہاں سے روزنامہ "زمیندار" روزنامہ "نوائے وقت" روزنامہ "آزاد" روزنامہ "انقلاب" اور روزنامہ "احساس" شائع ہوتا تھا۔ انگریزی زبان میں دو اخبار "پاکستان ٹائمز" اور "سول اینڈ ملٹری گزٹ" شائع ہوتے تھے۔ کچھ اخبارات کے مالکان ہندو تھے۔ یہ اخبارات تقسیمِ ہند کے فوراً بعد چھپنا بند ہو گئے۔

لاہور کے علاوہ گوجرانوالہ، سیالکوٹ اور کراچی سے بھی اخبارات نکلتے تھے۔ تاہم گوجرانوالہ اور سیالکوٹ کی صحافتی اہمیت زیادہ نہ تھی۔ اس دور میں لاہور کے اخبارات میں جو اہم کالم شائع ہوتے تھے ان میں مولانا عبدالمجید سالک کا "افکار و حوادث"، چراغ حسن کا روزنامہ "احسان" میں "سند باد جہازی" کے نام سے کالم چھپتا تھا۔ روزنامہ "آزاد" میں مجید لاہوری کا کالم "مطالبات"، روزنامہ "زمیندار" میں لطیف انور کا کالم "فکاہات" اور روزنامہ "نوائے وقت" میں مجید نظامی کا کالم "سرراہے" چھپتا رہا۔ روزنامہ "احسان" میں ظہیر کاشمیری "مجنوں" کے قلمی نام سے دو سال تک کالم لکھتے رہے۔

تقسیم کے بعد لاہور سے "مغربی پاکستان"، "آغاز"، "آفاق"، "سفینہ"، "طاقت"، "جدید نظام" اور "خاتون" کے نام سے بھی اخبارات جاری ہوئے جن میں کالم لکھے تو گئے لیکن کوئی قابلِ ذکر کالم نہ تھا جو اپنی زندگی اور اہمیت کو دیر تک برقرار رکھ سکا۔ اس دور میں "آفاق" میں میاں محمد شفیع نے "لاہور کی ڈائری" کے نام سے کالم لکھنا شروع کیا جس میں وہ شہر کے مختلف سماجی اور سیاسی معاملات پر اظہارِ خیال کیا کرتے تھے۔ اسی دوران لاہور کے روزنامہ "آفاق" میں علی سفیان آفاقی کا ایک کالم بھی شائع ہوتا تھا۔

۱۹۵۰ء کے عشرے کے آخری سالوں میں اردو صحافت میں ایک نیا رجحان آیا جس کے تحت بعض اخبارات نے بھارت میں شائع ہونے والے اخبارات سے مضامین اور کالم کی نقل شروع کر دی۔ اس دور میں ملک پر مارشل لا کا نفاذ عمل میں آ چکا تھا۔ آزادیء تحریر پر حدبندیوں کی وجہ سے کالم نویسوں کو بھارتی اور انگریزی جرائد سے استفادہ کرنا پڑا۔ ایوب خان کے مارشل لا میں صحافت میں جو نیا رنگ نظر آتا ہے، اس کو علامتی کالم نگاری کہا جاتا ہے۔ اس میں کالم نویس سیاسی کے بجائے معاشرتی اور ادبی امور پر لکھنے لگے۔ ۱۹۶۰ء میں ہفت روزہ "قندیل" میں ایم ایس ناز "دیکھتا چلا گیا" کے عنوان سے کالم لکھتے رہے۔ اس دور میں کئی کالم نگار اپنے قارئین کو مختلف موضوعات پر نئے زاویے اور جدید خیالات سے روشناس کراتے رہے جس کی بدولت لوگوں میں کسی جماعت یا مکتبہ فکر کی اندھی تقلید کی بجائے حقائق پر مبنی رائے رکھنے کا رجحان پیدا ہوا۔

گویا مخلص اور اچھا کالم نگار معاشرے کے افراد کی کردار سازی کر سکتا ہے۔ اُس کا قلم غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح ثابت کرنے کی طاقت رکھتا ہے، اس کے الفاظ رائے عامہ بدل سکتے ہیں۔ اپنے نظریات و افکار سے وہ قارئین کے ذہنوں میں جگہ بنالیتے ہیں۔ سچا کالم نگار اپنے قارئین سے محبت کرتا ہے اور اس محبت میں جھوٹ، ریاکاری اور منافقت نہیں ہوتی۔ وہ اخلاص، مثبت اور معتدل سوچ کے ساتھ لکھتا ہے اور ایک سچا صحافی اپنے مفادات کی خاطر ضمیر کا سودا بھی نہیں کرتا۔ کالم نگار ایک مصلح کی طرح ہوتا ہے۔ معاشرے کے سامنے صحیح اور غلط راہ کی نشاندہی کرنا اس کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

اب چونکہ حالات میں بدلاؤ آرہا ہے اس لیے لوگوں کی سوچ بدلنے کے ساتھ ساتھ کالم بھی اب ماضی کی طرح موثر نہیں رہا۔ کالم نویس شکوہ کرتے نظر آتے ہیں کہ کالم کا معیار ماضی کی طرح نہیں رہا۔ قارئین کالم کو محض شوق اور طبع کے لیے پڑھتے ہیں اور نظریہ سازی جو کالم نگار کا مقصد ہوا کرتا تھا، وہ کہیں پیچھے رہ گیا ہے۔

مؤثر کالم نویسی کے لیے علمی پس منظر، اجتماعی شعور، تحقیقی بصیرت، معتدل رویہ، شگفتگی و شائستگی اور غیر جانبداری سمیت کئی شرائط شامل ہیں جو کالم نگار شہرت حاصل کرنے کے لیے مذہب و سیاست کو بنیاد بنا کر متنازع کالم لکھتے ہیں، وہ یقیناً قوم سے خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں کیوں کہ ایک کالم نویس ایک مصلح ہوتا ہے۔ اسے محض داد سمیٹنے کی خاطر عوام کو غلط راہ پر نہیں ڈالنا چاہیے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس قافلے میں کچھ مفاد پرستوں کے ساتھ ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کی ہر بات دل سے نکلتی ہے اور سیدھا دل میں اترتی ہے۔

یحییٰ خان کا دورِ حکومت

پاکستان کی تاریخ کے دوسرے صدارتی انتخابات ۲ جنوری ۱۹۶۵ء میں ہوئے۔ ان انتخابات میں ایوب خان کو فاطمہ جناح کے مقابل فتح حاصل ہوئی لیکن نتائج کے بعد ان کو عوامی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ جس کے نتیجے میں ایوب خان نے اخبارات پر اظہار رائے کی پابندی لگا دی۔ کالم نگار کے لیے کسی بھی سیاسی جماعت و وابستگی کی اجازت نہیں تھی۔

۲۳ مارچ ۱۹۶۵ء کو ایوب خان حکومت کے خلاف عوامی تحریک کے نتیجے میں حالات اتنے خراب ہو گئے کہ بالآخر ایوب خان نے ۱۸ ستمبر ۱۹۶۶ء کو اقتدار کمانڈر انچیف آغا محمد یحییٰ کے سپرد کر دیا اور انھوں نے مارشل لا لگا کر انتخابات کا اعلان کر دیا لیکن نئی حکومت چونکہ بظاہر جمہوریت کی داعی تھی اس لیے اس نے

اخبارات سے بیشتر پابندیاں اٹھالیں جس کے نتیجے میں بہت سے نئے اخبارات اور جرائد منظرِ عام پر آئے۔ لاہور سے مجید نظامی نے "نوائے وقت" سے علیحدگی اختیار کر کے ۱۹۶۹ء میں "ندائے ملت" کا اجرا کیا۔ ظہور عالم اور بشیر احمد ارشد نے "جاوداں" کے نام سے اخبار شروع کیا۔

اُس دور کے کالم نگاروں کو قارئین کی بڑی تعداد انھیں اس لیے پسند کرتی تھی کہ ان کے کالموں میں نئے خیالات، حوصلہ افزائی، سچائی اور آگاہی ملتی تھی۔ وہ ہمیشہ سچائی کے قلم سے اپنے ضمیر کی آواز پر بامقصد لکھتے رہے۔ اس کے بدلے میں اُن کو عوام الناس کی بے تحاشا دعائیں اور بے شمار محبتیں میسر آئیں۔ وہ اپنے قلم کی حرمت کو اپنی کُل کمائی سمجھتے تھے۔ ان کے سینوں میں معاشرے، عوام اور ملک کے لیے درد ہوتا تھا۔ ان کے کالموں میں عوام کے ساتھ ساتھ حکمرانوں کے لیے بھی رہنمائی ہوا کرتی تھی۔ وہ درست بات لکھتے، چاہے کسی کو بری ہی کیوں نہ لگے۔ کالم نگاری کو ایسے لوگوں نے نقصان پہنچایا جن کا مطمع نظر مفادات کا حصول ہوتا ہے۔ اگر کالم نگار قلم کا صحیح استعمال کرے تو وہ معاشرے کو صحیح خطوط پر استوار کرنے میں مدد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ قلم کی حرمت اور معاشرے کی اصلاح کالم نگاروں کی ذمہ داری ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو خیانت کے مرتکب ہوں گے۔

جدید کالم نویسی

بیسویں صدی کے آخری عشرے میں کالم صحافت کی انتہائی معتبر، مقبول اور پسندیدہ صنف کا درجہ حاصل کر چکا تھا۔ اردو ادب اور صحافت کے بہترین نام اس سے وابستہ تھے۔ کالم میں زبان و بیان کے نئے تجربات ہوئے۔ سیاسی عمل کے تسلسل نے صحافت کو نئے رجحانات سے روشناس کرایا۔ اب کالم نویس کسی خوف یا خدشے کے بغیر اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں۔ حکومت کو ہدفِ تنقید بنانے کے ساتھ ساتھ دوسری سیاسی جماعتوں کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ اخبارات کالموں کو اہتمام سے شائع کرتے ہیں۔ چند برس قبل ادارتی صفحہ پر ایک یا دو کالم شائع ہوتے تھے مگر اب بعض اخبارات میں اس صفحے پر پانچ سے چھ کالم بھی شائع ہوتے ہیں۔ کالم نگاروں نے سیاسی موضوعات پر مشتمل اپنے کالموں کو ایک مستقل عنوان کے تحت شائع کرانے کا انداز اپنایا ہے۔

اخبارات میں کالموں کا میک اپ بھی بہتر ہوا ہے۔ کالم نویسوں کی تصویر کالم کے ساتھ شائع کرنے کا رواج شروع ہوا جس سے قارئین کو کالم اور کالم نویس کے ساتھ زیادہ اپنائیت و قربت کا احساس پیدا ہوا۔

کالم نگاری اور معاشرہ

قلم کار معاشرے کا حصہ ہوتے ہیں، اس لیے ان کا قلم بھی معاشرے کے لیے وقف ہوتا ہے۔ قلم نے قوموں کی تقدیر بدلنے اور غفلت میں ڈوبی ہوئی قوموں کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی آزادی میں قلم کا اہم کردار ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا کالم "الہلال" اور مولانا ظفر علی خان کا کالم "زمیندار" عوام میں آزادی کی روح پھونکتا تھا۔ قلم اور قلم کار کا رشتہ گہرا ہے۔ کالم نگار و کالم نویس دیگر مصنفین کی طرح اعلیٰ قلم کار ہی ہوتے ہیں۔

ادارتی صفحے پر کالموں کا سلسلہ مغرب میں شروع ہوا تھا۔ وہیں سے یہ اردو صحافت میں بھی در آیا۔ کالم نگار سیاست، سماجی مسائل، ادبی معاملات اور دیگر اہم موضوعات پر اپنا زاویہ نظر بیان کرتے ہیں۔

کالم نویسی با قاعدہ ایک فن، اہم فریضہ اور بھاری ذمہ داری ہے۔ کالم نگار معاشرے کی تصویر کو اپنے خیالات، نظریات اور فکر کے ذریعے قلم کی زبان عطا کر کے الفاظ کے روپ میں ڈھالتا ہے۔ وہ جو دیکھتا اور سوچتا ہے اسے الفاظ کے ذریعے دوسروں کے ذہن پر ثبت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ معاشرے میں پائے جانے والے افکار و جذبات کا مشاہدہ کراتا ہے اور مشاہدے کی طاقت سے معاشرہ اور اس میں ہونے والے تمام افعال کو الفاظ کی تصویر پہناتا ہے اس طرح وہ خود کو معاشرے کے لیے وقف کر دیتا ہے۔

کالم نگاری کی سماجی و سیاسی، تہذیبی و تمدنی، اخلاقی اور ہمہ گیر وسعت، معنویت اور افادیت و اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ کئی کالم نگاروں کی تحریروں نے قارئین کی ذہنی سطح کو بلند کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ایسے کالم لکھنے والوں کے لیے متعلقہ علم اور فن کا ماہر ہونا ضروری ہے۔ ایسے کالموں میں عموماً خیال آرائی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ قارئین کی معلومات، رہنمائی اور تربیت کے لیے لکھے جاتے ہیں۔ تاہم ایسے کالم نویسوں کے لیے صحافتی زبان پر دسترس ضروری خیال کی جاتی ہے کیوں کہ عام قارئین کو فنی معاملات سے آگہی نہیں ہوتی۔

کالموں کی اقسام

موضوع، اسلوب اور دیگر حوالوں سے کالموں کو مختلف اقسام میں تقسیم کرنا ممکن نہیں ہے۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہر کالم نویس کا اپنا ایک منفرد انداز ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کالم نویس اس قدر

متنوع موضوعات پر اظہارِ خیال کرتے ہیں کہ ان کے کالم کی کسی ایک قسم میں درجہ بندی کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مختلف کالموں کے اسلوبِ بیان بھی مختلف ہوتے ہیں۔

معروف صحافی مجیب الرحمٰن شامی کے خیال میں "کالم کا موضوع، اس کے اسلوب کو متعین کرتا ہے۔"(۱۴)

اس اقتباس کی روشنی میں فکاہیہ کالم لکھنے والا بھی اگر کسی سانحے پر قلم اٹھائے گا تو وہ اس کے ذریعے مزاح پیدا کرنے کی کوشش نہیں کر سکتا۔

ماہرینِ صحافت کا خیال ہے کہ چوں کہ کالم لکھنے کا نہ تو کوئی متعین طریقہ ہے اور نہ متعین اسلوب ہے اس لیے ایک ہی کالم نویس کے مختلف کالموں کی مختلف اقسام میں درجہ بندی کی جا سکتی ہے اور یہ درجہ بندی مندرجہ ذیل تین حوالوں سے کی جاسکتی ہے۔

۱۔ موضوع ۲۔ اسلوب ۳۔ مشاہدہ

۱۔ موضوع کے حوالے سے کالم کی اقسام

موضوع کے حوالے سے کالم کی متعدد اقسام متعین کی گئی ہیں۔ ان میں کسی خاص شعبے، پیشے، مشغلے یا مضمون، شہر کی سرگرمیوں کے متعلق کالم لکھے جاتے ہیں۔ "نوائے وقت" نے بشیر احمد راشد کا ایک کالم "مسائل و افکار" شروع کیا جو سنجیدہ معاملات کو زیرِ بحث لاتا تھا۔ ابنِ انشا "امروز" کے نام سے اپنے کالم میں "کراچی میں درویش" اور "پہلا درویش" کے قلمی ناموں سے لکھتے رہے۔

جدید اردو صحافت میں اصل انقلاب روزنامہ "مشرق" کے ذریعے آیا جسے جناب عنایت اللہ نے ۱۶ ستمبر ۱۹۶۳ء کو لاہور سے جاری کیا۔ اسے اردو کا پہلا مکمل اخبار قرار دیا گیا جس میں زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا۔ میک اپ کے اعتبار سے بھی "مشرق" ایک انقلاب تھا کیوں کہ اس نے میک اپ کا ایک نیا انداز اختیار کیا جو برطانیہ کے عوام پسند اخبارات سے ملتا جلتا تھا، اس لیے یہاں بھی عوام میں اسے وسیع پیمانے پر پسند کیا گیا۔ کالم نویسی میں بھی اس اخبار نے نئی طرز اختیار کی۔

ایوب خان جوں جوں مارشل لا سے جمہوریت کی طرف سفر کرنے کی کوشش کر رہے تھے توں توں آزادیء تحریر پر پابندیاں کچھ کم ہو رہی تھیں جن کے باعث سیاسی امور پر بھی فکاہیہ اور سنجیدہ انداز کے کالم شروع ہو گئے اور فکاہی انداز کو فروغ ملا۔ "نوائے وقت" میں ظہور عالم کا کالم "گاہے گاہے باز خواں" شیر محمد اختر کا "رنگ و آہنگ" اور بشیر احمد ارشد کا "مسائل و افکار" اس کی مثال ہیں۔

میاں محمد شفیع نے کالم کی اقسام کے بارے میں لکھا ہے:

"کالم کئی اقسام کے ہوتے ہیں۔ مختلف کالم نویس مختلف شعبوں میں تخصیص حاصل کرتے ہیں اور اپنے خصوصی تجربے اور علم کی کالم بنا پر لکھتے ہیں"۔ (۱۵)

ظہیر کاشمیری کے مطابق:

"سیاسی، ثقافتی یا زندگی کے کسی شعبے سے تعلق رکھنے والے وقتی اہمیت کے کسی بھی موضوع پر لکھی گئی تحریر کو کالم کہا جاتا ہے۔" (۱۶)

طبی کالم

ایسے کالم میں قارئین کو کسی بیماری کی علامات، وجوہات، علاج اور احتیاطی تدابیر سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ اردو میں سب سے پہلے روزنامہ "کوہستان" لاہور نے باقاعدگی سے "آپ کی صحت" کے عنوان سے طبی کالم کا آغاز کیا جس کی تقلید بعد ازاں دوسرے اخبارات و جرائد نے کی۔ آج کے اخبارات میں طبی کالم نہایت اہم تصور کیے جاتے ہیں۔

قانونی کالم

روزمرہ زندگی میں عام آدمی کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے یا اس کو قانونی معاملات میں جس رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، یہ کالم اُس کی اِس ضرورت کو کسی حد تک پورا کرتے ہیں۔ اس کالم میں روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل و معاملات کے قانونی پہلوؤں پر عام فہم انداز میں روشنی ڈالی جاتی ہے۔ حکومت کی طرف سے جاری کیے جانے والے نئے قواعد وضوابط، نئی اصطلاحات، آرڈیننسوں، اسمبلیوں میں منظور ہونے والے نئے بلوں اور نئے سرکاری احکامات کی قانونی نقطہء نظر سے عام فہم انداز میں وضاحت کی جاتی ہے۔ جیسے کہ کالم نویس ماہِ رمضان میں احترامِ رمضان آرڈیننس کے متعلق ضروری معلومات فراہم کرتے ہیں۔ قارئین کے مختلف نوعیت کے قانونی مسائل کے حل کے لیے انھیں قانونی مشورے بھی دیے جاتے ہیں۔

دینی کالم

اس کالم میں اہم دینی امور کے متعلق عامیانہ انداز میں ضروری معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ کالم نویس مختلف مذہبی تہواروں پر ان کے تاریخی پس منظر اور اہمیت کے حوالے سے روشنی ڈالتا ہے۔ یہ کالم عموماً

علما اور دینی علوم پر غور و فکر رکھنے والے افراد لکھتے ہیں۔ نوائے وقت کا کالم "نورِ بصیرت" طویل عرصے تک قارئین کی مقبولیت سمیٹتا رہا۔ اس کے علاوہ روزنامہ "جنگ"، روزنامہ "پاکستان"، روزنامہ "مشرق" اور دوسرے اہم اخبار بھی باقاعدگی سے دینی کالم شائع کرتے ہیں۔

نفسیاتی کالم

جدید صحافتی عہد میں پاکستانی اخبارات میں نفسیاتی کالموں نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی ہے۔ ان کالموں میں انسانی نفسیات پر بحث کی جاتی ہے۔ مختلف نفسیاتی مسائل کے حل کے لیے ماہرانہ مشورے دیے جاتے ہیں۔ نفسیاتی کالم نگار سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ علم نفسیات کے ساتھ ساتھ اردو زبان و بیان پر بھی عبور رکھتا ہو۔

معاشی کالم

ان کالموں میں ملک کی معاشی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے ساتھ ملکی معیشت پر اثر انداز ہونے والے مختلف عوامل کو بھی زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں تجربے کی روشنی میں ملکی معیشت کو بہتر بنانے کے لیے ناگزیر عوامل تجویز کیے جاتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ایسے کالم لکھنے والے کالم نگار، ماہرین معاشیات ہوں۔ وقت گزرنے کے ساتھ اور معاشیات سے آگہی کی وجہ سے اس کالم میں دلچسپی لینے والے قارئین کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔

کھیلوں کا کالم

اخبارات میں عموماً کھیلوں کا ایڈیشن باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے۔ اہم میچوں، کھلاڑیوں اور کھیل سے متعلقہ دوسرے معاملات کی وضاحت کے لیے کھیلوں کے متعلق کالم بھی شائع ہوتے ہیں۔ یہ کالم عموماً سابقہ کھلاڑی یا ایسے صحافی لکھتے ہیں جن کا کھیلوں کے متعلق وسیع تجربہ ہوتا ہے۔

پامسٹری اور علم نجوم

کالم نگار قارئین کی دلچسپی اور رجحان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنے کالم کا موضوع منتخب کرتا ہے۔ پاکستانی معاشرہ جس طرح ہر میدان میں مغرب سے متاثر نظر آتا ہے، پامسٹری اور علمِ نجوم کا شوق بھی اسی تاثر کی غمازی کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے پاکستانی قارئین بھی پامسٹری اور علمِ نجوم کے موضوعات پر لکھے گئے کالموں میں گہری دلچسپی لیتے ہیں جس کے باعث تمام بڑے اخبارات میں اب یہ کالم باقاعدگی سے شائع ہوتے ہیں۔

ان کالموں میں دست شناسی اور ستاروں کے اثرات موضوعِ گفتگو ہوتے ہیں۔ قارئین کے خطوط کے جوابات دیے جاتے ہیں۔ ستارے کیا کہتے ہیں؟ ہاتھ کی لکیریں، "آپ اور آپ کی قسمت" ایسے کالم ہیں جو اخبارات و رسائل میں باقاعدگی سے شائع ہو رہے ہیں۔

امورِ خانہ داری

خواتین کی دلچسپی، معلومات اور رہنمائی کے لیے متعدد اخبارات امورِ خانہ داری کے متعلق کالم شائع کرتے ہیں۔ ان میں خواتین کو امورِ خانہ داری کے طریقے بتانے کے ساتھ ساتھ گھر کو بہتر انداز میں چلانے کے لیے مفید مشورے دیے جاتے ہیں۔

فیشن

یہ کالم بھی خواتین کے لیے مخصوص ہوتا ہے اور اس کی لکھاری بھی عموماً خواتین ہی ہوتی ہیں۔ اس کالم میں ملبوسات، تزئین و آرائش کے متعلق مفید مشورے اور معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔

اسلوب کے حوالے سے کالموں کی تقسیم

اسلوب کالم نگار کی کامیابی میں اہم کردار کرتا ہے۔ یہ اس کی پہچان اور اس کی شخصیت کا پرتو ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مقبول و معروف کالم نویس اگر اپنے کالم کے ساتھ نام نہ بھی تحریر کریں تو اُن کے اندازِ تحریر سے ان کے قارئین ان کو پہچان جاتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بات بھی سچ ہے کہ کالم کا موضوع اس کے اسلوب کا تعین کرتا ہے۔ اس لیے اسلوب کی بنیاد پر کالموں کو مندرجہ ذیل اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

فکاہیہ کالم

برصغیر میں کالم نویسی کی ابتدا فکاہیہ کالم سے ہوئی اور یہ کالم آج بھی قارئین کرام میں سب سے زیادہ مقبول ہیں۔ فکاہیہ کالم نگار کے لیے کالم نگار کا زبان پر مکمل عبور ضروری ہے۔ الفاظ اور محاورات پر مکمل دسترس جس کی مدد سے وہ کالم میں من چاہا تاثر پیدا کر سکے یا دوسرے لفظوں میں الفاظ کی جادوگری سے حکایات و کہانیاں تشکیل دے سکتا ہے۔ الفاظ اور جملوں کے ذریعے مزاح کا عنصر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ کالم نگار مختلف واقعات کے دلچسپ پہلوؤں کو فنکارانہ چابک دستی سے بیان کرتے ہیں اور بعض اوقات طنزیہ انداز میں تلخ معاشرتی حقائق کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ فکاہی کالم عموماً کسی دلچسپ خبر کے حوالے سے لکھے جاتے ہیں۔ قارئین کے خطوط بھی کالم کا حصہ بنتے ہیں۔ "نوائے وقت" میں شائع ہونے والا پروفیسر محمد سلیم کا"

سرِ راہے"، "جنگ" میں شائع ہونے والا ڈاکٹر محمد یونس بٹ کا کالم، "عکس بر عکس" اور عطاء الحق قاسمی کا "روزنِ دیوار سے" فکاہی کالم کی مثالیں ہیں۔ "سر راہے" کو مختلف اوقات میں مختلف کالم نویس تحریر کرتے رہے ہیں۔

سنجیدہ کالم

سنجیدہ موضوعات پر تحریر کیے گئے کالموں میں طنز و مزاح کی گنجائش قدرے کم ہوتی ہے۔ اپنے انداز اور اسلوب کے حوالے سے یہ اداریے کے قریب ہوتا ہے مگر سنجیدہ کالم اور اداریے میں فرق یہ ہے کہ اداریے کو اخبار کے خیالات کا عکاس سمجھا جاتا ہے لیکن کالم نویس اپنے کالم میں ذاتی خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اگر یہ خیالات ادارے کی پالیسی سے مطابقت نہ رکھتے ہوں تب بھی اخبار کالم کو شائع کرتا ہے۔

سنجیدہ کالم نگار کا علم و مطالعہ وسیع ہوتا ہے کیوں کہ وہ حالات و واقعات کا تجزیہ کرنے کے بعد قارئین کو رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ ماضی کے کالم نویسوں میں زیڈ اے سلہری کا کالم "مسائل و افکار"، وارث میر کا کالم "نویدِ فکر" پیر علی محمد راشدی کا کالم، "مشرق و مغرب" م ش کا کالم "م ش کی ڈائری"، جبکہ جدید کالم نگاروں میں جاوید چوہدری کا کالم "زیرو پوائنٹ" اور اوریا مقبول جان کا کالم "حرفِ راز" سنجیدہ کالموں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

اقتباسی کالم

اقتباسی کالم میں کسی واقعہ، خبر کو من و عن بیان کیا جاتا ہے لیکن ان کالموں کی تعداد دوسرے کالموں کی نسبت کم ہوتی ہے۔ ان میں عالمی ادب کے تراجم، اہم شخصیتوں کے اقوال اور شعرا کی نظموں یا غزلوں کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔ کالم کے ساتھ کالم نگار کا تبصرہ، تجزیہ یا ذاتی رائے بھی شامل کی جاتی ہے۔ مجیب الرحمٰن شامی کے "جلسہ عام"، منو بھائی کے "گریبان" اور عطاء الحق قاسمی کے "روزنِ دیوار سے" میں بھی یہی انداز نظر آتا ہے۔ ورنہ عموماً ان کے کالموں کا شمار فکاہیہ کالموں میں ہوتا ہے۔

مکتوباتی کالم

ان کالموں میں قارئین کے اخبار کے نام لکھے گئے خطوط کو کالم کا حصہ بنایا جاتا ہے۔ جن خطوط سے کالم نگار متاثر ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ان کالموں کو قارئین تک پہنچانا ضروری ہے اور اکثر اس خط کے ساتھ

اپنی ذاتی رائے کا اظہار بھی کرتا ہے وہ بعض اوقات قارئین کے خطوط کی ترکیب و ترتیب کی مدد سے ہی اپنے دل کی بات بھی پوشیدہ انداز میں بیان کر دیتا ہے۔

ترکیبی کالم

ان کالموں میں کالم نویس کسی موضوع پر اظہارِ خیال کرنے کے لیے مختلف ترکیبی انداز اختیار کرتا ہے۔ ان کالموں میں عموماً کسی اہم اور دلچسپ واقعے کو مرکزی نقطہ بنایا جاتا ہے۔ ان کالموں میں آغاز اور انجام شاندار اور مضبوط ہوتا ہے جب کہ نفسِ مضمون ڈھیلا ڈھالا رہ جاتا ہے۔ ایسے کالموں کا آغاز کسی بھی لطیفے سے ہوتا ہے اور بعض اوقات اس کے متضاد بھی ہوتا ہے۔ یعنی نفسِ مضمون یا مرکزی خیال جاندار ہوتا ہے لیکن اس طرح کے کالم روایتی انداز میں تحریر نہیں کیے جاتے۔

علامتی کالم

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کالم کی اس قسم نے مارشل لا کے دور میں جنم لیا اور بدقسمتی سے مارشل لاء کے ادوار کافی طویل گزرے ہیں اس لیے علامتی کالم نگاری میں بہت کام ہوا۔ کالم نویس نے اپنا مافی الضمیر پہنچانے کے لیے علامتی اسلوب اختیار کیا۔ علامتی کالم میں استعارے، کنایے اور محاورے کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسے کالم نویس حالات وواقعات کے پس منظر سے آشنا ہوتے ہیں۔ پس دیوار دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ زبان و بیان پر عبور بھی ضروری ہے۔ مارشل لا کے علاوہ اگر کسی خاص مذہبی فرقے یا علاقے کے لوگوں کے جذبات مجروح ہونے کا اندیشہ ہو، نقضِ امن کا خدشہ ہو تب بھی مصنف یہ انداز اپناتا ہے۔

مشاہداتی کالم

اردو صحافت میں مشاہداتی کالم کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کی دو اقسام ہیں۔ ا۔ سفر نامہ / سیاحتی کالم ۲۔ شہر نامہ یا ڈائری نما۔

ا۔ سفر نامہ / سیاحتی کالم

اس کالم میں کسی سفر، تفریح یا مہم کی روداد بیان کی جاتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے "روزنِ دیوار سے"، محمد رفیق ڈوگر نے "دید شنید" میں اپنے عہد کے دوروں کی روداد بیان کی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے بھی اپنے بعض ملکی سفر نامے کالموں کی صورت میں تحریر کیے ہیں۔

۲۔ شہر نامہ یا ڈائری نما

اس کالم میں کالم نگار شہر کے مختلف واقعات اور مسائل کے متعلق اپنا مشاہدہ بیان کرتا ہے۔ ان کالموں میں ادبی، سماجی، ثقافتی اور سیاسی سرگرمیوں کو موضوع بنایا جاتا ہے۔

پاکستان کے اہم اخبارات اور کالم نگاری

(الف) روزنامہ نوائے وقت

روزنامہ "نوائے وقت" ایک انتہائی مؤثر اور ممتاز اخبار ہے۔ یہ اخبار ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو حمید نظامی کی زیر ادارت شائع ہوا۔ تحریک پاکستان میں اس اخبار کا اہم کردار رہا ہے۔ اس اخبار کے اداریے، کالم اور مضمون سیاسی سرکاری اور عوامی حلقوں میں دلچسپی اور سنجیدگی سے لیے جاتے ہیں۔ اسے پاکستان کے ممتاز کالم نگاروں کا تعاون حاصل رہا ہے جن میں نذیر ناجی، عطاء الحق قاسمی، م ش اور ابن الحق شامل ہیں۔

ڈاکٹر اسرار نوائے وقت میں "تفکر و تدبر" کے عنوان سے سیاسی و دینی کالم لکھتے تھے۔ پروفیسر محمد سلیم "نوائے وقت کا معروف کالم "سر راہے "لکھتے رہے جبکہ الطاف گوہر "جنوں کی حکایات"، ڈاکٹر اے آر خالد "فکر و تدبر" اور قیوم قریشی "گر تو برا نہ مانے" کے عنوان سے کالم لکھتے رہے۔ بشریٰ رحمٰن کا کالم "چادر اور چار دیواری" خواتین میں خاصا مقبول رہا ہے۔ ممتاز بھارتی اخبار نویس کلدیپ نیر کا کالم اکثر نوائے وقت کے ادارتی صفحہ پر چھپتا رہا ہے۔

(ب) روزنامہ جنگ

روزنامہ جنگ کی اشاعت کا آغاز میر خلیل الرحمٰن نے ۱۹۳۹ء میں دہلی میں کیا۔ یہ پاکستان کا سب سے اکثیر الاشاعتی اخبار ہے جسے ممتاز کالم نگاروں کا تعاون حاصل رہا ہے۔ اس میں مختلف نظریات کے حامل ادیب اور معروف صحافی کالم لکھتے رہے ہیں۔ ماضی میں مجیب الرحمٰن شامی کا کالم "مسئلہ عام"، عبد القادر حسن کا کالم "غیر سیاسی باتیں"، ارشاد احمد حقانی کا کالم "حرفِ ممتاز" جب کہ احمد ندیم قاسمی کا کالم "رواں دواں" کے نام سے جنگ میں شائع ہوتا رہا ہے۔ زیڈ اے سلہری ایک عرصے تک اپنے سیاسی کالم "مسائل و افکار" کے ساتھ روزنامہ جنگ کے صفحات پر نظر آتے رہے۔ امجد اسلام امجد اپنے خیالات "چشم تمام" کے عنوان سے بیان کرتے رہے۔ خورشید ندیم "تکبیر مسلسل" کے عنوان سے ۲۰۱۳ء سے کالم لکھ رہے ہیں۔ ان کے کالم بھی ابتدائی برسوں میں جنگ میں ہی شائع ہوتے رہے۔

ڈاکٹر یونس بٹ نے "عکس بر عکس" کے عنوان سے کالم لکھنا شروع کیا۔ ان کے کالموں پر مزاح کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ ممتاز شاعرہ پروین شاکر ایک عرصہ تک "گوشۂ چشم" کے عنوان سے کالم لکھتی رہیں۔ جب کہ منیر نیازی "شہر نما" کے نام سے مختصر کالم لکھتے تھے۔ جواد نظر "پانچواں درویش" کے عنوان سے الف لیلیٰ کی کہانیوں کے انداز میں کالم تحریر کرتے رہے۔ اثر چوہان "سیاست نام" جب کہ مرزا اسلم بیگ "خیریت مطلوب ہے" کے نام سے کالم تحریر کرتے رہے۔ حبیب الرحمٰن کا کالم "لندن نامہ" بھی جنگ کے صفحات پر نظر آتا رہا۔ عطاء الرحمٰن "میزان" کے عنوان سے اقتصادی موضوعات پر کالم لکھا کرتے تھے۔ مجاہد منصوری کا کالم "زورِ قلم" بھی قدرے باقاعدگی سے جنگ اخبار میں چھپتا رہا۔ حسن رضوی "کہی ان کہی" کے عنوان سے سیاسی، سماجی اور ادبی مسائل پر بحث کرتے تھے۔ جمیل الدین عالی "نقار خانے میں" کے عنوان سے کالم لکھتے ہیں۔ کشور ناہید بھی کئی برس سے جنگ اخبار میں سیاسی اور تانیثی موضوعات پر کالم تحریر کرتی رہی ہیں۔

۸۰اور ۹۰ کی دہائی کی کالم نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید رقم طراز ہیں کہ:

> " اس دور میں لکھے گئے بیشتر کالم بھی اسی سیاسی کیفیت کے ترجمان تھے۔ اس دور میں جو معیاری کالم لکھے گئے اور انھوں نے مقبولیت بھی حاصل کی ان کا انداز اور موضوع سیاست ہی تھا۔ سماجی اور معاشرتی مسائل پر لکھے جانے والے کالموں کی اہمیت اس دور میں کچھ مسلم ہو گئی۔"(۱۷)

روزنامہ ایکسپریس

روزنامہ کا آغاز ۳ ستمبر ۱۹۹۸ء سے ہوا۔ یہ اخبار اردو میں شائع ہوا۔ روزنامہ ایکسپریس کے معروف کالم نگاروں میں ڈاکٹر عبدالقادر حسن، نذیر ناجی، رؤف کلاسرا، ڈاکٹر نوید اقبال، امجد اسلام امجد، وارث رضا بٹ اور جاوید چودھری شامل رہے۔

اس اخبار نے تیزی سے مقبولیت حاصل کی اور اسے متعدد کالم نویسوں کا تعاون بھی حاصل ہ۔ جو اس میں باقاعدگی سے لکھتے ہیں اور وہ پاکستان کی صحافت میں اہم نام ہیں۔

روزنامہ دنیا

تین ستمبر ۲۰۱۲ء کولاہور سے شائع ہونے والا اخبار روزنامہ دنیا ہے جس کے مالک میاں محمد عامر ہیں۔ اس کے کالم نگاروں میں محمد اظہار الحق، رسول بخش رئیس، ڈاکٹر حسن عسکری، سعد رسول، عبداللہ، حمید گل اور محمد اعجاز الحق اور ہارون رشید شامل تھے۔ یہ کالم نگار سیاسی و سماجی موضوعات پر کالم نگاری کرتے ہیں۔

یہ ایک نسبتاً نیا اخبار ہے جو ۳ ستمبر ۲۰۱۲ء کو لاہور سے شائع ہوا اور ملک کے تمام بڑے شہروں سے بیک وقت شائع ہوتا ہے۔ اس کے نمایاں کالم نگاروں میں ہارون رشید، حبیب اکرم اور ظفر اقبال شامل ہیں۔

روزنامہ خبریں

ضیا شاہد کی ادارت میں شائع ہونے والے اس اخبار نے عوامی صحافت کو ایک نئے رنگ و روپ سے پیش کیا۔ اس میں ماضی کے کئی معروف کالم نگار خامہ فرسائی کرتے رہے جن میں ضمیر جعفری، محمود شام، حسن نثار، سرفراز سیّد، خوشنود علی خان، نسیم، شاہد اور مظفر بخاری کے نام نمایاں ہیں۔ ضمیر جعفری، "ضمیر حاضر، ضمیر غائب" کے عنوان سے سیاسی کالم لکھتے تھے۔ ممتاز صحافی، محمود شامی "وقت کی بات" کے عنوان لکھتے تھے۔ جس کا انداز ایک مضمون یا مقالے کی طرح ہوتا ہے۔ اعظم سہروردی "میزان" کے عنوان سے سیاسی کالم لکھتے تھے۔ اسی طرح روزنامہ خبریں میں ابوالانجم برلاس کا کالم "روشنی" شائع ہوتا تھا جس میں اسلامی تعلیمات اور تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ ڈاکٹر ظہور احمد اظہر اپنے کالم "اسلامی دنیا" میں ملتِ اسلامیہ کے مختلف مسائل پر قلم اٹھاتے رہے۔ ضیا شاہد کے کالم اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ ان کے عنوان انگریزی میں ہوتے تھے۔ وہ تلخ اور ترش لہجے میں بھی بات کرتے ہیں اور کبھی شیریں لہجے میں کڑوی بات کر جاتے ہیں۔

روزنامہ خبریں کے ابتدائی کالم نویسوں میں میاں عامر محمود "راستہ" ایاز امیر "نقطۂ نظر"، مجیب الرحمٰن شامی "جلسۂ عام"، قاضی اظہار الحق "تلخ نوائی"، خورشید ندیم "تکبیر مسلسل" اور دینی کالم نگار علامہ احتشام الٰہی "دین سے دنیا تک"، "احوالِ عالم" جاوید حفیظ شامل ہیں۔ دیگر سابق معروف کالم نویسوں میں نذیر ناجی "سویرے سویرے"، "کٹہرا" خالد مسعود خان، "آخر کیوں" رؤف کلاسرا، "ریڈ زون" کنور دلشاد، "زاویہ نظر" مفتی منیب الرحمٰن، اور "بین السطور" کے نام سے کلدیپ نائر لکھتے رہے ہیں۔

روزنامہ پاکستان

مجیب الرحمٰن شامی کی ادارت میں شائع ہونے والا روزنامہ ہے۔۱۹۹۷ء میں اس کی اشاعت کا آغاز ہوا۔اس کے ابتدائی کالم نگاروں میں لیفٹننٹ کرنل غلام جیلانی خان "شمشیر وسناں اول"، محسن گورایہ "سرخ فیتہ"، محمد نصیر الحق ہاشمی "جلسہ عام"، مجیب الرحمٰن شامی "اَن کہی"، نسیم شاہد "یہ لاہور ہے" شامل ہیں۔ یہ روزنامہ اردو اور انگلش دونوں زبانوں میں شائع ہو تا رہا ہے۔

ادب اور نفسیات:

ادب اور نفسیات دو مختلف علوم ہیں۔ علم نفسیات انسانی رویوں اور اُن کی وجوہات تلاش کرتی ہے۔ ادب افسانوں اور ناولوں کی کہانیوں کی مدد سے انسانی رویوں کو عملی کی بجائے خیالی شکل میں پیش کرتا ہے۔ لیکن دونوں علوم کا براہ راست تعلق انسان کے داخلی معاملات سے ہوتا ہے اور ایک ادبی فن پارہ انسان کی خاص نفسیاتی حالت کو ظاہر کرتا ہے اور یوں ادب اور نفسیات کے تانے بانے باہم آپس میں ملتے نظر آتے ہیں اس کی مثال روسی ادب میں دوستوسکی کے فن پاروں میں نظر آتی ہے جو کردار کی داخلی صورت حال کو گہرائی کے ساتھ پیش کرتی ہے۔

ایک فن کار اپنی تخلیق کے دوران علم نفسیات کا استعمال کرتے ہوئے کردار کی اندرونی کیفیات کو کامیابی سے پیش کرتا ہے اور اپنے قارئین کے سامنے انسانی حقیقت کا نفسیاتی جائزہ لاتا ہے۔ ادب اور نفسیات کے درمیان دوطرفہ تعلق پایا جاتا ہے کیونکہ ایک ادیب علم نفسیات کو عمل میں لاتے ہوئے کرداروں کو کامیابی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔چند سو سال پہلے ارسطو نے ادب اور نفسیات دونوں کو ملانے والا ایک لفظ پیش کیا تھا اور وہ تھا کتھارس جس کا استعمال علم نفسیات میں جہاں مریض کے اندرونی غصے اور غم کی کیفیت کو کم کرنے کیلئے استعمال ہوتا ہے وہاں ارسطو نے ڈرامے میں کتھارس کا استعمال کرداروں کے منفی جذبات کی تخفیف کے لیے استعمال کیا۔ ادب اور نفسیات کے علاوہ دوسری کوئی علم کی شاخ نہیں ہے جو انسانی جسم اور روح کے تعلق کا مطالعہ کرتی ہے اور اُن کے تضاد اور دلچسپیوں کا تعین کرتی ہے۔

ادب کا تعلق انسان کے شعوری اور غیر شعوری دونوں افعال سے ہے جس میں انسان کے خارجی اور داخلی خیالات کو فن کے پیکر میں ڈھالا جاتا ہے۔ اور جب بات داخلی خیالات کی آتی ہے تو وہاں علم نفسیات کا عمل ودخل شروع ہو جاتا ہے۔ جدید ادب میں سماج سے زیادہ فرد کو اہمیت حاصل ہے کیونکہ معاشرے کی ترقی

کا دارومدار افراد پر ہے اس لیے سماج کو بہتر بنانے کے لیے فرد کی حالت کو بہتر بنانا ضروری ہے۔ یوں تو ہر دور کے ادب میں انسانی فطرت اور ذہنی الجھنوں کی جھلک نظر آتی ہے لیکن اس کا باقاعدہ اظہار علم نفسیات کے ارتقاء کے بعد ہوا کیونکہ اس کیفیت سے پہلے سائنسی ایجادات نے انسان کے اندر ایک خلا پیدا کر دیا تھا جس نے انسان کے مادی اور روحانی وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

اگرچہ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک نے اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے بھی فرد سے زیادہ سماج کو اہمیت دی اور فرد کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا گیا۔ جدید ادب میں انسانی فطرت کی گتھیوں کو سلجھایا گیا اور یہ طے ہوا کہ ادب ایسا ہونا چاہیئے جو انسانی شعور کی عکاسی کرے۔

ولیم جیمس نے اصول نفسیات لکھ کر جہاں علم نفسیات کی بنیاد رکھی تو فرائڈ نے اُس کو مزید ترویج دیتے ہوئے تحلیل نفسی کا نظریہ پیش کیا۔ آغاز میں یہ صرف ایک طریقہ علاج تھا لیکن بعد میں جدید ادب میں تخلیق کاروں نے کردار کے مخفی زاویوں کو سامنے لانے کیلیئے اس کا استعمال کیا۔

تحلیل نفسی کے نظریے نے فن کار کے تخیل عمل کی تشریح کی اور یہ واضح کیا کہ خواب کردار کی ان خواہشوں کا اظہار ہیں جن کو وہ عملی زندگی میں حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ یوں تحلیل نفسی کے ذریعے فرد کے داخلی معاملات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ خوابوں کی تعبیر کے لیے تجزیہ نفسی کی مدد لی جاتی ہے۔

فرائڈ کے نزدیک ایک عام فرد سوتے میں خواب دیکھتا ہے جبکہ تخلیق کار حالت بیداری میں بھی محو خواب ہوتا ہے۔ تحلیل نفسی کے علاوہ دوسرے تکنیکی نوعیت کے رجحانات کا استعمال بھی جدید ادب میں نظر آتا ہے فن میں آزاد تلازم خیال، شعور کی رو، داخلی خود کلامی، علامت نگاری، تجریدیت اور سرریلزم شامل ہیں۔ ان سے ادب کے مواد اور ہیت پر گہرا اثر پڑا۔

فرائڈ کے نظریہ تحلیل نفسی سے ادب میں شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال ہوا۔ اس کے تحت ایسی تحریریں لکھی گئیں جن کو الفاظ کے بجائے علامت سے سمجھنا ضروری تھا۔ فرد کی اندرونی کیفیات و جذبات میں تشدد کا عنصر عروج تک پہنچ گیا ہے یہی وجہ ہے شعور کے بہاؤ کی تکنیک میں کئی طرح کی تکنیکیں استعمال ہوئیں ہیں جن میں داخلی تجزیہ اور حیاتی تاثر زیادہ مستعمل ہیں۔ داخلی تجزیہ میں کردار کے تاثرات کو کردار کی زبان سے ادا کروایا جاتا ہے اور بعض اوقات ان خیالات کی جڑیں لاشعور سے ملی ہوتی ہیں۔

ولیم جیمز نے شعور کی رو کو جوئے رواں سے تعبیر کیا ہے جس میں ذہن کی ہر لحہ بدلتی کیفیت کو بیان کیا جاتا ہے اور یوں وقت کی قید و بند سے آزاد ہوتا ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل کے واقعات کو شعوری سطح پر

پیش کیا جاتا ہے اس لیے زندگی کے پیچیدہ مسائل کو پیش کرنے کیلئے شعور کی رو کا استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ انسان نہ صرف خیر و شر بلکہ نفسیاتی گرہوں کا بھی مجموعہ ہے۔

اردو ادب میں سجاد ظہیر اور قراۃ العین حیدر کے ہاں اس تکنیک کا استعمال نظر آتا ہے۔ فرائڈ نے ادیب کو تصوراتی کہا ہے اور تحلیل نفسی کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ تخلیقی عمل نیوراتی یا اعلیٰ درجے کا ذہنی فعل ہے جسے فن کار دوران تخلیق استعمال کرتا ہے یعنی وہ شعور ہے اور تحت اشعور کا سفر طے کرتے ہوئے تخلیق کرتا ہے۔ اس لیے تخلیقی عمل کا سرچشمہ لاشعور ہے۔ فرائڈ کے اسی نظریے نے آگے چل کر بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں دادازم اور سرریلزم کی تحریکوں کی بنیاد رکھی۔ سرریلزم تحریک کا محور حقیقت سے بغاوت نہیں بلکہ حقیقت سے ماورا ایک اور حقیقت کی تلاش ہے اور اس کی بنیاد بھی تحلیل نفسی اور لاشعوری نظریات پر رکھی گئی ہے۔ اس میں فنکار لاشعور کی گہرائیوں سے مواد اخذ کرتے ہوئے اپنے فن سے حقیقت کو اصل روپ میں پیش کرتا ہے اور ذہن کے غیر عقلی شعوری اور لاشعوری عناصر کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔

اردو ادب میں کرشن چندر نے اپنے افسانوی مجموعے "پرانے خدا" میں پہلی بار ماورائے حقیقت کا استعمال کیا۔ اس کے علاوہ عزیز احمد کا "جھوٹا خواب"، احمد علی کا "موت سے پہلے"، قراۃ العین حیدر کا "یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے" اور انور سجاد کا افسانوی مجموعہ "چوراہا" میں سرریلزم کی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا تجزیے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علم نفسیات ایک تجزیاتی علم ہے اور اس علم کی مدد سے ادب اور فن کے تخلیقی عمل کو زیادہ وضاحت اور نئے ذخیرہ اصطلاحات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور ان کی مدد سے کردار کے تخیل کا تجزیہ آسان ہو گیا ہے۔ کردار کی نفسیاتی گتھیوں کو سلجھانے میں نفسیاتی تنقید نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

ج۔ یوٹوپیا:

"یوٹوپیا لفظ کی وضاحت:

کشاف تنقیدی اصطلاحات میں ادبی یوٹوپیا کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔

> "یوٹوپیا خیال و خواب کی دنیا کی چیز ہے اس لیے بعض اوقات یوٹوپیا کی اصطلاح کسی ادیب یا شاعر کے مثالی تصورات یا توقعات کے مجموعے کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔"[۱۸]

یوٹوپیا کا لفظ سب سے پہلے افلاطون نے اپنی کتاب Republic میں استعمال کیا تھا۔ اِس لفظ سے اُس کی مراد ایک مثالی ریاست تھی۔ اس کے بعد ۱۵۱۶ء میں تھامس مور نے Utopia کے نام سے ایک خیالی ریاست کا تصور پیش کیا۔Utopia دو یونانی الفاظ سے ماخوذ ہے۔ Outopos جس کا مطلب ہے:"کوئی جگہ نہیں" اور Utopos جس کا مطلب ہے "اچھی جگہ"۔ لہٰذا یہ، ایک ایسی دنیا ہے جو اچھی اور مثالی تو ہے مگر کوئی وجود نہیں رکھتی۔ یوٹوپیا کے متضاد ڈسٹوپیا کی اصطلاح مستعمل ہے۔

تھامس مور ۱۴۷۸ء میں لندن میں پیدا ہوئے۔ پیشہ کے لحاظ سے وہ ایک وکیل تھے لیکن اپنی بے مثال ذہانت اور دانش کے باعث جلد ہی انہوں نے بادشاہ ہنری ہشتم کے دربار میں اپنی جگہ بنالی۔ یہاں تک کہ ۱۵۲۹ء میں وہ لارڈ چانسلر بن گئے۔ ابتدا میں وہ کیتھولک فرقے کے ماننے والے عیسائی تھے۔ انہوں نے قانون اور مذہب پر بہت کافی کام کیا۔ ان دونوں موضوعات میں انہوں نے اخلاقیات کے اصولوں کی پیروی کی اصولوں پر سمجھوتا نہ کیا اور اس کے لیے زندگی قربان کر دی۔

حق کی تلاش اور اپنے جائز مقصد Better-living یعنی بہتر زندگی کے حصول کے لیے انہوں نے آخری حد تک قربانی دی اور جان کی بازی لگا دی۔ وہ انگریزی ادب میں بالخصوص اور دنیائے ادب میں بالعموم ایک نمایاں فلسفی اور انسانی فطرت کا مطالعہ کرنے والے مصنف اور فلسفی ہیں۔ ان کا اپنا تصورِ زندگی تھا جو دنیا سے متصادم رہا تھا۔ ان کی تحریک کا بنیادی مقصد ان تصورات کو حقیقی زندگی میں رائج کرنا تھا۔ تھامس مور نظریے میں اپنے تصورات اور اصولوں کو دنیا میں رائج کر کے ایک خیالی دنیا یا مثالی دنیا (Idealworld) پیش کرتے ہیں۔ جو اُن کے مطابق موجودہ تلخ اور غیر اطمینان بخش صورتِ حال سے نکلنے کا ایک راستہ ہے۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ صرف اصولوں، نظریات اور خیالات سے حقیقی دنیا میں تبدیلی نہیں لائی جا سکتی بلکہ اس کے لیے عملی اقدام کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب Utopia میں نہ صرف ایک خیالی، مثالی ریاست کا تصور پیش کیا بلکہ اس کی تشکیل کے لیے تجاویز بھی دیں۔

"یوٹوپیا" کے نام سے ۱۵۱۶ء میں تھامس مور نے لاطینی زبان میں ایک کتاب لکھی۔ منفرد موضوع کے ساتھ ساتھ طویل عنوان نے اس کتاب کو انگریزی ادب میں نمایاں مقام دلوایا۔ اس کتاب کو "گولڈن بک" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بہترین ریاستی نظام پر مبنی ایک جزیرہ ہے جس میں انہوں نے یوٹوپیا کا تصور پیش کیا۔ مور نے اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں وہ موجودہ نظام پر طنز کے ذریعے مذمت کرتے ہیں۔ شاہی استبداد، پادریوں، دھوکا دہی اور سزائے موت کی مخالفت کرتے ہیں۔ دوسرے حصے میں مصنف

مثالی ریاست کا تصور پیش کرتے ہیں۔ تھامس مور ایک راسخ العقیدہ عیسائی تھے۔ جب بادشاہ Henry III نے ملک میں مذہبی اصلاحات نافذ کرنے کا اعلان کیا تو مور نے اس کی مزاحمت کی جس کے نتیجے میں انہیں پھانسی کی سزا دی گئی۔

یوٹوپیا کے عناصر

یوٹوپیائی ادب کے عموماً دو بنیادی عناصر ہوتے ہیں۔

ا۔ مثالیت پسندی یا Idealism

۲۔ تکمیل پسندی یا Perfectionism

آئیڈیلزم (Idealism)

کشاف تنقیدی اصطلاحات کے مطابق:

"مثالیت پسندی کا آغاز افلاطون کے نظریہ اعیان (نظریہ امثال) سے ہوتا ہے۔ افلاطون کے نزدیک یہ مادی عالم ہے جسے ہم اپنے حواس سے معلوم کرتے ہیں، حقیقی نہیں بلکہ یہ عکس ہے اس عالم کا جو مادی کائنات سے ماورا ہے۔"[۱۹]

اس نظریے کے مطابق کسی مادی شے کے وجود کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ ہمارا ذہن اس کو کیسے دیکھتا ہے۔ اس لیے صرف ذہنی کیفیت کا وجود ہی حقیقی ہے۔

افلاطون کے نزدیک نہ صرف مادی بلکہ غیر مادی تصورات، نیکی، برائی، عزت، ذلت کا وجود بھی محض ذہنِ انسانی کی تخلیق ہے۔ کیونکہ یہ تمام اشیا عالم امثال میں موجود ہے۔ جس کو افلاطون سپارٹا (Sparta) کا نام دیتا ہے۔

افلاطون نے اپنی کتاب "ریاست" (Republic) میں ذکر کیا ہے کہ مادی دنیا فانی ہے کیونکہ یہ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اس نے مادی دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہیت اور مادہ، دنیا کی ہیت یا فارم ہے لیکن افلاطون کے نزدیک اصل چیز فقط آئیڈیا ہے جو خالق کے ذہن میں تھا اور جس کی بنیاد پر ابدی دنیا تشکیل دی گئی۔ یہ دنیا اس ابدی زندگی کی نقل ہے اس لیے مادہ اصل حقیقت یعنی آئیڈیا کی نقل در نقل ہے۔ اس لیے یہ دنیا غیر حقیقی ہے۔ اپنی کتاب (Republic) میں افلاطون نے ان خیالات کا اظہار کچھ یوں کیا ہے۔

"This world of matter is the imitation of eternal-world and thus we are twice removed from reality " [20]

مثال کے طور ایک درخت جو مادی وجود رکھتا ہے، افلاطون کے نزدیک وہ حقیقت نہیں ہے بلکہ درخت تو فارم یا خیال کی دنیا ہے اور اصل درخت وہ ہے جو خالق کے ذہن میں ہے جس کی بنیاد پر درخت بنایا گیا اور یہ فانی یا مادی درخت اس حقیقی تصور کی نقل ہے۔ حقیقت، ذہنی صلاحیتوں کی صورت میں اپنی ارفع و اعلیٰ صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس فلسفہ کا بنیادی مقصد ذہن اور جسم کے تعلق میں ذہن کی فوقیت کو واضح کرنا ہے۔ اس کو آئیڈیلزم کہا جاتا ہے۔ یوں پہلی دفعہ فلسفے میں مابعد الطبیعات کو زیرِ بحث لایا گیا۔ افلاطون کو آئیڈیلزم کے نظریے کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ افلاطون کے علاوہ ہرکلے، نیسیخ، ہیگل اور فروبل جیسے عظیم فلاسفر بھی اس نظریے کے پیروکار ہیں۔

افلاطون کے بعد جس فلسفی نے ذہن کی حتمی حقیقت کے بارے میں فلسفیانہ بات کی، اس کا نام ڈیکارٹ ہے جسے جدید فلسفے کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس نے فلسفیانہ مسائل کو سائنسی نقطہ ء نظر سے حل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے دلیل سے ثابت کیا کہ اگر ذہن کا وجود حتمی ہے تو اس کا خالق بھی قادرِ مطلق اور لافانی ہو گا۔ مادی اشیا تغیر پذیر ہیں کیونکہ وہ اپنی ہیئت تبدیل کرتی رہتی ہیں اور ان کا وجود فانی ہے۔ اس کے برعکس خیالات یا نظریات لافانی ہیں کیونکہ وہ تغیر پذیر نہیں ہوتے۔ اسی بنیاد پر آئیڈیلزم کے پیروکار جسم اور ذہن کے تعلق پر بحث کرتے ہوئے انسانی ذہن کو حتمی حقیقت قرار دیتے ہیں کیونکہ ذہن کی تخلیق یعنی خیالات و نظریات لافانی ہوتے ہیں اس لیے زندگی میں اگر کوئی مستقل حقیقت ہے تو وہ نظریات اور خیالات ہیں۔

ڈاکٹر ڈارین شیلف[1] کے لیکچر آئیڈیلزم نے ذہن اور جسم کے تعلق میں ذہن اور اس کی تخلیق کو واضح کر دیا تھا۔ اس نقطہ نظر کو مزید تقویت سولھویں صدی کے فلسفی ہرکلے نے دی۔ جس نے کہا کہ:

I know there fore I am ...

یعنی میرا وجود اس لیے ہے کہ میں علم رکھتا ہوں۔

اس کے مطابق بیرونی دنیا بالکل ایسی ہے جیسا ہمارا دماغ اس کو محسوس کرتا ہے کیونکہ مادی افراد تغیر پذیر اور فانی ہیں اورانسانی ذہن اور اس کے خیالات لافانی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان فنا ہو جاتا ہے اور خیالات زندہ رہتے ہیں۔ روح لافانی اور جسم فانی ہے۔ ذہن اور روح مابعد الطبیعاتی عناصر ہیں اور یقیناً ان کا خالق بھی ہو گا اور اگر خالق ہے تو اس کی تخلیق اشرف المخلوقات ہے۔ ڈیکارٹ نے ذہن اور جسم

1 Dr Darren Shalloff's Lecture on Idealism

کے تعلق میں ذہن کو برتر قرار دیا ہے کیونکہ اس کے مطابق خیالات لا فانی ہیں اور یہی فرق انسان اور جانور میں ہے۔ اس کی بنیاد پر اس نے فلسفیانہ طور پر خدا کے وجود کو ثابت کیا ہے۔

اقبال کا تصورِ آئیڈیلزم:

آئیڈیلزم یوٹوپیا کا بنیادی عنصر ہے کیونکہ آئیڈیل مکمل اور لافانی ہوتا ہے۔ اقبال اپنے آئیڈیل کو مردِ مومن کہتے ہیں۔ یہ بات اب تک قابلِ بحث ہے کہ اقبال نے مردِ مومن کا تصور کہاں سے اخذ کیا ہے۔ اس حوالے سے مختلف آرا ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس کی بنیاد اسلامی تعلیمات پر مبنی ہے جبکہ دوسرے گروہ کے مطابق اس تصور کو مغربی فلسفے نطشے کے فوق البشر کا عکس بتایا جاتا ہے۔ عبدالکریم جیلی اپنی کتاب "انسانِ کامل" میں اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> "انسانِ کامل یا مردِ مومن کی زندگی جو آئینِ الٰہی کے مطابق ہوتی ہے، فطرت کی عام زندگی میں شریک ہوتی ہے اور اشیا کی حقیقت کا راز اس کی ذات پر منکشف ہوتا ہے اس کی آنکھ خدا کی آنکھ، اس کا کلام خدا کا کلام اور اس کی زندگی خدا کی زندگی بن جاتی ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے کہ جہاں انسانیت اورالوہیت ایک ہو جاتی ہے اور اس کا نتیجہ انسانِ ربانی کی پیدائش ہے۔"(۲۱)

یہی وہ مقام ہے جہاں ڈیکارٹ اور اقبال متفق نظر آتے ہیں۔ ڈیکارٹ نے اپنے نظریات کی مدد سے انسانی ذہن اور اس کی تخلیق کو لافانی قرار دیا ہے اور اقبال نے انسان کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے جس کو وہ مردِ مومن اور انسان ربانی قرار دیتا ہے۔

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اقبال نے مردِ مومن کا تصور مشہور جرمن فلاسفر نطشے سے لیا ہے جس نے اپنی کئی کتابوں میں فوق البشر انسان کا تصور پیش کیا ہے۔

بقول پروفیسر عزیز احمد:

> "نطشے کے فوق البشر کی تین خصوصیات ہیں: قوت، فراست اور تکبر،"۔(۲۲)

جب کہ اقبال کا مردِ مومن اپنی خودی کی تشکیل کرتا ہے، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی کے مراحل طے کرنے کے بعد اشرف المخلوقات اور دنیا میں اللہ کا خلیفہ بننے کا مرتبہ حاصل کرتا ہے۔

اقبال کا مردِ مومن اپنی کوشش سے خود کو اشرف المخلوق ثابت کرتا ہے۔ وہ عناصرِ فطرت کو قبضے میں لے کر ان کو اپنی منشا کے مطابق چلاتا ہے۔ وہ وقت اور حالات کے آگے ہتھیار نہیں ڈالتا بلکہ وقت کو اپنے

قبضے میں لیا ہے۔ رانا اعجاز احمد خان روزنامہ "جنگ" میں شائع ہونے والے اپنے مضمون "اقبال کے ہاں مردِ مومن کا تصور" میں اقبال کے مردِ مومن اور نطشے کے تصور کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نطشے کا کمال صرف مادہ کی تسخیر ہے لیکن مردِ مومن مادی تسخیر کو اپنا مقصد قرار نہیں دیتا بلکہ اپنے باطن سے نئے جہانوں کو تخلیق بھی کرتا ہے۔"(۲۳)

اقبال کا مردِ مومن جسمانی اور روحانی اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہے جو مضبوط قوتِ ارادی سے اپنے نفس کو شکست دیتا ہے۔ عقل کی بجائے عشق کی پیروی کرتا ہے تو فطرت کے راز اس پر آشکار ہوتے ہیں۔ عشقِ الٰہی کا ذریعہ اقبال کے مردِ مومن کو دلیری اور بے خوفی عطا کرتا ہے اور اس کی ذات دوسروں کے لیے مشعلِ راہ بن جاتی ہے۔ یہ دلیری اور بے خوفی ایک مثالی دنیا کی تشکیل کرتی ہے۔

بقول ڈاکٹر یوسف حسین:

"اپنے نفس میں فطرت کی تمام قوتوں کو مرتکز کرنے سے مردِ مومن میں تسخیر عناصر کی غیر معمولی صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کے باث وہ خود کو نیابتِ الٰہی کا اہل ثابت کرتا ہے۔ اس کی نظر افراد کے افکار میں زلزلہ ڈال دیتی ہے اور اقوام کی تقدیر میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔"(۲۴)

اقبال کا آئیڈیل اس کا مردِ مومن ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اس کا مردِ مومن اپنی زندگی میں جدوجہد اور کوشش کو سامنے رکھے، اپنے مقصد کے حصول کے لیے سچی لگن اور مقصد آفرینی کا جذبہ ہی اس کو منزلِ مقصود تک لے جا سکتا ہے۔

علامہ اقبال کا یہ تصور فرد کے اندر تبدیلی لانے کا مؤجب بن سکتا ہے اور یہ انفرادی تبدیلی جب اجتماعی میں بدل جائے گی تو قوم کا ہر فرد مومن کے پیکر میں ڈھل جائے گا۔ ان افراد کا تشکیل کردہ معاشرہ مثالی روپ اختیار کر جائے گا۔ یوں اقبال کا مردِ مومن کا تصور فرد کی انفرادی اصلاح سے معاشرے کی اجتماعی اصلاح اور مثالی معاشرے کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔

اقبال کا مردِ مومن کا تصور، مکمل جسم، مکمل عقل اور مکمل عشق کا مکمل اور حسین امتزاج بھی مکمل یا آئیڈیل ہی ہوگا۔ افلاطون نے بھی اپنی خیالی ریاست میں اپنے آئیڈیل کو فلاسفر کنگ یا فلسفی بادشاہ کی شکل میں پیش کیا ہے۔ لیکن اس میں عشق کے عنصر کی کمی تھی۔ مردِ مومن اسلامی فلسفۂ حیات کا ایک نمونہ یا مثالی

انسان ہے جو اسلامی فلسفہ حیات پر کاربند ہے۔ اقبال کے مردِ مومن کا ایک وصف اپنی ذات پر یقین اور اعتماد ہے۔ اس کے ساتھ وہ اپنے خالق کی یاد میں مگن رہتا ہے۔

قرآن کریم مردِ مومن کے ذکر الٰہی میں غرق رہنے کی کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے۔

" الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (آلِ عمران:۳ : ۱۹۱)

ترجمہ: وہ اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے ہر حالت میں اللہ کی یاد میں مگن رہتے ہیں۔

مردِ مومن یادِ الٰہی سے غافل نہیں ہوتا۔ مردِ مومن اللہ تعالیٰ کے جلووں سے سیر اب ہو کر شانِ مظہریت کا حامل ہو جاتا ہے اور دلیلِ حق بن جاتا ہے۔ وہ صفاتِ کاملیت کے نقطہ انتہا پر پہنچ جاتا ہے جہاں رب العزت اس کے قول کو اپنا قول قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ قران کریم میں ارشاد ہوا ہے۔

وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (سورۃ النجم:۵۳۔۳ : ۴)

ترجمہ: یہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتا ہے وہ تو رب کا کلام ہوتا ہے۔

یوٹوپیا کے عناصر

۲۔ تکمیل پسندی:(Perfectionism)

تکمیل پسندی سے مراد انسان کی مکمل بننے اور نظر آنے کی خواہش ہے۔ نفسیات کے نقطۂ نظر سے یہ خواہش انسانی شخصیت کی ایک مثبت خوبی ہے جو اس کو بہتر سے بہتر تر بناتی ہے۔ اپنے حالات کو تبدیل کرنے اوران میں بہتری لانے کی خواہش ہر ذی روح میں موجود ہوتی ہے مکمل پسندی کی خواہش فرد کو زندگی میں ناممکن اور مشکل مقاصد کے حصول کی جانب راغب کرتی ہے۔

علم نفسیات کی رُو سے فرد جب ناممکن کو حاصل کرنے میں ناکام ہوتا ہے تو یاسیت کا شکار ہو جاتا ہے جو ڈپریشن اور دوسرے نفسیاتی عوارض کا باعث بنتی ہے۔ ماہرِ نفسیات تھامسن کے مطابق:

> “While aiming for the best can be helpful, perfectionism as a trait can be damaging, putting us at risk of mental and physical illness. (25)

تھامسن کے نزدیک خود کو بہتر بنانے کی خواہش بذاتِ خود بری نہیں ہے لیکن اگر اس کی بنیاد پر آپ اپنی ذہنی اور جسمانی صحت کو برباد کرتے ہیں تو یہ مضر ہو سکتی ہے۔

دینِ اسلام کی تعلیمات کے مطابق مکمل صرف خدا کی ذات ہے۔ انسان بہتر بننے کی کوشش کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک یوٹوپیا یا مثالی ریاست کا وجود عمل میں نہیں آیا کیونکہ مکمل مثالی ریاست کا وجود ناممکنات میں شامل ہے۔ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کے لیے کوشش کی جاسکتی ہے۔

یوٹوپیا کی سماجی تعبیر:

سماجی یوٹوپیا سے مراد یوٹوپیا کی طبعی یا مادی شکل لی جاتی ہے جس میں ایک مکمل مثالی معاشرہ دکھایا جاتا ہے۔ عام طور پر یوٹوپیا سے مراد ایک ناممکن منصوبہ لیا جاتا ہے لیکن افسانوی ادب نے اس کو ممکن کر دکھایا ہے۔

ایک مثالی ریاست کا تصور تقریباً ۵۰۰ قبل مسیح سے فلسفیوں اور مفکرین کے ذہنوں میں موجود رہا ہے جس کی اولین مثال جیسا کہ ذکر ہوا کہ فلسفے کے بانی افلاطون کی کتاب Republic میں نظر آتی ہے۔

لائن میکڈونلڈ نے سماجیات کی تاریخ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اپنی کتاب "Most of the history of the social sciences." میں کیا تھا۔۵اور ۶ قبل مسیح میں سماجی سائنس میں بہت تبدیلیاں آچکی تھیں۔یوٹوپیا کے بارے میں میکڈونلڈ نے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا:

> "The formation of utopia has always started with an idea and the idea is an cotcome of thoughts arising in mind, based on socio-political structure of society." (26)

میکڈونلڈ کے نزدیک معاشرے کی تشکیلِ نو ہمیشہ سے سماجی یوٹوپیا کا ناگزیر حصہ رہا ہے۔یوٹوپیا کا نقطۂ آغاز انسانی ذہن کی سوچ سے ہوتا ہے اور اس سوچ کی بنیاد معاشرے کا وہ مثالی سیاسی و سماجی ڈھانچہ ہوتا ہے جو مفکر کو تبدیلی لانے پر مجبور کرتا ہے۔ نظریات اور فلسفہ نہ صرف انسانی ذہن کی اختراع ہیں بلکہ افراد کے طرزِ زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔افلاطون کو نہ صرف فلسفے کا بانی کہا جاتا ہے بلکہ یوٹوپیائی ادب کا بانی بھی کہا جاسکتا ہے۔افلاطون کے بعد اس فہرست میں دوسرا نام تھامس مور کا ہے جس نے ۱۵۱۶ء میں یوٹوپیا Utopia کے نام سے تحریر کردہ کتاب میں ایک مثالی ریاست کا نقشہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد ۱۹۲۲ء میں (Mumford) نے (The story of utopias)، اور ۱۸۴۷ء میں کارل اور اینگل نے (Comunist Monifesto) کے نام سے ایک مثالی ریاست کی مثال دی جس کی بنیاد مارکسزم کے نظریات پر رکھی گئی۔ ٹھیپا چارا نے ۲۰۰۰ء میں (The Utopia of ancient India) کے نام سے ایک مثالی ریاست کی تجویز دی۔

سماجی یوٹوپیا کی بابت بات کی جائے تو ۴ قبل مسیح میں افلاطون نے ایک سماجی اور سیاسی یوٹوپیا کا تصور "ریاست" کے نام سے اپنی کتاب میں تحریر کیا۔ افلاطون نے اپنی اس کتاب میں سماج کو معاشی و معاشرتی صورتِ حال کی بنیاد پر تین حصوں میں تقسیم کیا ہے جس کو اس نے 'سونا'، 'چاندی' اور 'کانسی' کا نام دیا ہے۔ افلاطون کا یہ ماننا ہے کہ فلسفیوں کو حکومت یا ملک کی باگ ڈور سنبھالنی چاہیے تا کہ وہ غربت اور افلاس کا خاتمہ کرنے کے لیے کوئی حل سوچ سکیں۔ بابر جاوید[1] نے اپنے ایک مضمون میں مختلف یوٹوپیا کے بارے میں تفصیلی ذکر کیا ہے جس کے مطابق:

افلاطون نے اپنی کتاب میں تجاویز تو پیش کر دیں لیکن سماج کی بہتری کے لیے عملی اقدامات نہیں اٹھائے گئے۔ افلاطون کے بعد ۱۱ویں صدی میں منو (Manno) نے اپنی کتاب The laws of Manno کے نام سے ایک یوٹوپیائی ریاست کی تشکیل کے لیے کچھ تجاویز دیں جو اس کے خیال میں سماج کی اخلاقی اقدار کو بہتر بنا سکیں گی۔ اس نے یوٹوپیا کا ایک بنیادی ڈھانچہ تشکیل دیا جس میں لوگوں کو پیشوں کے حساب سے چار حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ جس کو اس نے برہمن، کھشتری، ویش اور شودر کا نام دیا۔ اس کے علاوہ حکومت اور سیاست کے سلسلے میں بھی اس نے راہنمارائے دی۔ منو کا یہ سماجی ڈھانچہ آج بھی ہندوستان میں کسی حد تک عملی شکل میں نظر آتا ہے۔

تھامس مور نے ۱۵۱۶ء میں یوٹوپیا کے نام سے ایک تصوراتی جزیرہ آباد کیا جس میں حکومت ملک کا تمام انتظام دیکھتی ہے۔ عوام کی خوراک اور لباس تک اس حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے اور اس کتاب کی آمد کے بعد ایک مثالی اور فلاحی ریاست کا انتظام ممکن نظر آ رہا تھا۔

پروفیسر بابر جاوید نے انٹرنیشنل جرنل آف ریسرچ میں اپنے آرٹیکل میں اظہار خیال کیا ہے:

> "A study of perfect social trie political set-up The Utopia of Moor and Munnu tried to exsclaim how the society would be in a Utopia, how will be the citizens work and live , and how will be the social-economic aspects of an ideal-society." (27)

مصنف کے نزدیک ان دونوں کتابوں کے بعد یوٹوپیائی ریاست کے خدوخال کافی حد تک واقع ہو چکے تھے اور اب وہ مقام آ گیا تھا جب یوٹوپیا مفکرین کے ذہنوں سے نکل کر صفحہ قرطاس اور پھر مادی صورت اختیار کرنے والا تھا۔

1 Social-Utopa- A study of perfect socio-political set-up, by Baber Javed, Journals, Pen2 Print.org

۱۸۴۷ء میں کمیونسٹ مینی فیسٹو(Communist Mamifesto) کے نام سے ایک مثالی ریاست کا تصور مارکس اور ہیگل نے دیا تھا۔ یہ کتاب مارکسسٹ نظریات کی ترویج کے لیے تحریر کی گئی جس میں مصنفین نے کمیونزم کے فلسفہ کی بنیاد پر ایک منصفانہ معاشرے کا تصور پیش کیا لیکن یہ تصور خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کرسکا۔ سوویت یونین میں ستر سال قائم رہنے کے باوجود یہ نظام برقرار نہ رہ سکا۔

یوٹوپیا کی مختصر تاریخ پر ایک اجمالی نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سماجی یوٹوپیا کے متعلق مفکرین کا نقطہ نظر وقت کے ساتھ ارتقاپذیر ہو رہا ہے۔ افلاطون اور مانو کے نزدیک حکومت کی بہترین شکل بادشاہت (monarchy) ہے۔ مارکس نے کمیونزم کو اپنا مثالی طرزِ حکومت قرار دیا۔ افلاطون نے معاشرے کو اقتصادی صلاحیتوں کے لحاظ سے مختلف گروہوں میں تقسیم کیا اور مارکس نے معاشرے میں معاشی انصاف اور توازن کا قانون لاگو کر کے اس کو مثالی بنانے کی کوشش کی۔

سماج نے ان تمام مفکرین کے اثرات کو قبول کیا اور یوٹوپیا کے حصول کی کوشش جاری رہی ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سماجی یوٹوپیا کی کسی ایک تعریف پہ اتفاق ہونا لازم نہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں کے معاشرتی رویہ میں بدلاؤ آتا ہے، اس لیے سماجی یوٹوپیا کی کوئی مخصوص سماجی تعبیر ممکن نہیں ہے۔ تاہم ان تمام مفکرین کے نظریات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ معاشرے کو بہتر بنانے کے لیے اخلاقی حدود و قیود کا ہونا لازمی ہے۔ معاشرتی فلاح کے لیے قانون بنائے جائیں جو لوگوں کو سماجی ضابطوں کا پابند کر سکیں۔ سہگل نے اس صورتِ حال میں اپنی رائے یوں دی:

> "But the dream goes away when the utopian vision is not merely imposed through logic."(28)

اس کے خیال میں ایک یوٹوپیائی سماج میں انصاف نہ صرف عدالتوں میں بلکہ سماجی اقدار اور روایات میں بھی عیاں ہونا چاہیے۔ غریب و امیر کو اپنے مقاصدکے حصول کے یکساں مواقع میسر ہوں ۔ معاشرے میں کسی قسم کا امتیازی سلوک حیثیت، مرتبہ اور دولت کو مدِ نظر رکھ کر نہ رکھا جائے۔

کارل مارکس کے مطابق:

> "The citizens may rebel if the society is changed througpolitical change.(29)

مارکس کے نزدیک اگر معاشرے کو سیاسی انداز سے تبدیل کیا جائے گا تو لوگ اس کے خلاف بغاوت کریں گے کیونکہ سماج میں سیاسی تبدیلی مارکس کے نزدیک کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ اس کے مطابق سماجی یوٹوپیا کا

حصول تب ممکن ہو سکے گا جب لوگوں کے معیارِ زندگی، ان کی روایات اور ان کی اقدار میں تبدیلی آئے گی۔ اگر ان مفکرین کے خیالات کو عملی جامہ پہنایا جائے تو سماجی یوٹوپیا کی تعبیر ممکن ہے لیکن اس کے لیے لوگوں کے رویوں اور کردار میں تبدیلی لانا زیادہ ضروری ہے۔

یوٹوپیا کی نفسیاتی تعبیر:

یوٹوپیا کی نفسیاتی تعبیر میں پہلا سوال یہ ہے کہ انسان یوٹوپیا کی تخلیق کیوں کر اور کیسے کرتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب حقیقت کی دنیا اس کے اطمینان کے لیے ناکافی ہو جاتی ہے تو وہ اس حقیقت جس کو نفسیات کی زبان میں Dystopia کہا جاتا ہے، سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہی وہ راہِ فرار ہے جس کو ماہرِ نفسیات Sigmund Freud نے نظریہ فراریت یا Escapism کا نام دیا ہے۔ جو اس کے ذریعے فرد اور معاشرے کے تعلق کو واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق Utopianism مصنف یا تخلیق کار کا معاشرے اور اس میں بسنے والے لوگوں کے متعلق ایک رویہ یا اظہارِ خیال ہے اور یہ خیال یا رویہ اپنے اندر ہم آہنگی اور کل کا تاثر نہیں رکھتا۔ فرائڈ دراصل Utopianism کے دوران برتی جانے والی اس تکنیک کا ذکر کرتا ہے جس کو ماورائے حقیقت کہا جاتا ہے۔

جہاں تک نفسیات اور یوٹوپیا کے تعلق کی بات ہے تو اس سلسلے میں ڈاکٹر M.WBarday نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے کی تلخیص میں اس تعلق کو واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

علمِ نفسیات انسانی ذہن کا مطالعہ ہے اور ادب زندگی کی تنقید اور مطالعہ ہے۔ علمِ نفسیات فرد کے ان انفرادی رجحانات کو زیرِ بحث لاتا ہے جن کا مشاہدہ اور مطالعہ ادب مجموعی طور پر کرتا ہے۔ یوں ادب اور نفسیات کے تانے بانے آپس میں باہم مدغم نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ اس سے قبل ذکر ہو چکا کہ یوٹوپیا کا لفظ سب سے پہلے تھامس مور نے ۱۵۱۶ء میں اپنی کتاب Utopia میں استعمال کیا تھا جس میں وہ South Atlantic Ocean کا ذکر کرتا ہے۔ یہ ایک طلسماتی جزیرہ ہے جو مصنف کے خوابوں کی تصویر پیش کرتا ہے۔

مائیکل ڈبلیو بارڈ (M.W. Brclay) نے اپنے مقالہ میں اس کا ذکر کچھ یوں کیا ہے۔

> "Utopionism in psychology functions as a totalizing discourse as a manner of speaking about society and human being that tends towards homgeneity and totalitatarian through decontextualization of the text. (30)

ماہرینِ نفسیات کے نزدیک وہ تمام ذہنی عوامل جو ذہن کو اس وقت درپیش صورتِ حال سے فرار دلاتے ہیں اور اس کو ایسی صورتِ حال میں لے جاتے ہیں جو اس کو فرار کی راہ سمجھاتے ہیں اور یوں پھر تازہ دم ہو کر نئے سرے سے ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

مائیکل ڈبلوبارڈ کے نزدیک یوٹوپیا نفسیات میں کسی بھی معاشرے اور انسانوں کے متعلق ایک مجموعی گفتگو ہے۔ایک رویہ یا اظہارِ خیال ہے جو ہم آہنگی اور کلیت کا تاثر دیتا ہے۔ متن کی تخفیف کاری اور زمان و مکان کے حوالے سے ہم آہنگی سے حقیقت سے ماورالاشعور تک رسائی مل جاتی ہے۔ پلاٹ کو خاص وقت اور ایک خاص مقام کی ضرورت ہوتی ہے لیکن یوٹوپیائی ادب (Utopian Literature) میں پلاٹ کے لیے مصنف زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر ایک ماورائی دنیا کی تشکیل کرتا ہے یا دوسری صورت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ وہ ارسطو کی پیش کردہ تینوں شرائط پر عمل پیرا نہیں ہوتا۔ اس صورت حال کو Antistates کہا جاتا ہے۔ انسانوں اور مناظر کی مطابقت کو مصنف اپنے جذباتی تجربے کے زیرِ اثر منظر سے منقطع کر دیتا ہے اور یہ decontextualization of text یعنی متن کی تخفیف کاری کا عمل کہانی کو کبھی ماضی اور کبھی مستقبل میں لے جا کر اپنا یوٹوپیا تشکیل کرتا ہے۔ یوٹوپیائی تشکیل کے لیے وہ تجرید، شعور کی رَو (Stream of Conciousness) اور آزاد تلازمہ خیال جیسے ذہنی عوامل کی مدد بھی لیتا ہے۔ اس لیے یہ عمل نفسیات علم کے دائرہ کار میں آتا ہے۔ کیونکہ مصنف نفسیاتی عوامل کو استعمال کرتے ہوئے متن کی تخفیف کاری کرتا ہے۔ جدید ادب میں اس تکنیک کو سرریئلزم کا نام دیا گیا ہے۔ ۱۹۴۴ء میں اس نظریے کو ساز آندرے برتیاں نے پیش کیا۔ جبکہ سجاد ظہیر کے نزدیک یہ تکنیک جو اب تحریک کی صورت اختیار کر چکی ہے، ڈاڈازم کا تسلسل ہے جو نفسیات اور ادب کے تعلق کو زیرِ بحث لاتی ہے۔

"کشاف تنقیدی اصطلاحات" کے مطابق:

> "سرریئلزم آرٹ کی ایک خاص شکل ہے جس میں نقاش اپنے تخیلات کو قوتِ استدلال اور قوتِ ممیزہ کی تشکیلی اور اصطلاحی مداخلت کے بغیر خوابوں کی سی بے ربطی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔(۳۱)

یوٹوپیا اس عقیدے یا نظریے کا نام ہے جن کی مدد سے اخلاقی اصول و ضوابط پر مبنی ایک مثالی ریاست کا قیام عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ بالالفاظِ دیگر یہ معاشرتی اور سیاسی سوالات کے جواب میں ایک مثالی یا غیر مرئی

نقطہ نظر کا نام ہے۔ مثالی اس لیے کہ اس کے حصول کی کوشش کی جاسکتی ہے اور غیر مرئی اس لیے کہ فی الوقت عالم امکانات میں موجود نہیں ہے،فقط مصنف کے تصور میں ہے

اردو ادب میں اس تکنیک کا استعمال ناسٹلجیا اور یوٹوپیا کے رجحانات کی ذیل میں ہوتا ہے۔یہ رجحانات چوں کہ انسانی ذہن کی صناعی ہیں،اس لیے ان کا براہِ راست تعلق انسانی نفسیات سے بنتا ہے۔یہاں ان دونوں رجحانات کا سرسری مطالعہ نظریہ فراریت (Escapism Theory) کے تحت کیا جائے گا جس کو مشہور ماہر نفسیاتSigmend Freudنے پیش کیا ہے۔

فراریت ایک معاشرتی رجحان اور انسانی ذہن کی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے وہ زندگی کے حقائق سے خواب، خیال یا تصور سے چشم پوشی اختیار کرتا ہے۔Escapism کی اصطلاح کو سب سے پہلے Thomas Moor نے ہی استعمال کیا۔نفسیاتی علوم میں اس کا استعمال سگمنڈ فرائیڈ نے کیا۔اس نے تحلیلِ نفسی کے متعلق اپنے مضمون میںescapismیا فرار کو اس طرح بیان کیا ہے۔

> "They cannot subsist on the scantly statisfaction, they escape from reality." (32)

فرائڈ کے مطابق جب زندگی کی حقیقت فرد کے اطمینان کے لیے ناکافی ہوتی ہے تو وہ اس سے فرار حاصل کرتے ہیں۔ جس کوDecontextualization of Textیا متن کی تخفیف کاری کہا جاتا ہے جس کی مدد سے متن کو زمان و مکان سے ہم آہنگ کرتے ہوئے لاشعور تک رسائی حاصل ہوتی ہے اور ایسا متن تخلیق کیا جاتا ہے جو حقیقت سے ماورا تو ہوتا ہے لیکن حقیقت سے قریب تر محسوس ہوتا ہے۔اس میں سررئیلزم کی تکنیک کا سہارا لیا جاتا ہے۔

تھیوڈور فینٹنے کے مطابق بلواریا کا بادشاہ لوڈوگ ویگزین زندگی کے مسائل سے فرار حاصل کرنے کے لیے دیومالائی دنیا میں پناہ لیتا تھا۔وہ اور اس کے پیروکار آرام کرنے اور خیالی دنیا میں آباد ہونے کے عمل کو غم و غصہ اور دوسرے جذباتی مسائل کا حل بتاتے تھے۔ اس کا مقصد ذہن کو آرام پہنچانا اور تازہ دم ہو کر مسائل سے نبرد آزما ہونا تھا۔

Theodor–Fontone. کے مطابق:

> "His followers saw rest and wish-fulfilment as useful tools in adjusting tranmatic upset. While later psychologist have highlighted role of various distractions in shifting unwanted moods especially anger and sadness."(33)

"Escapism as a manifestation of unfulfilled dreams, was viewed by Freud psychoanalysis."(34)

مختلف ماہرینِ نفسیات نے مزاج میں مختلف تغیریات اَن چاہے موڈ مثلاً غصہ اور پریشانی کو دور کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ فرائڈ تصورات، خیالات خواب اور دوسرے ذہنی اعمال کو فرار کا ذریعہ بتاتا ہے۔

حقیقت فقط وہ ہے جس کو انسان کا دماغ قبول کرتا ہے اور فرائڈ کے مطابق:

The Freud considers a quota of escapist fantasy a necessary element in life of humans."(35)

یہ فرائڈ کا مشہور زمانہ نظریہ تحلیلِ نفسی ہے۔ اس نظریے کے مطابق فرائڈ نے انسانی ذہن کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے جس کو اس نے شعور، تحت الشعور اور لاشعور کا نام دیا ہے۔ تحلیلِ نفسی کے مطابق لاشعور کے دو حصے ہیں جن کو فرائڈ نے (I.D) اور (Ego) کا نام دیا ہے۔ I.D لاشعور کا وہ حصہ ہے جو خوشی اور مسرت کی تلاش میں مصروف رہتا ہے اور یہ حصہ انسان کی شیر خوارگی، بچپن اور خواب میں مصروفِ عمل رہتا ہے۔ فرائڈ کے اس نظریے کو Plearsure Principle کا نام دیا گیا جو اس نے ۱۹۲۰ء میں پیش کیا۔ اس نظریے کے مطابق:

"The course taken by mental events is auto matically regulated by the pleasure principle associated with an avoidance of unpleasure or production of pleasure." (36)

فرائڈ کے اس طریقے کو دوسری جنگ عظیم کے مریضوں پر کامیابی سے استعمال کیا گیا تھا۔

انسانی ذہن ناخوشگوار واقعات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے جو راہ اختیار کرتا ہے، اس کو آگے چل کر فرائڈ نے خود Utopian Thoughts کا نام دیا ہے۔

فرائڈ کا یہ نظریہ یوٹوپیائی تصورات کو ایک نفسیاتی بنیاد فراہم کرتا ہے جس کی مدد سے انسان ناخوشگوار حالات سے وقتی طور پر ہی نجات حاصل کرتا ہے۔

یوٹوپیائی ادب کی تخلیق میں ماورائے حقیقت (Surrealism) کی تکنیک سے کام لیا جاتا ہے۔ فرائڈ ذہن کے لاشعور کے تصور کو ماورائے حقیقت مراد لیتا ہے جو حقیقت سے بڑھ کر حقیقت ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ سرریئلزم تحریک کے ماننے والوں کا خیال ہے کہ بہترین ادب کی تخلیق تحت الشعور کی رسائی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ انسان کے خواب اور خیالات کو اپنے موضوع کے لیے بہترین مواد سمجھتے

ہیں۔ اس حوالے سے نفسیات میں زیر استعمال تکنیک، تجرید، شعور کی رو اور آزاد تلازمہ خیال کا استعمال عمل میں لایا جاتا ہے جو اس کو تحلیلِ نفسی اور ذہن کے لاشعوری حصے تک رسائی فراہم کرتا ہے۔

ایمانول برمن (Emanuel Berman) نے اپنے آرٹیکل (Psychoanalisis, Rescew and Utopia) میں فرائڈ کا حوالہ دیا ہے۔

> "All the energy which is today consumed in the production of neurotic symptoms serve the purpose of world phantasy isolated from reality. (37)

اپنے اس بیان میں فرائڈ نے ایک ایسی دنیا کا حوالہ دیا ہے جو انسان کے تصور کی تخلیق اور حقیقت سے دور ہے اور یوں فرائڈ ایک تخیلاتی دنیا کا تصور دیتا ہے جو یوٹوپیا سے قریب تر ہے۔ فرائڈ کے مطابق ایک عام انسان سوتے میں خواب دیکھتا ہے جبکہ تخلیق کار جاگتے میں خواب دیکھتا ہے جو اس کا یوٹوپیا کہلاتا ہے۔

پاول ریسور کے مطابق:

> Utopia is an act of self-oblivence that overlaps reality." (38)

یوٹوپیا خود فراموشی کا وہ عمل ہے جو حقیقت پر پردہ ڈال دیتا ہے۔

لنڈا ہچن ماضی کو انسان کی زندگی کا ناقابلِ فراموش حصہ سمجھتا ہے جس کو انسان اپنی ذات سے کبھی علیحدہ نہیں کر سکتا۔ ماہرینِ نفسیات کے مطابق یوٹوپیا کا لفظ کثیر معنوی ہے جو معاشرتی اور اجتماعی زندگی کے پہلوؤں کی تشکیل کرتا ہے۔ کچھ ناقدین کے مطابق یہ رجحان موجودہ صورتِ حال کے خلاف ایک مزاحمتی رویے کے طور پر سامنے آتا ہے جو حقیقی صورتِ حال کی نفی کرتا ہے۔ یوٹوپیا کے متعلق (Riot-Sarcay) فرانسیسی ماہرِ نفسیات کی رائے یہ ہے:

> "The word Utopia is multidimensional that covers all aspects of social and collective life. Sometimes it is in the form of pain whose ingredients are scattered and different". (39)

یوٹوپیا کا لفظ کثیر معنوی اور کثیر جہتی ہے جو معاشرتی اور اجتماعی زندگی کے پہلوؤں کی تشکیل کرتا ہے۔ بعض اوقات یہ ایک کسک کی صورت میں بیدار ہوتا ہے جس کے اجزا منتشر ہوتے ہیں۔ جس کے مطابق روز مرہ زندگی کے وہ ناخوشگوار اور تلخ واقعات جن کو فرد بھلانا چاہتا ہے کے لیے وہ خواب خیال یا دوسرے ذہنی اعمال کا سہارا لیتا ہے۔ اپنے تلخ حال کو مستقبل کے خوبصورت خوابوں میں بھلاتے ہوئے فرار حاصل کرتا ہے اور یوں یوٹوپیا تشکیل کرتا ہے۔

جرمن فلاسفر Ernast-Block کے مطابق:

Future is discovered in the longings of past as an unfulfilled promise. (40)

"ماضی کی آرزو میں مستقبل کو ایک نامکمل وعدے کے طور پر دریافت کیا جاتا ہے۔"

اور یہ وہ مقام ہے جب ناسٹلجیا اور یوٹوپیا باہم مدغم ہو جاتے ہیں کیوں کہ یوٹوپیا ایک آئیڈیل جگہ ہے اور جب مصنف ڈسٹوپیا یعنی موجودہ خراب صورتِ حال سے خواب ناک ماضی میں پناہ لیتا ہے تو یہ یوٹوپیا کی ایک صورت ہے۔ علمِ نفسیات میں فرد کے اعصابی اور ذہنی تناؤ سے نجات دلانے کے لیے اس کو تحلیلِ نفسی، خیالات، تصور یا ایسے دوسرے ذہنی اعمال کے ذریعے حقیقی دنیا سے دور لے جاتا ہے۔ اطلاقی نفسیات میں اس کو طریقہ ءعلاج کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

مزید ٹراما کی صورتِ حال میں یہ طریقہ کار کافی اچھے نتائج کا حامل نظر آتا ہے۔ اَن چاہے موڈ مثلاً غصہ اور یاس کی کیفیت میں daydreaming کی سرگرمی کو کافی مفید قرار دیا گیا ہے۔ مذکورہ منفی جذبات کو daydreaming سے تسکین دے کر Catharsis کے ذریعے کم کیا جاتا ہے۔ مریض کو لاشعور میں لے جا کر سلا دیا جاتا ہے اور وہ وقتی طور پر ان افسردہ خیالات کو بھلا دیتا ہے، پھر جب حقیقی دنیا میں آتا ہے تو اس کیفیت کو قدرے بھلا دیتا ہے۔

گزشتہ سطور میں یوٹوپیا اور نفسیات کے باہم تعلق کو واضح کیا جا چکا ہے، اب ذیل میں اس کے فلسفیانہ پہلوؤں پہ بات ہو گی۔

علمِ نفسیات میں رائج اصطلاح نفسیاتی یوٹوپیا (Psychological Utopia) کے اثرات علم فلسفہ پر بھی نظر آتے ہیں۔ نفسیاتی یوٹوپیا کو نہ صرف اطلاقی نفسیات میں بطور طریقہ ءعلاج استعمال کیا جاتا ہے بلکہ اس کے اثرات فلسفہ پر بھی نظر آتے ہیں۔ علمِ نفسیات میں یوٹوپیا کو فراریت کی ایک شکل قرار دیا گیا ہے جس میں فرد ناخوشگوار حالات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اپنی من چاہی دنیا آباد کر لیتا ہے۔ وہ خوابوں اور خیالوں میں ایسی مثالی زندگی کا تصور کرتا ہے جو اس کے دل کے قریب ہوتی ہے۔

رینے ڈیکارٹ کو جدید فلسفے کا بانی کہا جاتا ہے۔ ڈیکارٹ کا فلسفہ فراریت کے اس رجحان کی تصدیق کرتا ہے۔ اس نظریے کو ڈیکارٹ نے Theory of Innate Knowledge کا نام دیا ہے۔ اس کے مطابق انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل و شعور عطا کیا ہے، انسانی ذہن حتمی حیثیت پر فائز ہے وہ جو کچھ سوچتا ہے، وہ درست

اور حتمی (absolute) ہے۔ اس لیے اگر انسانی ذہن ناخوشگوار حالات سے چھٹکارا پانے کے لیے مثالی تصور پیش کرتا ہے تو وہ عقل و دانش پر مبنی ہے اور درست ہے۔

سوپسزم اور Pansopiamirn کے نظریات انسانی ذہن کی اختراع کو حتمی سمجھتے ہیں۔ ان کے مطابق یوٹوپیا چونکہ انسانی ذہن کی ایجاد ہے، اس لیے اس کو تجربے سے پرکھنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ F.H.Bradly کے اس نظریے نے فلسفے اور نفسیات کی دنیا میں ایک بھونچال برپا کر دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں بی ایف سکنر B.F Skinner جیسے عظیم ماہرِ نفسیات کے ادراکی اور اکتسابی نظریات نے اُس تعلیم کو چاروں شانے چت کر دیا جو ڈارون کے نظریہ ارتقا کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انسان کو بندر سے ملاتی تھی۔ کیوں کہ Bradly کے مطابق انسان بندر سے ذہنی لحاظ سے ارفع و اعلیٰ مخلوق ہے اور یوٹوپیا چونکہ انسانی ذہن کی تخلیق ہے، اس لیے فلسفیوں کے مطابق انسانی ذہن جو کچھ سوچتا ہے، وہ سب سے بڑی حقیقت ہوتی ہے۔

نظریہ فراریت کے اثرات فلسفے پر بھی نظر آتے ہیں۔ Psychological Utopia کے اثرات مشہور فلسفی ڈیکارٹ (Descartes) کے egocontricism یعنی فلسفہ انانیت پر نظر آتے ہیں۔ اس نکتے پر دونوں نظریات باہم مدغم ہو جاتے ہیں۔ ڈیکارٹ نے اس نظریہ فراریت کا پس منظر تشکیل دیا کیونکہ جب وہ خدا کی مہربانی کا ذکر کرتا ہے اور پیدائشی عقل و شعور جو خدا کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے، کو Theory of innate knowledge کا نام دیتا ہے۔ جدید ماہرِ علمیات جان لاک نے اسے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

"What I know is the content of any own mind". (41)

ترجمہ: جو کچھ میں جانتا ہوں یا جو کچھ میرے علم میں ہے، وہ سب میرے ذہن کی پیداوار ہے۔

مندرجہ بالا تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ F.H Brddley کے نظریے نے B.F Skinner کے ادراکی اور ڈیکارٹ کے فلسفہ انانیت کو متاثر کیا ہے۔ جس کے اثرات ادب میں Solipsism کے نظریے پر بھی نظر آتے ہیں۔ اس نظریے میں حقیقت اور تصورات کے درمیان موجود خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بنیادی طور پر سولپسزم کا نظریہ سگمنڈ فرائڈ کے نظریہ سے متاثر نظر آتا ہے جس کو Psychicautomatism کا نام دیا گیا تھا۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو دماغ کو ان تمام عقلی اور مادی اقدار (Utiliatiria) سے آزاد قرار دیتا ہے اور اس پر اخلاقی اور جمالیاتی قوانین لاگو کرتا ہے۔ اس کے اثرات F.H.Bradly کے نظریہ Solipsism پر بھی نظر آتے ہیں، جو برطانوی آئیڈیلسٹ فلسفی ہے۔ یہ نظریہ

۱۸۹۳ء میں پیش کیا گیا۔ اس نے اپنے مضمون Appearance and Reality میں سولپزم کی تعریف یوں کی ہے:

> "Solipsism is an extreme form of subjective idealism that deneies that human mind has any valid ground for believing in the existence of anything but itself."(42)

مندرجہ بالا ماہر نفسیات اور فلسفیوں کے نظریات بھی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انسانی ذہن ارفع واعلیٰ صفات کا حامل ہے اور اسی بنیاد پر انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کیا گیا ہے۔

اس تمام مطالعے اور بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سولپسزم، آئیڈیلزم کی انتہائی نوعیت کی صورت ہے جو اس حقیقت سے انکار کرتی ہے کہ اب تک اتنی سائنس تحقیقات کے باجود بھی انسانی ذہن کے وجود سے انکار کی کوئی ٹھوس وجہ سامنے نہیں آ سکی۔ اس نظریے کی بنیاد F.H.Bradly نے Pansopianism کے فلسفے پر رکھی جس کے مطابق انسانی ذہن ہمہ گیر (Omnisient) علم کا حامل ہے۔ وہ حتمی علم کے مرتبے پر فائز ہے۔ یوں اس کے نظریے نے علمِ نفسیات میں بھونچال برپا کر دیا تھا۔ کیوں کہ یہ نظریہ علم نفسیات کے ادراکی (Congnitive) اور کرداری (Behaviiovrrism) نقطۂ نظر کی یکسر نفی کرتا نظر آتا ہے جو سیکھنے کو اور حصولِ علم کو ایک اکتسابی عمل قرار دیتے ہیں۔ اس نظریے کے حامی ایک عالمگیر نظامِ تعلیم کے داعی ہیں جس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ انسانی ذہن کی صلاحیت یکساں ہے۔ اس لیے ایک آفاقی نظام تعلیم اور یکساں نصاب (Universal Education) رائج ہونا چاہیئے تا کہ موجودہ نسلی اور علاقائی تفاوت کو ختم کرنے میں مدد مل سکے۔ اس نظریے کے مطابق یوٹوپیا انسانی ذہن کی اختراع ہے اس لیے اس کو کسی تجربے کی کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ Escapism اور Solipsism کے نظریات کے مطابق Utopia چوں کہ مصنف کے ذہن کی اختراع ہے اور انسانی ذہن حتمی مقام (absolute-position) پر فائز ہے، اس لیے انسانی ذہن جو کچھ سوچتا ہے، دنیا کی وہ سب سے بڑی حقیقت ہوتی ہے۔ اسی لیے مندرجہ بالا نظریے کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یوٹوپیا بھی ایک حقیقت ہے۔

یوٹوپیا کی سیاسی تعبیر

قبل ازیں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ یوٹوپیا کے موضوع پر سب سے پہلے افلاطون نے قلم اٹھایا۔ اس نے اپنی کتاب Republic میں نہ صرف پہلی مرتبہ لفظ یوٹوپیا استعمال کیا بلکہ اس کی سیاسی وضاحت بھی کی۔ افلاطون نے ایک مثالی ریاست کا سیاسی وسماجی ڈھانچہ پیش کیا جس پر سمارٹا کے قوانین کا اطلاق ہوتا تھا۔ اپنے

مثالی سیاسی ڈھانچے میں افلاطون کی تجویز ہے کہ حکومت کی باگ ڈور فلسفیوں کے ہاتھ میں دی جانی چاہیے کیونکہ وہ نہ صرف دانش مند ہوتے ہیں بلکہ بے غرض اور نیک بھی ہوتے ہیں۔ بدعنوانی کے خاتمے کے لیے افلاطون حکمرانوں کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ سادہ طرزِ زندگی اختیار کریں۔ افلاطون اپنے یوٹوپیا میں انصاف کی فراہمی کو یقینی بناتا ہے اور اس کے لیے ایسے قوانین بنانے کو فوقیت دیتا ہے جو عوام کے فائدے کے لیے ہوں۔ افلاطون نے اپنی کتاب "ریاست" "Republic" میں متنوع طرزِ حکومت کا ذکر کیا ہے جس میں Oligocracy Aristocracy اور Democracy نمایاں ہیں۔ افلاطون کے نزدیک حکومت کرنے کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ ایک Aristocracy یا اشرافیہ کی حکومت جس میں بہترین لوگ یعنی فلسفی حکومت کریں ۔ دوسری Democracy جمہوریت یعنی لوگوں کی حکومت ہوتی ہے لیکن افلاطون کے نزدیک اس میں لوگ اپنی خواہشات کے غلام ہوتے ہیں۔ Oligocracy یعنی طبقہ امرا کی حکومت جس میں عام لوگوں کا استحصال کیا جاتا ہے۔ افلاطون کے خیال میں سماج میں فلسفیوں کی حکومت ہونی چاہیئے کیونکہ ان کے فلسفیانہ نظریات ملک میں تبدیلی لا سکتے ہیں اور وہ لوگوں کو اپنے پسندیدہ طرزِ حکومت یعنی Aristocracy کی طرف مائل کریں گے کیونکہ یہی بہترین طرزِ حکومت ہے اور اسی میں عوام کے مسائل کا حل نکل سکتا ہے۔

افلاطون کے برعکس تھامس مور کے نزدیک ملک کے حکمران ماہرِ تعلیم ہونے چاہئیں کیونکہ تعلیم کی بدولت ہی ملک کے حالات میں تبدیلی آ سکتی ہے اور اپنے حکمرانوں کا انتخاب عوام خود کریں ۔ تھامس مور جمہوریت کو اپنی مثالی ریاست کے لیے بہترین طرزِ حکومت کے طور پر منتخب کرتا ہے۔ مور کے یوٹوپیا میں کوئی معاہدہ نہیں ہوتا کیونکہ زبان پر اعتبار کیا جاتا ہے۔ مور کے نزدیک اخلاقی اعتبار سے زندگی کا مقصد خوشی حاصل کرنا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کیونکہ خدا کا مقصد تھا کہ انسان زندگی میں خوش رہے لہٰذا زندگی کا حاصل خوشی ہے۔

ڈاکٹر ڈارین شالیف [1] اپنے لیکچر میں بتاتا ہے کہ تھامس مور نے یوٹوپیا کے ذریعے ایک اخلاقی نظریہ دیا ہے جس کا لبِ لباب یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد خوشی کا حصول ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے دو طریقے بتائے ہیں؛ ایک جسمانی اور دوسرا ذہنی سرور یا خوشی۔ جسمانی خوشی ہم جسم کی مادی و جنسی

1 Dr Darren Shalloff's Lecture on the Moor's Utopia."The search for meaningful Past": Jan 2004

ضروریات پوری کر کے حاصل کرتے ہیں جب کہ اولین خوشی یا ذہنی خوشی کا حصول دوسروں کے کام آنا اور مدد کرنا ہے اور یہی اخلاقی یوٹوپیا کی معراج ہے۔

ڈسٹوپیا:

یہ اصطلاح یوٹوپیا کے متضاد ہے۔ اس لفظ سے مراد منفی عوامل پر مبنی ریاستی نظام ہے جو یوٹوپیا کے وجود کے امکانات سے انکار کرتا ہے۔ ڈسٹوپیا کا مطلب ہے "بری جگہ "تصوراتی ریاست یا سماج جس میں لوگ بد حالی اور ظلم کا شکار ہوں، عام طور پر یہاں مطلق العنان حکومت ہوتی ہے اور اس کا انحصار مابعد الطبیعات اشرافیہ پر ہوتا ہے جو شہریوں کی زندگیوں کو کنٹرول کرتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج کی دنیا میں یا اکیسویں صدی میں ہماری حکومتیں ہماری زندگیاں ایک ڈسٹوپیا بن کر رہ گئی ہیں اور اس کی وجہ مشکلات سے بھرپور زندگی ہے۔

ڈسٹوپیا سے مراد ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں نا انصافی اور ظلم ہو اور افرا تفری کی فضا قائم ہو۔ ڈسٹوپیا میں حکومتیں ناکام ہو چکی ہوتی ہیں اور عوام کو اپنی بقا کی جنگ خود لڑنا پڑتی ہے۔ یا دوسری صورت میں کچھ طاقتور حلقے جن کو طبقہ اشرافیہ کہا جاتا ہے ملک کے وسائل پر قابض ہو جاتے ہیں۔

ادب اور یوٹوپیا:

یوٹوپیا کی اصطلاح قدیم یونان سے آئی ہے اور اس کا مطلب ایسی جگہ ہے جو وجود نہیں رکھتی ہے۔ یوٹاپوس کو آج ادب کی ایک صنف کہا جاتا ہے جو سائنس فکشن کے قریب تر ہے۔ ایسی کتابوں میں مصنف اپنی رائے میں معاشرے اور معاشرتی نظام کو مثالی کو بیان کرتے ہیں۔ صدیوں سے دنیا اس سے واقف تھی لیکن یہ لفظ تھامس مور کی بدولت دنیائے ادب میں روشناس ہوا لیکن اس اصطلاح کو استعمال کرنے والے تھامس مور پہلے ادیب نہیں تھے۔ سب سے پہلے (Plato) نے اپنی کتاب ریاست (Rebublic) میں یہ لفظ استعمال کیا جس میں وہ اپنی رائے میں طاقت کے پروٹوٹائپ کے لیے سپارٹا کے سیاسی ڈھانچے کا استعمال کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے ریاست کی منفی خصوصیات کو ختم کر دیا تھا جس کی وجہ سے ریاست مکمل یوٹوپیا کی تصویر تھی۔ تھامس مور نے ۱۵۱۶ء میں لاطینی زبان میں ایک کتاب لکھی۔ اسے 'گولڈن بک' کہا جاتا تھا کیوں کہ یہ کتاب بہترین ریاستی نظام اور یوٹوپیا کے نئے جزیرے کے بارے میں مضحکہ خیز تصورات کا منبع تھی۔ یہ ایک

Sociopolitical Satire سیاسی و سماجی طنز ہے۔ اس نے اپنے کام کو دو جلدوں میں تقسیم کیا جس میں وہ اپنے دور کے عوامی نظام کی مذمت کرتا ہے۔

یوٹوپیا سے مراد جنتِ ارضی ہے۔ اس سے مصنف کی مراد ایک مکمل معاشرے کی ہے جس میں ہر شخص خوش ہوتا ہے اور ہر کام رائج اصولوں کے مطابق سرانجام دیا جاتا ہے۔ اگر ادب میں یوٹوپیائی عناصر کا جائزہ لیا جائے تو انگریزی ادب میں رجحان نسبتاً زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ انگریزی ادب اور یونانی ادب نے ہی یوٹوپیا کا تصور پیش کیا تھا۔ دوسری اصنافِ ادب کی نسبت افسانوی ادب میں بتدریج اور ناول کی صنف میں اس رجحان کو نسبتاً زیادہ دیکھا جا سکتا ہے۔ انگریزی ادب میں سائنس فکشن کے نام سے ایک علیحدہ صنف موجود ہے جس میں مصنف مستقبل میں ایک ایسی دنیا دریافت کرتا ہے جو مکمل ہے اور جس میں موجودہ تمام مسائل کا حل بھی موجود ہے۔ مصنف یوٹوپیا کی مدد سے معاشرے کو درپیش مسائل کا حل بتانے کی کوشش کرتا ہے اور اس دوران وہ تمام سیاسی، فلسفیانہ اور اخلاقی اصول وضوابط طے کرتا ہے جو اس کی نظر میں موجودہ مسائل کا حل ہو سکتے ہیں۔

تھامس مور کی "یوٹوپیا" دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں تھامس مور نے اپنے ملک کو درپیش سیاسی وسماجی مسائل کی نشاندہی کی جب کہ دوسرے حصے میں وہ ان تمام درپیش مسائل کا حل ایک مثالی جزیرے کی صورت میں پیش کرتا ہے جو اس کا یوٹوپیا ہے۔ پہلے حصے میں اس نے ملک کی صورت حال کو ڈسٹوپیا کے طور پر پیش کیا جب کہ اس کا حل دوسرے حصے میں بطور یوٹوپیا پیش کیا گیا۔

مصنف شاہی استبداد، پادریوں کی دھوکا دہی اور سزائے موت کی مخالفت کرتا ہے۔ دوسری بات یہ مصنف کا انکشاف ایک حیرت انگیز پلاٹ کی اسکرین کے ذریعے پوشیدہ ہے۔ دونوں حصے بالکل مختلف ہیں اور منطقی طور پر لازم وملزوم نہیں ہیں۔ ادب میں یوٹوپیا کا یہی تصور ہے جو مور نے پیش کیا تھا۔ اس صنف کے قصوں اور ناولوں نے ہمیشہ مستقبل کا اندازہ کرنے اور قاری کے شعور کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یوٹوپیا مستقبل کے لیے مختلف صورتیں دکھاتا ہے۔ معاشرے کی نقل وحرکت کو متوجہ کرتا ہے۔ اس قسم کے موضوعات پر مبنی ادب کو Escapist Literature کہا جاتا ہے اور Utopian Literature بھی۔ اس صنف کو سائنس فکشن کا نام بھی دیا گیا ہے جس میں سائنس کی دریافت اور محیر العقول اسباب کے بارے میں لکھا جاتا ہے جو آنے والے دونوں میں انسانیت کو دستیاب ہو سکیں گے۔

کسی بھی مذہب کے پیروکار اپنے مذہب، اس کی عبادات اور ان کے تحت تشکیل کردہ معاشرہ کو عظیم معاشرہ یا انسان کا یوٹوپیا سمجھتے ہیں۔ جیسے کہ اسلام کے متعلق یوٹوپیا کو اسلاموٹوپیا کہا جاتا ہے جس کے مطابق اگر تمام مسلمان قرآن پاک کے احکامات پر عمل کریں تو ایک مثالی معاشرے کی تشکیل کی جاسکتی ہے۔ مختلف علاقائی داستانوں یہاں تک کہ پریوں کی کہانیوں میں بھی کسی حد تک یوٹوپیائی عنصر پایا جاتا ہے۔

قدیم زمانے سے ہی انسان کے ذہن میں یوٹوپیائی تصورات تو موجود تھے لیکن یوٹوپیائی ادب میں ان تصورات کو ماضی اور مستقبل سے منسوب کرنے کی بجائے خوشحالی اور مثالی معاشرے سے نسبت دی گئی اور وقت کی قید سے آزاد کر دیا گیا ہے۔

یوٹوپیائی ادب کی خصوصیات

جین پفالزر[1] نے اپنی کتاب "The Utopian Novel" میں یوٹو پیائی ادب کی مندرجہ ذیل خصوصیات بیان کی ہیں۔

۱۔ کسی اور حقیقت کی موجودگی میں الگ تھلگ دنیا جس کا اپنا انتظام و انصرام ہے۔ عام طور پر یوٹوپیائی ادب میں وقت کی توسیع نہیں ہوتی۔ ایسے لگتا ہے کہ مصنف کا تخلیق کردہ معاشرہ گویا خاموشی میں جم گیا ہے۔

۲۔ مصنفین تاریخی پس منظر سے دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ اپنی دنیا بناتے ہیں۔ وہ حقیقی دنیا کی حدود پر بھروسہ نہیں کرتے جس کی وجہ سے اس کی کوئی تعمیری اساس نہیں ہوتی بلکہ یہاں سب کچھ مصنف کے تخیل پر تخلیق کیا جاتا ہے۔

۳۔ یوٹوپیا کسی بھی قسم کے اندرونی تنازعات سے مبرا نہیں ہے۔ لوگ نظام کو مانتے ہیں اور اس سے خوش ہیں لیکن یہ مکمل اتفاقِ رائے ان کو انفرادیت سے خالی، جامد، بے رنگ اور بے جان بنا دیتا ہے۔

۴۔ اس صنف کے ناولوں میں طنزیہ عنصر حقیقی دنیا سے متعلق ہے کہ مستقبل کی ترقی کے لیے یہ ایک ذریعہ یا طریقہ ہے جو حقیقت سے کہیں زیادہ ہو سکتی ہے۔ انسانی فطرت کے مطابق زندگی کے تمام شعبوں میں بہترین پر یقین رکھنا، یوٹوپیائی ادب کے لیے ضروری ہے۔

---

1 Jean Pfaelzer, "The Utopian Novel in America" University Pittsburgh Press, 1984, P.112-40

یوٹوپیائی ادب میں معاشرے کو بہتر بنانے کی تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔ ریاست کی بہترین صورت سامنے آتی ہے۔ مثلاً ماحولیاتی یوٹوپیا میں ایک ایسا معاشرہ پیش کیا جاتا ہے جو فطرت کے قوانین سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو۔

یوٹوپیا کی اقسام

جین پفالزر نے 'اپنی کتاب میں یوٹوپیا کی اقسام پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ یوٹوپیا کی بنیادی طور پر چار اہم اقسام ہیں۔

۱۔ ٹیکنو کریٹک یوٹوپیا: ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سائنسی اور تکنیکی انداز میں تیزی اور تبدیلی لاتے ہوئے معاشرتی مسائل حل ہوسکتے ہیں۔ اس کی مثال سائنس فکشن ہے۔

۲۔ سماجی یوٹوپیا: معاشرتی نظام میں تبدیلی کے ذریعے مسئلے کا حل پیش کرتا ہے۔ سیاسی، تاریخی اور ماحولیاتی یوٹوپیا اس کے دائرہ کار میں آتے ہیں۔ تھامس مور کا یوٹوپیا سماجی یوٹوپیا کی مثال ہے۔

۳۔ تانیثی یوٹوپیا: عورت کو آزاد اور اس کے مستقبل کو بہتر دیکھنا چاہتا ہے۔ City of Ladies اور Her Land تانیثی یوٹوپیا کی مثال ہیں۔

۴۔ مذہبی یوٹوپیا:

ہر مذہب کے ماننے والے اپنے مذہب کو تمام مسائل کا حل قرار دیتے ہیں۔ عیسائیوں کے نزدیک عیسائیت کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر ایک مثالی معاشرے کی تشکیل ہو سکتی ہے۔ اسلامو ٹوپیا اس کی ذیلی قسم ہے جس کے مطابق اسلام ایک مکمل نظریۂ حیات اور زندگی کے تمام مسائل کا حل ہے۔

اسلاموٹوپیا کے مطابق اسلام ایک مکمل نظریۂ حیات ہے اور موجودہ زندگی کے تمام مسائل اور ڈپریشن کا حل اس کے اندر موجود ہے۔

تخلیقی لحاظ سے دیکھا جائے تو یوٹوپیا کو مندرجہ ذیل اقسام میں تقسیم (format) کیا جا سکتا ہے۔

۱۔(Paradise)

مصنف ایک خیالی دنیا کی تخلیق کرتا ہے جس کو وہ اپنے تمام تر مسائل کا حل سمجھتا ہے۔

۲۔(Externally altered world)

1 Jean Pfaelzer, "The Utopian Novel in America" University Pittsburgh Press, 1984, P.112-40

اس میں مصنف حقیقی زندگی میں رہتے ہوئے اپنے خیالوں کی دنیا بساتا ہے اور اس میں من چاہی تبدیلی کا خواہاں نظر آتا ہے لیکن اس دنیا کو یکسر بدلتا نہیں ہے۔

۳۔ (Willed-Transformation)

مصنف اپنی موجودہ زندگی میں رہتے ہوئے اس کو کسی حد تک بدلنے کی کوشش کرتا ہے یا بدلی ہوئی زندگی کی پیش کش کرتا ہے۔

یوٹوپیائی ادب کی تاریخ

یوٹوپیائی ادب، ادب کی وہ قسم ہے جس کے تحت لکھے گئے قصوں اور ناولوں میں مستقبل کو مثالی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یوٹوپیائی ادب نے قاری کے شعور کی تشکیل میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ یوٹوپیا مستقبل کی مختلف صورتیں دکھاتا ہے۔ سائنس کی ایسی حیرت انگیز دریافتیں جو مستقبل میں حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین تبدیلیاں لانے کا موجب بن سکتی ہیں، یوٹوپیائی ادب میں دکھائی جاتی ہیں جس کو ادب کی اصطلاح میں سائنس فکشن بھی کہا جاتا ہے۔ جس میں دوسرے سیاروں پر موجود زندگی کے اثرات کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کیے جاتے ہیں۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ اس صنف کی مدد سے مصنف جدید معاشرتی زندگی پر کسی حد تک تنقید یا طنز کر رہا ہو۔ یہ معاشرے میں ہونے والی نقل و حرکت کو تیز تر کرتا ہے۔ اس کے ذریعے مستقبل کی ٹیکنالوجی اور نئے مواقع کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔

قبل ازیں ذکر ہو چکا کہ یوٹوپیا کی اصطلاح کو استعمال کرنے والا تھامس مور پہلا ادیب نہیں تھا۔ اس سے پہلے یہ لفظ افلاطون نے اپنی کتاب "ریاست" (Republic) میں استعمال کیا جس میں وہ اپنی رائے میں طاقت کے نمونے کے لیے سپارٹا کے سیاسی ڈھانچے کا استعمال کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے ریاست کی منفی خصوصیات کو بھی ختم کر دیا تھا جو کہ غیر حقیقی نظر آتا ہے کیونکہ ہر ریاست میں مثبت کے ساتھ منفی اقدار کا ہونا ناگزیر عمل ہے۔

افلاطون اپنے یوٹوپیا میں ایسی مثالی دنیا کی تصویر دکھاتا ہے جس میں سب ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں۔ ایسی دنیا جس کی ظاہری شکل نظریاتی طور پر مستقبل میں ممکن ہے لیکن اس بات کا بہت کم امکان ہے کہ وہاں کوئی بھی غریب اور بے روزگار نہیں ہوگا۔

جہاں تک تھامس مور کی بات ہے تو اس نے گویا افلاطون کے بعد اس صنف کو دوبارہ زندگی بخشی۔ وہ اسے ایک نئے انداز سے سامنے لے آیا۔ اس نے سیاست اور فلسفہ کے دوراہے پر اس وقت کے معاشرتی نظام

کے مسئلے کا حل تلاش کیا۔ اس کے مطابق جس مستقبل کے بارے میں اس نے لکھا ہے، وہ معاشرے کی بنیادی تنظیم نو کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مور کے خیال میں منصفانہ قوانین، مساوات اور بھائی چارے کے تصورات کی ظاہری شکل سے ایک اچھا آغاز کرنے کی ضرورت ہے۔ یوٹوپیائی ادب کے تخلیق کاروں کا خیال تھا کہ اگر کوشش کی جائے تو مستقبل کی تبدیلی ممکن ہے۔

اس صنف کا دوسرا مشہور نمائندہ مصنف Thomas Companlla ہے جس نے "دی سٹی آف دی سن" (The city of the Sun) کے نام سے کتاب لکھی۔ ۱۸ویں صدی میں یہ ناول یورپ میں شائع ہوا جس میں ہیٹو کے ممالک میں ہیرو کے سفر کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ اُس عہد کے اس نوع کے بیش تر ناولوں میں ان طاقتوں کے ریاستی نظام کی تفصیلات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ یوٹوپیا کی صنف میں Jonathan Swift, Robinson Crusoe, Francis Bacon اور Godwin کا کام بھی شامل ہے۔

گزشتہ صدیوں کے دوران معاشرتی نظام کو یکسر تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یوٹو پیائی نظریات کو مقبول بنانے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ دنیا کو تبدیل کرنے کا سب سے مشکل قدم ۲۰ویں صدی میں سوشلسٹوں اور فاشسٹوں نے اُٹھایا تھا۔ اب یوٹوپیائی ادب کو قارئین نے بالکل مختلف انداز میں سمجھنا اور دیکھنا شروع کیا ہے۔

افلاطون کا یوٹوپیا:

افلاطون نے تقریباً ۴ قبل مسیح میں ایک سماجی اور سیاسی یوٹوپیا کا تصور اپنی کتاب Repulbic میں پیش کیا۔ اس کتاب میں افلاطون نے سماج کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ اس کے نزدیک اگر فلسفی ملک کی باگ دوڑ سنبھالیں گے تو بہتر ہو گا کیونکہ وہ عقل و دانش کے ذریعے عوام کے مسائل کو حل کریں گے۔ جدید ناقدین کے مطابق افلاطون نے ایک مثالی ریاست کی تشکیل کے لیے تجاویز تو پیش کیں لیکن اس نے عملی اقدامات اٹھانے سے گریز کیا۔ افلاطون نے اپنی مثالی سلطنت میں شاعروں کا داخلہ ممنوع قرار دیا کیونکہ اس کی نظر میں وہ نوجوانوں کے جذبات و خیالات کو پراگندہ کرتے ہیں۔ افلاطون نے تین قسم کے طرزِ حکومت گنوائے جن کو طبقہ امرا کی حکومت (Oligocracy)، طبقہ اشرافیہ کی حکومت (Aristocracy) اور عوام کی حکومت یعنی جمہوریت (Democracy) کہا گیا ہے۔ افلاطون کے نزدیک طبقہ اشرافیہ جن کو وہ فلسفی کہتا ہے، کی حکومت دراصل بہترین طرزِ حکومت ہے۔

تھامس مور کا یوٹوپیا

مکمل اور آئیڈیل ترین معاشرے کا قیام انسان کے دیرینہ ترین خوابوں میں سے ایک ہے۔ افلاطون کی ڈھائی ہزار سال قبل لکھی جانے والی کتاب Republic اس سلسلے کی اولین کڑی تھی۔ امریکا کی صورت میں نئی دنیا کی دریافت، نو آبادیاتی نظام، اسلامی خلافت، پاکستان اور اسرائیل سمیت نظریاتی ریاستوں کا قیام اور موجودہ پاکستان میں ریاستِ مدینہ جیسے نظام کی تمنادراصل انسان کی اسی ازلی خواہش کا عکس ہے جس میں وہ معاشرت، تمدن اور تہذیب کے اعتبار سے ایک ایسے گوشہ عافیت کا خواہش مند ہے جہاں اسے مکمل سکون اور خوشی میسر ہو۔

سولہویں صدی عیسوی میں تھامس مور کا تحریر کردہ ناول "یوٹوپیا" بنیادی طور پر ایک سیاسی و معاشرتی طنز (Sociopolitical Satire) ہے۔ کیوں کہ اس میں انسان کی اس ازلی خواہش (جنتِ ارضی) کو طنزیہ انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس ناول نے امریکی نظام سمیت کتنی اقوام کو بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر کیا ہے۔ اس ایک آئیڈیل سٹیٹ یا مثالی ریاست کے تصور نے انسانی زندگی اور اندازِ فکر پر مثبت اثرات مرتب کیے اور لفظ یوٹوپیا بذاتِ خود ہمارے مجموعی حافظے کا حصہ بن گیا۔

یہ ناول مختصر اور دلچسپ ہے۔ تھامس مور کا یوٹوپیا ایک تصوراتی اور کامل ترین ریاست کے خدوخال کو مزاح کے رنگ میں پیش کرتا ہے۔ اس میں انسانی تہذیب اور ارتقا کے وہ دلچسپ پہلو ہیں جہاں انسان اپنے لیے ایک آئیڈیل نظام کی تلاش میں صدیوں سے سرگرداں نظر آتا ہے۔ ناول میں تھامس مور نے تصوراتی ریاست کے جو خدوخال بیان کیے ہیں، ان کا خلاصہ ذیل میں پیش ہے۔

اس ناول میں اہلِ یوٹوپیا جنگ سے نفرت کرتے ہوئے روزمرہ زندگی میں جنگ کی مکمل تیاری بھی کرتے ہیں اور وقت آنے پر نہ صرف اپنا دفاع کرتے ہیں بلکہ اپنے دوستوں کی بھی مدد کرتے ہیں۔ ناول میں مور نے میکاولی کا نقطۂ نظر بیان کیا ہے[1]۔ اگر یہ طریقہ سودمند ثابت نہ ہو تو وہ دشمن ملک کے بادشاہ کے خلاف اسی کے اقربا میں سے کسی کو بادشاہ کے مدِمقابل کھڑا کرتے ہیں اور اگر یہ تیر بھی ہدف پر نہ بیٹھے تو اہلِ یوٹوپیا دشمن کے ہمسایہ ممالک سے رابطے استوار کر کے ان کو دشمن کے خلاف استعمال کرتے ہیں لیکن اس دوران وہ اس بات کا ضرور خیال رکھتے ہیں کہ ان کے لوگوں کا جانی نقصان کم سے کم ہو ار دوسری اقوام کو وہ دولت کی مدد سے اس کام پر رضامند کر لیتے ہیں۔ گو کہ تھامس مور نے یہ ناول اٹھارہویں صدی میں تحریر کیا تھا لیکن

[1] Stanford encyclopedia of Philosophy “for a ruler the ends justify the means”

آج کے دور میں جنگوں کی صورتِ حال کچھ یوں ہی ہے جس کو آج کی مہذب دنیاHybrid-warکا نام دیتی ہے۔ میکاولی کے نزدیک ایک حکمران اپنی حکومت برقرار رکھنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اس کے لیے اخلاقیات کے اصولوں کی پیروی کرنا ضروری نہیں ہے جس میں ذرائع ابلاغ کا دشمن کے خلاف استعمال اور دشمن کی اہم تنصیبات پر حملہ شامل ہے۔

مورنے آبادی کے لحاظ سے مستقبل کا جو مثالی نقشہ کھینچا ہے، اس میں شہر خاندانوں کی بنیاد پر آباد کیے جائیں گے اور آبادی کو قابو کرنے کے لیے خاص حد تجویز کی گئی ہے۔ ان کے شہر، پہاڑ یا کسی پُر فضا مقام کے نزدیک آباد ہوتے ہیں جن کے پاس کوئی دریا بھی موجود ہوتا ہے۔ کیونکہ قدیم تہذیبیں دریاؤں کے کنارے آباد رہی ہیں جیسا کہ وادی سندھ کی تہذیب، مصر کی تہذیب، وغیرہ۔ شہر کی ہر گلی میں دونوں اطراف سے پندرہ پندرہ گھر ہیں اور گلی کے نکڑ پر گپ شپ کے لیے بیٹھک یا چوپال ہوتی ہے جس کو اہلِ محل مل جل کر استعمال کرتے ہیں۔ مور کے یوٹوپیا میں بیمار لوگوں کا خیال رکھا جاتا ہے لیکن جب کوئی وبائی مرض پھوٹ پڑے تو ان مریضوں کو شہر سے دور رکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ بنیادی پیشہ زراعت ہے لیکن ہر فرد صنعتی شعبے میں بھی مہارت رکھتا ہے۔ یہ لوگ وقت کے زیاں کے قائل نہیں ہیں بلکہ اس کو کسی اچھے مصرف جیسا کہ مطالعہ میں صرف کرتے ہیں۔ صفائی پسند ہیں۔ لباس بھی سادہ اور صاف ہوتا ہے۔ کھانے کے لیے مٹی کے برتن استعمال کرتے ہیں۔ قیمتی ہیرے جواہرات کی ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سونے تک کی مہنگی چیز، غلاموں کی ظاہری پہچان کے لیے انہیں پہنا دیتے ہیں۔ قانون اور انصاف کے معاملے میں ان کے یہاں وکیل کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ سمجھتے کہ وکیل قانون کی پیچیدگیوں کو مقدمہ جیتنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مدعی اپنا مقدمہ بہتر انداز سے لڑ سکتا ہے۔ قانون کی کتاب زیادہ مشکل اور گنجلک نہیں ہے اور اس کو عام آدمی بھی باآسانی سمجھ سکتا ہے۔ فیصلہ ساز کونسل میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ جو قرارداد پیش ہو، اس پر بحث یا سوچ بچار کے لیے ایک دن کا وقت دیا جائے۔

جہاں تک سماجی رسم ورواج کا تعلق ہے تو اس میں مصنف کا طنزیہ انداز نمایاں نظر آتا ہے اور وہ مروجہ رسم ورواج کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔ شادی سے پہلے لڑکا اور لڑکی کو مکمل برہنہ ایک دوسرے کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ اس کی توجیہہ وہ یہ دیتا ہے کہ سواری کے لیے ایک معمولی گھوڑا خریدنے کے لیے انسان ہر طریقے سے جانچ پڑتال کرتا ہے تو جس کے ساتھ زندگی گزارنا ہے، اس کو محض چہرہ یا ہاتھ دیکھ کر منتخب

نہیں کیا جا سکتا۔ یوٹوپیا میں طلاق اور دوسری شادی کی اجازت ہے۔ تھامس مور اس رویے کے لحاظ سے ایک راسخ العقیدہ عیسائی ثابت ہوتا ہے۔

تھامس مور کا "یوٹوپیا" بنیادی طور پر لاطینی زبان میں لکھا گیا۔ اس کا انگریزی ترجمہ پہلی بار ۱۵۵۱ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول دو حصوں میں منقسم ہے۔ دونوں حصے موضوعاتی لحاظ سے بالکل مختلف ہیں۔ ناول کا دوسرا حصہ یوٹوپیا کے متعلق ہے جو ۱۵۱۵ء کے اوائل میں لکھا گیا تھا۔ جس کو اس نے Nusqama کا نام دیا۔ جو یونانی متن ہے جس کا مطلب ہے، ایسی جگہ جس کا کوئی وجو نہیں ہے۔ تعارفی حصہ ۱۵۱۶ء میں اس کے بعد میں تحریر کیا گیا۔ اس میں تھامس مور معاشرے میں موجود سیاسی اور معاشرتی برائیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ مور ایک ایسا مصنف ہے جس نے یوٹوپیا کی ریاست کا مطالعہ کیا، اس سے متاثر ہوا اور اس کے بعد Lycurge میں Petarch کی سمارٹا کی زندگی کا مطالعہ کیا جو افلاطون کے لیے ایک مثالی تصوراتی ریاست ہے۔

مور کا یوٹوپیا Newcastll کے قریب ایک ایسی جگہ کا نام ہے جہاں منظر یکسر بدل جاتا ہے۔ قدرت اس جگہ پر مہربان ہے، اس لیے ہوا لطیف ہو جاتی ہے۔ زمین مزید زرخیز، مہربان اور تمام چیزیں معتدل تر ہو جاتی ہیں۔ بحری سفر جدید ترین سہولتوں سے آراستہ ہے۔ دراصل مصنف Utopia کے تمام قوانین وضوابط کو نہ صرف مثالی قرار دیتا ہے بلکہ وہ ان کو اپنے ملک میں نافذ کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ وہ موجودہ قوانین کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔ حکومت کی پالیسیوں پر طنز کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ تاجِ برطانیہ بے کار اور جاہل لوگوں کی پرورش کرتا ہے لیکن بیماروں کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ تھامس مور بہادر لوگوں کے متعلق کہتا ہے کہ وہ ملک کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔

> "As robbers prove sometimes gallant soldiers, so soldiers often prove brave, so There is near an alliance b/w those sorts of life."(43)

اس کی تجویز ہے کہ امیروں کی ان تعیشات پر پابندیاں عائد کی جائیں جو ملک میں بے روزگاری کو فروغ دے رہی ہیں، اس کے تباہ کن اثرات، اجارہ داری سے کچھ کم نہیں ہیں۔ مور ان بے روزگار چوروں کے متعلق مزید بیان کرتا ہے کہ چونکہ حکومت نے ان لوگوں کو اچھی تعلیم وتربیت اور دوسری بنیادی ضروریات مہیا نہیں کیں تو آپ کس طرح ان سے ایک اچھا شہری بننے کی توقع کر سکتے ہیں؟ یہاں وہ اسلام کی تعلیمات کے قریب تر نظر آتا ہے کہ نفرت جرم سے کرو، مجرم سے نہیں۔ نیز وہ برائی اور جرم کو معاشی حالات بہتر کرنے اور تعلیم وتربیت کے ذریعے ختم کرنے کی تجویز دیتا ہے۔

> "If you donot find a remedy to these evils، it is a vain thing to boast of your severity in punishing theft, which though it may have the appearance of justice, yet in itself is neither just nor convenient."(44)

اگر آپ ان تمام برائیوں کا قلع قمع نہیں کر سکتے تو اپنی سختی کا اظہار ان کو سزائیں دے کر کرنا بے سود ہے۔ یہ بظاہر تو انصاف کے تقاضے پورے کرتا ہے مگر در حقیقت نہ تو منصفانہ ہے اور نہ ان کے لیے بہتر ہے۔

تھامس مور جرائم کی سزا میں تخفیف کا خواہاں ہے اور یوں وہ کسی حد تک مذہب پر بھی تنقید کرتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ رومیوں کی مثال دیتا ہے جو اس کے مطابق حکومت کرنے کا فن بہ خوبی جانتے تھے۔ وہ ایران کے بادشاہ کی مثال دیتا ہے کہ ایک ایسا بادشاہ جو طاقت کے نشے سے بہت دور ہے اور ملک فتح کرنے کی ہوس میں مور تاجِ برطانیہ پر طنز کرتا ہے۔ وہ ایک فلاحی ریاست (welfare state) کا تصور پیش کرتے ہوئے کہتا ہے:

> "If I were a Priest, but I would hava made law for sending all these beggers to monasteries, the men to the Benedictires، to be made lay-brothers, and the women to be nuns."(45)

مور کہتا ہے اگر میں پادری ہوتا تو ان تمام بھکاریوں کو خانقاہوں میں بھیج دیتا، مردوں کو برکت خانے میں بھجواتا اور عورتوں کو نَن بنا دیتا۔ اپنے اس یوٹوپیا میں تھامس مور نے افلاطون کے افکار کا ذکر کیا ہے۔ افلاطون کے خیال میں قوم اُس وقت خوش حالی کی طرف قدم رکھے گی جب فلسفی بادشاہ ہوں گے یا بالفاظِ دگر بادشاہ فلسفیانہ نقطۂ نظر رکھتے ہوں گے اور فلسفی یہ فریضہ اپنے اقوال کے ذریعے سر انجام دیتے ہیں۔ وہ عقل و دانش کے ذریعے عوام کے مسائل حل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ مور بھی افلاطون کے نقطۂ نظر کا حامی نظر آتا ہے جو ملک کی باگ ڈور فلسفیوں کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔

مور برطانیہ کے اُس عہد کے مسئلے کا سیاسی حل پیش کرتا ہے جس کے مطابق ایک امن معاہدہ طے ہونا چاہیے۔ یوٹوپیا کے باشندوں کو تھامس مور ایکو سینس کہتا ہے۔ یہ لوگ صدیوں سے حالتِ جنگ میں تھے تاکہ ملک کی حدود میں اضافہ کر سکیں لیکن فتوحات کے باوجود پُر سکون نہ ہو سکے۔ کیوں کہ مقبوضہ علاقے کے لوگ ہمیشہ ان کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیے رکھتے تھے جن کو کچلنے کے لیے ان کو ایک عظیم فوج بنانا پڑی جس کا دارومدار ان کے ٹیکس پر تھا۔ ان کا اپنا سرمایہ ملک سے باہر خرچ ہو رہا تھا۔ ان کا خون بادشاہ کی بھینٹ چڑھ رہا تھا جس نے حالتِ اَمن میں بھی ان کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچایا تھا۔ اس صورتِ حال سے تنگ آ کر عوام نے

بادشاہ سے کہا کہ دونوں مملکتوں میں سے ایک کا انتخاب کر لے، کیوں کہ دونوں وہ رکھ نہیں سکتا۔ تھامس مور سلطنت برطانیہ کے اس طرزِ انتظام و انصرام پر طنز کرتا ہے:

> For they were too great a people to be governed by a divided-king, since no man would willingly have a groom that should be in common b/w him and another." (46)

سلطنتِ برطانیہ کی آدھی حکومت دنیا پر تھی، مصنف کے خیال میں برطانیہ کے عوام کو اس کا نقصان ہے۔ اس لیے یہ عظیم لوگ ایک منقسم بادشاہ کے زیرِ تسلط نہیں رہنا چاہتے تھے کیونکہ کوئی بیوی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کے خاوند کو اس کے ساتھ شیئر کیا جائے۔ یہاں طنز کا عنصر نظر آتا ہے۔

> "King should improve his ancient kingdom all he could and make flourish as much as possible." (47)

مور نے سلطنتِ برطانیہ پر طنز کیا ہے کہ اس کی طاقت، دولت اور زمین کی حوس کی وجہ سے وہ تمام دنیا پر قابض ہونے کا خواہش مند ہے اور بیش تر دنیا ان کے تسلط میں ہے، کہا جاتا تھا کہ سلطنتِ برطانیہ میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا ہے۔

> "The Sun never sets in the British Empire."

برطانیہ کے بارے میں یہ مشہور مقولہ سر جیمز جوائس نے اپنے ناول Ulysses میں لکھا تھا۔

مور نے حکمرانوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ انھیں اپنی قدیم سلطنت پر توجہ دینی چاہیئے۔ بادشاہ کی عزت اور اس کی قدر و منزلت کا دارومدار لوگوں کے مال و متاع اور ان کی خوش حالی پر ہے نہ کہ سلطنت کی وسعت پر۔ اگر عوام خوش حال اور محفوظ ہوں گے تو بادشاہ بھی محفوظ ہو گا۔

> "A prince ought to take more care of his people, their happiness than of himself as a shepherd is to take more care of his flock than himself." (48)

ایک بادشاہ کو اپنے لوگوں کا خود سے زیادہ خیال رکھنا چاہیے جس طرح ایک چرواہا اپنی بھیڑوں کا اپنی ذات سے زیادہ خیال رکھتا ہے۔ کیوں کہ وہ اس کی بقا کی ضامن ہوتی ہیں۔ اسے اپنی مملکت پر اپنا گزارا کرنا چاہیے۔ دوسروں کو بلاوجہ نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔ حکمران کو رعایا کے ساتھ دوستانہ رویہ رکھنا چاہیے۔ یہاں مصنف تاجِ برطانیہ کے تخت نشینوں کو بالواسطہ طنز کا نشانہ بنا رہا ہے جو لوگوں کے دکھ درد سے بیگانہ اپنی عیاشیوں میں مست ہیں۔ البتہ مور کے نزدیک اگر فلسفی بادشاہ منطق اور عقل کا سہارا لے کر مملکت کے مسائل کو حل کرتا ہے تو ایسے فلسفی ملک و ملت کے لیے فائدہ مند ہیں۔

آگے چل کر مصنف اپنے مثالی ملک (یوٹوپیا) کی مثال دیتا ہے اور تجاویز بھی پیش کرتا ہے کہ چند قوانین کی مدد سے وہ ایک ایسا مثالی ملک تشکیل دیں گے جہاں نیکیوں کی قدر و قیمت ہے، سب لوگ خوش حال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہاں وہ افلاطون کی "ریاست" کی مثال دیتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ ایسے قوانین کے خلاف ہے جو تمام حقوق ریاست کو دے دیں۔ مور کے مطابق افلاطون جیسا عقل مند شخص اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکا کہ تمام لوگوں کو ایک معیار پر رکھ کر قوم کو خوش حالی نہیں دی جا سکتی۔ مور کہتا ہے میں افلاطون کی حمایت کرتا ہوں اور اس بات پر بھی حیران نہیں ہوں کہ وہ ایسے قوانین بنانے پر رضا مند نہیں ہوا جو ایک معاشرے کو دیے جا سکتے تھے اور افلاطون جیسا شخص اس بات کی پیش گوئی نہ کر پایا کہ اس کے نتیجے میں دو قسم کے لوگ ہوں گے۔ ایک وہ جو اس بات کے حق دار ہیں کہ ان کی قسمت بدل سکتی ہے۔ پہلے والے بے کار اور مکار اور دوسرے مستقل محنت کے ذریعے لوگوں کی خدمت کرتے ہیں۔

> "For as long as that is maintained that the greatest and the for-best part of man-kind, will be still oppressed with load of cares and anxieties" (49)

اگر معاشرہ تمام لوگوں کو یکساں سہولتیں فراہم کرتا ہے تو حق دار لوگوں کی حق تلفی ہو گی اور ایسے لوگوں کو پھر بھی پریشانی اور فکر کی چکی میں پسنا پڑتا ہے۔

جس طرح کولمبس نے امریکا دریافت کیا، اسی طرح مور نے "یوٹیاپیا" نامی مثالی (مگر خیالی) جزیرہ دریافت کیا۔ کولمبس نے غیر مہذب باشندوں کو اس جزیرے میں آباد کیا اور ان کو ایسی حکومت اور قوانین مہیا کیے کہ وہ آج دنیا کی مہذب قوموں میں شمار ہوتے ہیں۔ مور کے یوٹوپیا کے اس جزیرے میں ۵۴ کے قریب بڑے شہر ہیں جن پر یکساں قوانین نافذ ہیں۔ ہر شہر سال میں ایک دفعہ اپنے قابل ترین نمائندے کو Ammaurot بھیجتا ہے جو یوٹوپیا کا دارالخلافہ ہے۔ ہر شہر کی عدالتیں شہر سے تقریباً ۲۰ میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ کوئی بھی قصبہ اپنی حدود میں غیر قانونی توسیع کا خواہاں نہیں ہے۔ تمام شہر میں مسافر خانے قائم کیے گئے ہیں جن میں تمام ضروریاتِ زندگی میسر ہیں۔ شہروں سے لوگ اپنی باری پر یہاں قیام کرنے کے لیے آتے ہیں۔ ہر خاندان کے اوپر ایک نگران جوڑا مقرر ہے اور تیس خاندانوں پر ایک مجسٹریٹ ہے۔ ہر سال لوگ شہر سے گاؤں آتے ہیں تا کہ ان کو دیہاتی لوگوں کے مصائب کا اندازہ ہو سکے۔ شہری لوگ زمین کاشت کرتے ہیں، مویشی پالتے ہیں، مرغی بانی کرتے ہیں اور گھوڑے رکھتے ہیں۔ وہ تمام اجناس ضرورت سے زیادہ پیدا کرتے ہیں جن کو وہ اپنے ہمسائیوں کو بہ وقتِ ضرورت دان کرتے ہیں اور جب ان کو کسی چیز کی ضرورت

پڑتی ہے تو ان سے لے لیتے ہیں۔ گاؤں کے مجسٹریٹ کی یہ ذمہ داری ہے کہ مہینے میں ایک دفعہ کسی تہوار پر ان کی ملاقات ضرور ہو۔ لوگ ایک دوسرے کی کام اور ضرورت میں مدد کرتے ہیں۔

مصنف یوٹوپیا کے دارالحکومت Amoront کا ذکر کرتا ہے جس کو وہ امورنٹ کہتا ہے جو کسی جنتِ ارضی سے کم نہیں ہے۔ خوب صورت سرسبز بادلوں سے گھرا، ٹھنڈے چشموں سے سیراب یہ حسین شہر ہے۔ شہر کے پہلو میں دریائے Anider گزرتا ہے۔ دریا کے اوپر پتھروں سے بنا ایک پُل ہے۔ گھر نہایت خوب صورت انداز میں بنے ہوئے ہیں اور ہر گھر کے ساتھ منسلک ایک باغیچہ ہے۔

شہر کے انتظام او انصرام کے بارے میں مزید بتاتے ہوئے مصنف کہتا ہے کہ تیس خاندان مل کر اپنا نمائندہ منتخب کرتے ہیں۔ مصنف جمہوری طرزِ حکومت کا خواہاں ہے کیونکہ جمہوریت میں بادشاہ یا مجسٹریٹ حکومت اور عوام کو غلام نہیں بناسکتے۔ اپنے یوٹوپیا میں مور زراعت کو نہایت اہم قرار دیتا ہے اور اس کا یہ خیال ہے کہ جس طرح بچوں کو مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا جاتا ہے، بالکل اسی طرح ان کو کھیتوں میں کاشت کاری کی تعلیم بھی دی جانی چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ کوئی قیمتی ہنر بھی آنا چاہیے جیسے لوہار، مستری اور درزی کا کام۔ خاندانی وراثت کی طرح ان کے کام اور آرام منقسم ہیں۔ حکومت کسی کو بھی زیادہ کام کرنے پر مجبور نہیں کرسکتی۔ ان کے کھیل بھی وقت گزاری کے ساتھ اخلاقی تربیت دیتے ہیں۔ یوٹوپیا میں تمام معاملات اس قدر منظم ہیں اور ہر چیز اس قدر مستقل اور لافانی ہے کہ اس میں کسی بہتری کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور نہ کسی چیز کو زوال ہے۔ مور کا یوٹوپیا مکمل اور مثالی ہے۔ مور نے باریک بینی سے اپنی اخلاقی ترقی اور مثالی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے جس کے ساتھ مادی ترقی کی بھی معراج نظر آتی ہے۔ ان لوگوں کی اخلاقی بنیادیں بھی بہت مضبوط ہیں۔ وہ صبر و قناعت سے رہتے ہیں۔ ہوس اور لالچ جیسے منفی جذبات کا ان کی زندگی میں کوئی دخل نہیں ہے۔ خاندانی نظام کے بارے میں مور بتاتا ہے کہ ان کے خاندان میں ۱۰ سے کم اور ۱۶ سے زیادہ افراد نہیں ہوتے ہیں اور اس تناسب کو برقرار رکھنے کے لیے کم افراد والے خاندان بچے گود لے لیتے ہیں۔ اسی اصول کی بدولت شہروں اور قصبوں کی آبادی کو قابو میں کیا جاتا ہے۔ آدابِ معاشرت اور طرزِ رہن سہن کے بارے میں تھامس مور کا کہنا ہے کہ خاندان کا بزرگ ترین مرد سربراہ ہوتا ہے۔ بیویاں خاوند کی اطاعت کرتی ہیں، بچے والدین کا اور چھوٹے بڑوں کا احترام کرتے ہیں۔ شہر چار حصوں میں منقسم ہے جس کے درمیان میں مارکیٹ ہے۔ یوٹوپیا کے لوگ اس قدر رحم دل ہیں کہ مویشیوں تک کو بھی اپنی بھوک مٹانے کے لیے ذبح

نہیں کرتے۔ عوام کو صحت کی بہترین سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔ نوزائیدہ کو اس کی والدہ پالتی ہے لیکن اگر بد قسمتی سے وہ میسر نہ ہو تو حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اس کے لیے کفالت کا بندوبست کرے۔

اگر کوئی شخص دوسرے شہر جانا چاہتا ہے تو اس کو گورنر کی اجازت کی ضرورت ہو گی۔ جس کے بعد سفر اور اس کے تمام تر لوازمات کی ذمہ داری حکومت کی ہو گی۔ ہر جگہ ان کو گھر کا ماحول میسر آئے گا لیکن اگر کوئی بغیر اجازت سفر کرے گا تو اس کو مفرور سمجھا جائے گا اور اسی کی طرح برتاؤ کیا جائے گا۔

یوٹوپیا کے باشندے زائد از ضرورت اشیا ضرورت مندوں کو دیتے ہیں۔

"They order a seventh part of all these goods to be freely given to the poor of the country."(50)

اپنے وسائل کا ساتواں حصہ یہ لوگ غریبوں میں تقسیم کر دیتے ہیں اور باقی ماندہ بھی مناسب رقم پر بیچ دیتے ہیں۔ امیر لوگ حکومت کی مالی اعانت بھی کرتے ہیں۔ یہ طریقہ کار کسی حد تک اسلامی نظامِ زکوٰۃ و خیرات کے قریب تر ہے۔ مور فطرت کے قوانین کی پیروی کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ سونا اور چاندی کو پس انداز کر دیتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ تعیش پسند ہیں بلکہ ضرورتوں کو تعیش پر ترجیح دیتے ہیں اور اس کو برے وقت کے لیے بچا کر رکھتے ہیں۔

"For men can no more live without iron than without fire or water, but Nature has marked out no use for the other metals so essentialy as not to be dispensed with"(51)

مور کے نزدیک انسان لوہے کے بغیر تو رہ سکتا لیکن آگ اور پانی کے بغیر نہیں رہ سکتا کیونکہ نظامِ قدرت میں ان تمام دھاتوں کا اس کے علاوہ کوئی استعمال نہیں ہے کہ ان کو ضائع کر دیا جائے۔ یہ انسان کی بے وقوفی ہے کہ اس نے ان تمام چیزوں کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا جب کہ اس کے متضاد یہ ان کا خیال ہے کہ فطرت نے ایک مہربان خدا کی طرح انسان کو وہ تمام اشیا وافر مقدار میں عطا کی ہیں جن کی ضرورت ہے جیسے پانی اور زمین جب کہ بے فائدہ اور فالتو اشیا (سونا اور چاندی) کو اس نے منظرِ عام سے چھپا دیا ہے۔

یوٹوپیا میں تعلیم قومی زبان میں دی جاتی ہے کیوں کہ انسان اپنے جذبات کا بہترین اظہار اپنی مادری زبان میں کر سکتا ہے۔ مور موجودہ تعلیمی نظام میں تبدیلی کا خواہاں ہے۔ وہ ایک ایسے نظام کا خواہش مند ہے جو انسان کو خوش رکھ سکے۔ اس لیے وہ مذہب کو اہمیت دیتا ہے۔ کیوں کہ مذہب پر عمل کر کے انسان کو ذہنی اور روحانی سکون حاصل ہوتا ہے۔

> "For they never dispute concerning happiness without fetching some arguements from the province of religion as well as from natural reason.(52)

تھامس مور کے مطابق جس خوشی اور اطمینان کی بنیاد مذہب اور عقل پر مبنی ہے وہ پائیدار ہوتی ہے۔ مذہبی اصول یہ ہے کہ انسان کی روح لافانی ہے اور خدا چاہتا ہے کہ اس کی روح کو آسودگی حاصل ہو جس کے لیے اس نے نیکی کا اجر اور گناہ کا عذاب رکھا ہے جو زندگی کے بعد ملے گا۔ مذہب کے ساتھ ساتھ وہ فطرت کو ایک مہربان روپ میں دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک نیکی کا راستہ دراصل فطرت کے مطابق زندگی گزارنا ہے۔

> They define virtue to be living according to nature.

اس لیے کہ وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ فطرت انسان کو خوشی اور اطمینان حاصل کرنے کی طرف راغب کرتی ہے اور اس کے لیے فطرت ہمیں معاشرتی زندگی گزارنے کی ترغیب دیتی ہے۔ اس کے ساتھ وہ عقل کی حکمرانی پر زور دیتا ہے جو انسان کی ذاتی خوشی کے حصول پر زور دیتی ہے لیکن یہ تلقین بھی کرتا ہے کہ انسان اجتماعی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دے۔ فطرت ہمیں صرف ان خوشیوں کے حصول کی اجازت دیتی ہے جو عقل اور حواس کے ذریعے ہم تک پہنچتی ہیں کیونکہ اس دوران کسی کو جسمانی و ذہنی نقصان نہیں پہنچتا ہے۔ تھامس مور صلح رحمی، محبت اور اخوت پر مبنی معاشرے کا خواب دیکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص آپ کے سامنے اپنے گھٹنے ٹیک رہا ہے اور پھر بھی آپ اس سے بدلہ لیتے ہیں تو کیا واقعی اس کی یہ قابلِ ترس صورتِ حال آپ کو حقیقی اور دائمی خوشی عطا نہیں کرتی کہ آپ پھر بھی بدلہ لینے پر بضد ہیں؟!

> "And will the heads being bare care the madness of yours?"(53)

تھامس مور اعلیٰ اخلاق کی تربیت پر زور دیتا ہے۔ سب سے پائیدار اور اعلیٰ درجے کی خوشی وہ ذہنی آسودگی ہے جس کی بنیاد نیکی اور بھلائی سے ہے۔

اس کے یوٹوپیا میں غلاموں سے متعلق نہایت رحمدلانہ رویہ رکھا جاتا ہے۔ عام رواج سے یکسر متضاد وہ جنگی قیدیوں کو غلام نہیں بناتے۔ ان کے ہاں غلامانہ زندگی صرف وہ لوگ گزارتے ہیں جن سے کوئی جرم سرزد ہوا ہو جس کی پاداش میں ان سے بیگار لی جاتی ہے۔ بیماروں کا خیال رکھا جاتا ہے اور لا علاج مریضوں کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ ان کی زندگی بچانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے لیکن اگر زندگی کی کوئی امید باقی نہ رہے تو حکومت کی طرف سے ان کو اجازت دی جاتی ہے کہ وہ پُر سکون انداز سے اپنا خاتمہ کر لیں

(Uthanasia)[1] کیوں کہ اب ان کی زندگی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ لیکن ایسی صورتِ حال میں ان کو باعزت طریقے سے نہیں دفنایا جاتا بلکہ ایک گڑھا کھود کر اس میں پھینک دیا جاتا ہے کیونکہ انسانی زندگی کی قدر و قیمت صرف اس وقت تک ہوتی ہے جب وہ ملک و قوم کے کام آسکے اور اگر ایسا نہ ہو تو اسے پر سکون انداز میں اپنی زندگی ختم کر دینی چاہیے۔

عورتوں کی شادی ۱۸ سال سے قبل اور مردوں کی ۲۲ سال سے قبل نہیں ہو سکتی۔ طلاق کے معاملے میں بھی مور کا رویہ کیتھولک فرقے کے مطابق ہے۔ وہ طلاق کے حق میں نہیں ہے اور ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ طلاق کو روکا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ معاشرے میں دوسری شادی کے رجحان کی بھی حوصلہ شکنی کرتا ہے کیوں کہ اس طرح خواتین کے حقوق سلب ہوتے ہیں۔ دوسری شادی کی مخالفت کی پاداش میں مور کو سرعام پھانسی دی گئی تھی کیونکہ اس نے ملکہ برطانیہ کی دوسری شادی کی مخالفت کی تھی۔ مور حاکمِ وقت یا نگران کو بہت اہمیت دیتا ہے کہ اگر نگران اچھا ہو گا، رعایا کا خیال رکھے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

> "For since the good or ill condition of a nation depends so much upon their magistrate."(54)

کسی قوم کی اچھی یا بری صورتِ حال کا ذمہ دار ان کا نگران یا مجسٹریٹ ہوتا ہے۔ جہاں تک جنگ کا سوال ہے تو مور کے خیال میں جنگیں قوموں کے مسائل کا کبھی بھی حل نہیں رہی ہیں۔ جنگیں مہذب قوموں کا نہیں بلکہ وحشی جانوروں کا طریقہ ہے۔ مسائل سے نکلنے اور حقوق حاصل کرنے پر وہ طنز کر رہا ہے۔ اس رویے اور طریقے کو جس کے مطابق جنگ ہی مسائل کا حل ہے۔ اس کے مطابق یوٹوپیا میں جنگ آخری حل ہے۔

جنگ کے متعلق "یوٹوپیا" والوں کے خیالات نہایت عجیب ہیں۔ بقول مور:

> "They use best sort of men for their own use at home, so they make use of worst sort of men for the consumption of war"(55)

مور کے اِن الفاظ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ جنگ کو قوموں کی زندگی کی انتہائی غیر اہم اور فضول حصہ گردانتا ہے۔ اس کے لیے غیر اہم اور فضول لوگوں کا انتخاب کیا گیا جن کو جنگ کی بھٹی میں جھونک

[1] According to Oxford English Dictionary "The painless killing of a patient suffering from incurable disease.

دیا جاتا ہے۔ مور کے خیالات میں میکاولی کی جھلک نظر آتی ہے جس کی مفاد پرستی میں انسانی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں ہے صرف مادی فائدہ زیرِ نظر ہے۔

یوٹوپیا کے جزیرے میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں جن میں سے کچھ سورج، چاند یا دوسرے سیاروں کی پرستش کرتے ہیں اور کچھ بزرگوں، اولیا یا خداؤں کی پرستش کرتے ہیں لیکن ان میں بہترین لوگ مور کے نزدیک ایک خدا کی عبادت کرتے ہیں، وہ جو اس ساری کائنات کا مالک و خالق ہے اور ہر چیز کا اختیار اس کے ہاتھ میں ہے جس کو وہ لوگ اپنی زبان میں (متھرا س) کا نام دیتے ہیں۔ ان خیالات سے واضح ہوتا ہے کہ تھامس مور توحید پرست ہے، وہ خدا پرستوں کو تمام مذاہب پر ترجیح دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تمام مذاہب کی آزادی پر یقین رکھتا ہے۔ ہر مذہب کے پیروکاروں کو اس بات کی مکمل آزادی ہے کہ وہ بلا روک ٹوک اپنے مذہب کی تعلیمات پر عمل کر سکتے ہیں اور کسی کو ان کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ کسی مذہب کے پیروکار کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو زبردستی مذہب بدلنے کی ترغیب دے۔ ہاں دلیل کے زور پر اس کو قائل کرنے کی اپنی سی کوشش کر سکتا ہے۔ مور انسانی آزادی کا قائل ہے۔ اس کے ساتھ اس کے تمام خیالات تہذیبِ اسلام کی تعلیمات سے ملتے نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ اسلام میں بھی دین کی تبلیغ کو مومن کا فرض قرار دیا ہے۔ آگے چل کر وہ روزِ جزا کے فلسفے کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ،

> "He belived that there was a state of reward and punishment after this life.(56)"

وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اس زندگی کے بعد بھی ایک زندگی آنے والی ہے جس میں اچھائی کا صلہ اور برائی کا بدلہ دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ خدا کو ہر کام کے آغاز میں یاد کرنا دراصل اس کی عبادت کا ایک اہم اور پسندیدہ ترین حصہ ہے۔ ان تمام خیالات سے مور کی شخصیت تصوف پر یقین رکھنے والے ایک مذہب پسند شخص کے بطور سامنے آتی ہے اور اسی مذہب پسندی کے باعث اس نے خود کے لیے موت کی راہ کا انتخاب کیا تھا۔ مذہبی شدت پسندی کے ساتھ ساتھ وہ ایسے لوگوں کی نسل پروان چڑھانے کا خواہش مند ہے جو اخلاقیات میں بھی اعلیٰ درجے کے ہیں۔ رفاعِ عامہ اور اخلاقیات کے کام کرتے ہیں۔ شادی شدہ افراد کو غیر شادی شدہ افراد پر ترجیح دیتے ہیں کیوں کہ وہ ایک مشکل زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔

> "Some of these visit the sick, others mend highways. Clean ditches, repair bridges, or dig ture."(57)

ایک مثالی ریاست اور اس کے قوانین کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ وہ موجودہ طرزِ زندگی پر طنز کے تیر برسانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ اتنی عزت مجسٹریٹ کو نہیں دی جاتی ہے جتنی کہ پادری کو۔ اگر ان سے کوئی جرم سرزد ہو بھی جاتا ہے تو کوئی ان سے سوال کرنے کا مجاز نہیں ہوتا۔ کیوں کہ یہ ان کے ضمیر اور خدا کا معاملہ ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ ہے کہ وہ گناہوں سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ مغرب کے معاشرے میں ان کا استحصال اور دیگر معاشرتی جرائم کے پس پردہ بھی شاید یہی محرک تھا۔

مور نے ایک مثالی ریاست اور مثالی زندگی کا تصور پیش کیا ہے جہاں مکمل شخصی آزادی ہے۔ وسائل کی تقسیم منصفانہ ہے۔ لوگ خوشگوار زندگی بسر کر رہے ہیں۔ نہ بیوی بچوں کی شکایتیں ہیں اور نہ بیٹی کے جہیز کی فکر ہے۔ کیوں کہ نہ صرف اس کی ذات بلکہ اس کی آنے والی اور دوسری تمام ضرورتوں کی ذمہ داری حکومتِ وقت پر عائد ہوتی ہے۔ انصاف کا بول بالا ہے۔

یوں مور کے بقول، یوٹوپیا کے رہنے والوں نے ایک ایسا نظام تشکیل دے دیا ہے جس کی تقلید ساری دنیا کرے گی کیوں کہ لوگ اس نظامِ حکومت سے بہت خوش اور مطمئن ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے لوگوں کے دماغوں سے بلند نظری (ambition) کا خناس نکال دیا ہے۔ قوانین کی حکمرانی ہے، لوگ پرسکون ہیں۔ ایک بالغ الذہن قاری اس کی تمام باتوں سے متفق تو نہیں ہو سکتا لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ اس میں سے اکثر قوانین کی پیروی کر کے ایک بہتر ریاست کا حصول ممکن ہو سکتا ہے۔

تھامس مور نے اپنی کتاب یوٹوپیا میں ایک مثالی ریاست کے جو خدوخال بیان کیے ہیں، ان کا لبِ لباب یہ بنتا ہے:

"۱۔ ناول کا بنیادی نقطۂ نظر معاشرے اور ریاست پر طنز ہے۔ اس لیے مصنف نے یوٹوپیا کے رہنے والوں کے متعلق طنزیہ انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ یوں تو جنگ و جدل کی طرف میلان نہیں رکھتے ہیں لیکن ہر وقت خود کو جنگ کے لیے تیار بھی رکھتے ہیں۔

۲۔ آبادی کو کنٹرول کرنے کے لیے تھامس مور نے اپنے یوٹوپیا کے لیے بہت اچھی تجویز پیش کی ہے اور اس کو ایک خاص حد سے بڑھنے سے روکنے کی تجویز دی ہے۔

۳۔ قدیم تہذیبیں دریاؤں کے کنارے آباد تھیں، اس اصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تھامس مور نے اپنے یوٹوپیا کے لیے تجویز پیش کی ہے کہ شہر پُر فضا مقامات کے قریب آباد کیے جائیں اور ان کے نزدیک سے کوئی دریا گزرتا ہو۔

۴۔ مصنف نے اپنے یوٹوپیا میں وکیلوں پر پابندی عائد کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ اس کے خیال میں مدعی اپنا مقدمہ خود بہتر انداز میں لڑ سکتا ہے۔ افلاطون نے اپنی ریاست میں شاعروں اور موسیقاروں پر پابندی لگا دی تھی کیونکہ وہ معاشرے کو پراگندہ کرتے ہیں اور مور کے خیال میں وکیل مدعین کا استحصال کرتے ہیں اس لیے اس کے یوٹوپیا میں اُن کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔

۵۔ تھامس مور کا یوٹوپیاNewcastle کے قریب ایک ایسا جزیرہ ہے جہاں منظر یکسر بدل جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اس کے اس مثالی جزیرے پر قدرت خاص طور پر مہربان ہے۔ یہاں کی زمین زرخیز ہے اور فضا معتدل ہے۔ بحری سفر جدید ترین سہولتوں سے آراستہ ہے۔ مصنف یوٹوپیا کے تمام قوانین و ضوابط کو نہ صرف مثالی قرار دیتا ہے بلکہ وہ ان کو اپنے ملک میں نافذ کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔

۶۔ اپنے یوٹوپیا میں تھامس مور نے کئی مقامات پر افلاطون کی کتاب "ریاست" کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ افلاطون وہ پہلا شخص تھا جس نے ایک مثالی ریاست اور جنتِ ارضی کا تصور دیا تھا۔ مور کے مطابق افلاطون کی یہ بات بالکل درست ہے کہ تمام لوگوں کو تمام تر حقوق دیے جائیں۔ یہاں مصنف مساوات کی بجائے حق کی بات کرتا ہے۔

۷۔ مور کے مطابق اس خیالی جزیرے میں مسافر خانے قائم ہونے چاہئیں جن میں مسافروں کو تمام ضروریاتِ زندگی میسر ہوں۔ فطرت سے تعلق مضبوط کرنے کے لیے اس نے یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ شہر میں رہنے والے لوگوں کو حکومت یہ موقع فراہم کرے کہ وہ سال میں ایک بار دیہاتی زندگی گزارنے کا تجربہ کریں۔ اس تجویز کا مقصد زراعت کے شعبے کو فروغ دینا ہے۔

مصنف کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ ایسی دنیا کا وجود ناممکنات میں اسے ہے۔ اس لیے اس نے اپنے ناول کا عنوان ہی "یوٹوپیا" رکھا جس کا مطلب ایک ایسی جگہ ہے جو مثالی ہے لیکن اس کا وجود نہیں ہے۔ اسی

لیے اس نے اس ملک کو(Utopia)(Noplace)(good place)(outopos)کہا ہے یعنی ایسی جگہ جو اچھی ہونے کے ساتھ ناپید ہے۔ افلاطون نے اپنی کتابRepublicمیں یوٹوپیا کا سرسری ذکر کیا تھا۔ یوٹوپیا کا واضح اور تفصیلی تصور سب سے پہلے تھامس مور نے دیا۔ اس لیے یوٹوپیا کا ذکر تھامس مور کے نام کے بغیر ادھورا ہے۔ اس مقالے میں تھامس مور کی کتاب کا تفصیلی ذکر کرنا اس لیے ناگزیر تھا کہ دنیائے ادب میں یوٹوپیا کو متعارف کرانے کا سہرا اس کے سر ہے۔

تھامس مور کی پیش کردہ تجاویز کی عملی تصویر نہ تو اس کے دور (۱۵۱۶) میں ممکن تھی اور نہ آج کے دور میں ممکن ہے لیکن ان تجاویز کو سامنے رکھ کر ایک بہتر زندگی کی کوشش بہر حال کی جاسکتی ہے۔

H.G. Wellsکاماڈرن یوٹوپیا:

H .G wells نے "ماڈرن یوٹوپیا" کے نام سے ناول لکھا۔H.G.Wellکو سائنس فکشن کا بانی کہا جاتا ہے۔ ویل نے یہ ناول ۱۹۰۵ء میں لکھا۔ اس ناول میں مصنف نے ایک مثالی طرزِ حکومت کا ذکر کیا ہے۔ ناول کی کہانی کو مکالماتی انداز میں پیش کیا گیا ہے جس کے دو کردار ہیں ایک مصنف اور دوسراBotanist۔ بوٹانسٹ جس کے ساتھ وہ مختلف موضوعات پر بحث کرتا ہے اور یوٹوپیا پر لکھے گئے گزشتہ کام سے تقابل بھی پیش کرتا نظر آتا ہے۔ یہ دو مسافروں کی کہانی ہے جو فضا میں سفر کے دوران ایک یوٹوپیائی ارض بنا لیتے ہیں جس کوTime Machineکا نام دیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ کہانی بیان کرنے والا یوٹوپیا میں سفر کرتا ہے اور وہ زمین میں بسنے والے لوگوں کا ہم زاد ہے۔ ماڈرن یوٹوپیا ایک ایسے ابھرتے ہوئے جدید دور کی تصویر ہے جس میں وہ رہنا چاہتا تھا۔ مالتھا کی آبادی کا نظریہ ویل کی معاشیاتی نظریہ کا بنیادی ستون ہے جو مستقبل کے مثالی معاشرے کی جدید تصویر ہے۔

اِس کے بارے میں مصنف کا خیال ہے کہ یہ اس خلا کو پُر کرنے کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ مصنف نے ان تمام خصوصیات کا ذکر کیا ہے جس کی بنیاد پر وہ ماڈرن یوٹوپیا کو کلاسیکل اور ہم عصر یوٹوپیائی ادب سے مختلف سمجھتا ہے ۔ جدید یوٹوپیا سے اس کی مراد ایک متحرک معاشرہ ہے، ایک ایسا معاشرہ جو مکمل اور غیر متغیر ہے۔ یہ ایک آئیڈل نہیں بلکہ ارتقاپذیر معاشرہ ہے جس کے کردار بدلتے وقت اور حالات کے ساتھ خود کو تبدیل کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوٹوپیا ہر ایک کے لیے ہے جس میں قابل اور قابلِ تعریف شہریوں کی تخصیص نہیں ہو گی۔ عوام کو مکمل آزادی اور مکمل تحفظ فراہم کیا جائے گا۔

مالتھا[1] کے قانونِ آبادی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ویل بے ہنگم آبادی کو معاشرے کے لیے بہت بڑا خطرہ قرار دیتا ہے۔

> "A state whose population containue to increase in obedience to unchecked instinct can progress only from bad to worse.(58)"

ویل کے مطابق اگر آبادی کے اس بے ہنگم سیلاب کو نہ روکا گیا تو یہ تمام تر قدرتی وسائل کو ہڑپ کرلے گا۔ جدید یوٹوپیا میں افزائشِ نسل کے سخت قوانین ہوں گے جن کے مطابق بہترین انواع کو اپنی نسل بڑھانے کی اجازت دی جائے گی جب کہ بدترین انواع اولاد سے محروم ہوں گی۔ یہاں ویل، ڈارون کے فطری چناؤ کے اصول کی تائید کرتا ہے[2]۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں کوئی غریب نہ ہوگا۔ لوگوں کو اپنے پیشے اور دلچسپی کے انتخاب میں آزادی ہوگی۔ معاشرے کے قابل لوگ مل کر حکومت بناسکیں گے جس کو اس نے Sanurai کا نام دیا ہے۔ اس کے یوٹوپیا میں خواتین آزادانہ اور مردوں کے مساوی زندگی گزار سکیں گی۔ ویل کہتا ہے کہ معاشرہ خواتین کو مردوں سے اس لیے کم تر دیکھتا ہے کیوں کہ وہ مالی لحاظ سے مردوں سے کم تر ہیں جس کا حل مصنف نے یہ نکالا کہ خواتین کو ماں بننے اور بچے کی کفالت کرنے پر حکومتِ وقت مالی وظیفہ مقرر کرے گی۔ اس کے خیال میں یوٹوپیا مکمل طور پر ناممکنات میں شامل نہیں ہے لیکن اس کے حصول کے لیے معاشرے کو مختلف قسم کے تصورات پر عمل کرنا ہوگا۔ ایک مکمل معاشرے کے قیام کے لیے تمام دنیا میں ایک حکومت کا ہونا ضروری ہے جس کی آفاقی زبان ہوگی جو موجودہ تمام زبانوں کا ایک یکجان یا آمیزہ ہوگی۔ ایک معیشت اور کرنسی ہوگی اور تمام دنیا برقی ٹرینوں کی مدد سے منسلک ہوگی۔ اگرچہ آج بھی سائنس کی روز افزوں ایجادات اس یوٹوپیا سے سائنسی لحاظ سے کافی پیچھے ہیں کیونکہ مصنف مغربی اقوام کو متحد کرنے کا خواہاں ہے اور ایک ایسا معاشی مرکز بنانا چاہتا ہے جس کی تکمیل کسی حد تک متحدہ یورپ (Euro) کی صورت میں عمل میں آچکی ہے۔

H.G.Wells قدرتی وسائل کے مکمل استعمال کا مشورہ دیتا ہے۔ ایک اور مہنگا افسری نظام جو اخلاقی برتری کا ضامن ہو۔ ماڈرن یوٹوپیا میں حکومت لوگوں کو مکمل آزادی فراہم کرے گی جس کی بنیاد اس اصول پر رکھی جائے گی کہ تمہاری آزادی وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں دوسرے کی آزادی ختم ہوتی ہے۔

ا۔ مالتھا کے قانون آبادی کے مطابق آبادی اور خوراک میں تناسب قائم ہونا ضروری ہے۔

2 Darwin's Theory of Natural Selection.

ویل آزادی کے ساتھ مساوات کا بھی قائل ہے۔ ہر فرد کی اپنی انفرادیت ہے لیکن وہ لوگ جو سست، کاہل اور بے ہنر ہیں ان کو ملک سے نکال کر کسی ویران جزیرے میں پھینک دیا جائے۔ کیوں کہ وہ ملک کو کسی قسم کا فائدہ پہنچانے کے اہل نہیں ہیں۔ ویل سائنسی فکشن کا ایک بڑا نام ہے اور وہ سائنسی پیش گوئی کرنے میں کافی اہم مقام رکھتا ہے۔ اگرچہ اس نے اس ناول میں ٹائم مشین اور لیزر ہتھیاروں کا ذکر تو نہیں کیا ہے لیکن اس نے خود کار مشینوں، بجلی کی کڑیں اور برقی چائے دانی کی جانب اشارہ کیا ہے وہ جو آج ایک حقیقت بن چکی ہیں۔ مصنف نے وطن اور قومیت کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم پر سوال اٹھایا ہے۔ اس کے مقابل وہ عقل اور دماغ کی بنیاد پر انسان کو چار گروہوں میں تقسیم کرتا ہے۔ سب سے اعلیٰ شاعر، ادیب، سائنس دان، تخلیق کار دوسرے نمبر پر کام کرنے والے، تیسرے نمبر پر، جج، ڈاکٹر، سیاست دان، (غیر اخلاقی، بدکار لوگ) اور چوتھے نمبر پر Dull (غریب، پسماندہ ذہنیت کے حامل) افراد ہوں گے۔ مصنف ڈارون کے نظریہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ نسلی امتیاز کے بارے میں ناقدین نے اس کی آرا کو غلط انداز سے دیکھا ہے جس کے نتیجے میں مستقبل قریب میں نسلی بنیادوں پر جنگ کا آغاز ہو سکتا ہے۔

"ماڈرن یوٹوپیا" کو ایک اعلیٰ درجے کے تخیلاتی شخص کے ذہن کا دلچسپ جائزہ کہا جا سکتا ہے جس کو جدید سائنس فکشن کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے لیکن اس کو پڑھنے سے پہلے قاری کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ ناول سائنسی سفر پر فلسفیانہ اور سیاسی انداز سے ایک بحث ہے جو مصنف کے بقول ان تمام سیاسی اور معاشرتی سوالوں کا جواب دینے کی کوشش ہے جس کے نتیجے میں یا ان سوالوں کے جواب میں اس نے ایک یوٹوپیا تشکیل دیا ہے اور اس کے بقول اس کی تشکیل یا تکمیل میں ہی ان تمام سوالوں کا جواب موجود ہے۔ مصنف نے کتاب میں مدلل کے بجائے تخیلاتی انداز اپناتے ہوئے سوالات اٹھائے ہیں۔ دونوں کرداروں کے درمیان مکالمہ اور خود کلامی دکھائی گئی ہے۔ کہانی میں قیاس آرائی (Speculative) اور مابعد الطبیعات عناصر (metaphysical) کی موجودگی اس کو کہانی سے بھی کہیں زیادہ دلچسپ اور قابلِ توجہ بناتی ہے۔ دراصل اس کا مقصد ایک ایسا متن تحریر کرنا تھا جو فلسفیانہ بحث اور تخیلاتی کہانی کے بیچ کی کوئی چیز نظر آئے۔ اسی لیے "جدید یوٹوپیا" تھامس مور کے یوٹوپیا (Nowhere) سے بالکل مختلف ہے۔ کیوں کہ یہ ایک مکمل اور جامع مملکت کا نقشہ ہے۔ ایک ایسی دنیا جس میں خوشی اور طمانیت نے بے چینی اور بگاڑ کو شکست دی ہو اور مصنف کے خیال میں یہ وجود بھی رکھتی ہے۔

یوٹوپیا میں ایک ایسی صحت مند اور سادہ نسل کو دکھایا گیا ہے جو اپنی نیکی کا اجر دنیا میں وصول کر سکتے ہیں لیکن ویل کے مطابق جدید یوٹوپیا ایک متحرک نقطہء نظر ہے۔ ایک ایسا ملک ہے جو مستقل ہونے کے بجائے پُر امید ہو گا۔ اس کے نزدیک ہم قلعے تعمیر کرنے کے بجائے جہاز بنائیں گے۔ ایک ایسے سمجھوتے کی طرف جانا ہو گا جس میں افراد جامع ترقی کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔ مصنف کا مقصد ایک خوش گوار دنیا کی تشکیل ہے۔ اس دوران مصنف تھامس مور کے یوٹوپیا جس کو وہ Nowhere کہتا ہے اور جس کے لیے بقول اس کے، ہمیں انسان اور اس سے متعلق دوسری اشیا کی فطرت کو تبدیل کرنا ہو گا جو ناممکن ہے۔ تمام معاشرے کو عقل مند، برداشت کرنے والا اور مکمل بننا پڑے گا لیکن ویل کے نزدیک ایسی سنہری نسل اور ملک تو شاید فضا یا خلا میں ہی میسر ہو گیا۔ اس لیے ویل کا مقصد ممکنات میں شامل ایک عملی ریاست کا قیام عمل میں لانا ہے جو انسان کی کم زوریوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تشکیل دی گئی ہو۔ ایک ایسی ریاست جو غیر یقینی صورتِ حال، اچانک آنے والی آفات، قحط اور دریاؤں میں بھی مثالی ریاست ثابت ہو سکے اور اس کے لیے لوگوں کے اندازِ فکر میں تبدیلی لانا ہو گی اور یہ نقطہ افلاطون کی ریاست سے لے کر مور کے یوٹوپیا ہوول کے (Implicit Alturia)، B Commet کے (Great-Western) اور (Cabet Republic) میں بھی نظر آتا ہے۔ ان تمام اندازِ فکر رکھنے والے لوگوں کے مطابق انسان کو روایات، عادات اور رسوم و رواج کی قید سے آزاد کیا جائے اور یہ تمام عوامل ان یوٹوپیا utopia میں نظر آتے ہیں۔ لیکن ویل نفسیاتی انداز کو اپناتے ہوئے اس کا تجزیہ کرتا ہے۔ اس کے نزدیک شخصیات کا تضاد ہی دراصل انسانی زندگی کا اصل مفہوم ہے اور مور کے یوٹوپیا میں اس کا فقدان نظر آتا ہے۔ ویل کے مطابق یوٹوپیا ایک ایسی طاقت ور مملکت ہو گی جو خود مختار ہو گی۔ ویل سائنس فکشن کا سہارا لیتے ہوئے کرشماتی دنیا آباد کرتا ہے۔ یوٹوپیا میں بسنے والوں کی زبان کے بارے میں بھی ویل کے نظریات کافی منفرد اور اچھوتے ہیں۔ تمام ملک میں ایک ہی زبان بولی اور سمجھی جائے گی۔ یہاں مصنف دراصل اس لسانی تعصب کو ختم کرنا چاہتا ہے جو ایک زبان بولنے والے دوسری زبان بولنے والوں سے روا رکھتے ہیں۔ عربی خود کو عجمی سے افضل سمجھتا ہے۔ انگریزی کو آفاقی زبان کہا جاتا ہے، ویل کا خیال ہے کہ ایک ایسی ہی آفاقی زبان کا ظہور زمانہ قدیم سے ہوتا تو دنیا کو ان نسلی تعصبات سے نہ گزرنا پڑتا۔ دراصل ویل ایک ایسی سائنسی زبان کے ارتقا کا خواہاں ہے جس کی بنیاد ریاضی کے فارمولوں پر رکھی گئی ہو۔ جس میں فصل اور اسم کی تحریفات اصولوں پر ہو اور اس کی تمام تشکیل ناگزیر بنیادوں پر ہو گی[1]۔ زبان انسانی

1 A Modern Utopia H.G. Well, P: 170

خیالات کے تنوع کے لیے ضروری ہوتی ہے اوراس مقصد کے حصول کے لیے اس کو ارتقائی (metabolisam) عمل سے گزرنے کی ضرورت ہو گی جو زندگی کی علامت بھی ہے اور اسی خصوصیت کی بدولت اس زبان کو آفاقیت کا درجہ بھی حاصل ہو گا۔ مزید ویل افلاطون کے یوٹوپیا کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے جس میں نچلی ذات کے لوگ مختلف نوع کے ہوں گے لیکن ہمارا یوٹوپیا عیسائیت کی تعلیمات پر مبنی ہو گا اور تمام نسلوں، خیالات اور تصورات کے لوگ باہمی مساوات اور بھائی چارے کی فضا میں زندگی گزاریں گے۔

ویل کے یوٹوپیا میں آزادی کو ریاست کا بنیادی ستون کہا گیا ہے جب کہ مور کے کلاسیکل یوٹوپیا میں نیکی اور خوشی کا تصور لازم وملزوم ہے اور ان دونوں صورتوں کی آزادی کی کیفیت سے زیادہ حیثیت حاصل ہے۔ ویل انفرادی آزادی کا قائل ہے۔ اس وجہ سے وہ سوشلزم اور کمیونزم کے خلاف ہے۔ اس کے بقول قوانین اور پابندیاں انسان کی آزادی کو سلب کرتی ہیں۔ وہ انارکی کو غلامی کی دوسری صورت کہتا ہے۔ مصنف انسان کو اعلیٰ مقام پر فائز کرنا چاہتا ہے۔ جس کے لیے یوٹوپیا میں کچھ بنیادی پابندیاں ضروری ہوں گی۔ اگر آزادی دی جائے گی تو یقیناً اس کی کچھ حدود ہوں گی۔ تھامس مور کے یوٹوپیا کا حوالہ دیتے ہوئے مصنف کمیونزم کے خلاف ارسطو کی دلیل پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کمیونزم لوگوں کو ناقابلِ برداشت حد تک پابندیوں میں جکڑ لیتا ہے۔ شوپن مارہ نے بھی ارسطو کی بات کی تائید کی ہے۔ ویل کا یوٹوپیا انسانی نفسیات سے قریب تر نظر آتا ہے۔ گزشتہ یوٹوپیائی ادب پر تنقید کرتے ہوئے مصنف افلاطون کی "ریاست" کا حوالہ دیتے ہوئے اس کو اوسط درجے کے انگریزی قصبے سے تشبیہ دیتا ہے جس میں کمیونزم بہتر کو طرزِ حکومت قرار دیا گیا ہے۔ کیٹ کے یوٹوپیا کے متعلق مصنف کا خیال ہے کہ اس نے کسی حد تک کمیونزم سے آزادی کی روایت کا آغاز کیا لیکن یہ سچ ہے کہ موجودہ یوٹوپیا (ماڈرن یوٹوپیا) ۲۰ صدی کے آغاز میں منظرِ عام پر آیا اور کسی حد تک ان دونوں طاقتوں (کمیونزم اور سوشلزم) کے تضادات کے نتیجے کے طور پر ابھرتا ہے۔ ویل کے مطابق اب تک کے تحریر کیے گئے تمام یوٹوپیائی ادب میں صرف سطحی اور مادی حد تک تکمیل پسندی نظر آتی ہے۔ وہ صرف سطحی حد تک ایک خواب ہیں لیکن اصل مسئلہ دراصل وہ جسم ہے جو اس لباس کے اندر ہے جس کے اخلاقی اور ذہنی مسائل کو آج تک کوئی اس طرح سے زیرِ بحث نہیں لایا۔ ویل اس جسم کی اور اس کے اخلاق کی تربیت کرنا چاہتا ہے۔ ویل نے اپنے ماڈرن یوٹوپیا کے بارے میں یہ کہتے ہوئے اس کو گزشتہ یوٹوپیا سے منفرد اور مختلف قرار دیا ہے کہ،

"It must be remembered that a modern Utopia must differ from the utopias of any preceding age in being world

wide. It is not therefore development of any special race or culture, as plato developed and athenean sportam believed". [59]

H.G.Well اپنے ناول "ماڈرن یوٹوپیا" میں مختلف موضوعات پر بحث کرنے کے ساتھ ساتھ یوٹوپیا کے حوالے سے تقابل بھی کرتا ہے اور اپنے یوٹوپیا کو افلاطون اور تھامس مور سے بہتر قرار دیتا ہے۔

مصنف جب ایک آفاقی زبان اور ایک کرنسی کی بات کرتا ہے تو وہ H.Bradley کے فلسفہ (Pansopianiam) کی حمایت کرتا ہے۔Bradley کے فلسفہ کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ بریڈلے کے خیال میں انسان کا دماغ حتمی حیثیت کا مالک ہے اور تمام دنیا کے انسانوں کی صلاحیتیں یکساں نوعیت کی ہیں۔ ان کو زبان اور نسل کے فرق نے تقسیم کر دیا ہے۔ اگر دنیا میں ایک زبان اور یکساں معاشرتی اور معاشی نظام رائج کر دیا جائے تو یہ ایک مثالی ریاست کی جانب اہم قدم ثابت ہو سکتا ہے۔ مصنف کے مطابق اگر کسی ملک کی آبادی شتر بے مہار بڑھتی چلی جائے گی تو اس کی ترقی کی شرح بد سے بدتر ہی ہو سکتی ہے۔ اس لیے H.G.Well نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ اس کے ملک میں آبادی کو مالتھا کے قانون کے مطابق قابو میں رکھا جائے گا۔

اس کے یوٹوپیا میں افراد کی تقسیم ان کی ذہنی صلاحیتوں کی بنیاد پر کی جائے گی۔ جو ریاسی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی لانے کی اہمیت رکھتے ہوں گے۔ پہلے نمبر پر فلسفی، شاعر اور تخلیق کار ہوں گے۔ دوسرے نمبر پر جج، ڈاکٹر اور سیاست دان جو انتظامی نوعیت کے فرائض سر انجام دیں گے۔ مصنف کے یوٹوپیا میں تیسرا درجہ یا فوقیت کام کرنے والوں کو دی جائے گی یعنی تربیت یافتہ لوگ جب کہ چوتھے نمبر پر غیر تربیت یافتہ لوگ ہوں گے جو کسی طرح سے بھی فائدہ پہنچانے کی اہلیت نہیں رکھتے ہیں۔

ویل نے مور اور افلاطون کے یوٹوپیا کے تقابل میں اشتراکیت کے رجحان کا ذکر کیا ہے۔ تھامس مور کے یوٹوپیا میں اشتراکیت کی تقریباً وہی شکل رائج ہے جس کا تصور افلاطون نے اپنی ریاست میں دیا تھا اور ذاتی مملکت کا تصور نہیں ہے۔ سب کے لیے اوقاتِ کار چھ گھنٹے یومیہ ہیں۔ امن کو برقرار رکھنا حکومت کا بنیادی فریضہ ہے۔ مور کے یوٹوپیا میں مختلف مذاہب کے لوگ آزادانہ زندگی گزارتے ہیں۔

اردو ادب میں یوٹوپیائی عناصر کا رجحان

۲۱ویں صدی کے اردو ناول میں اگر اس رجحان کے متعلق بات کی جائے تو ناولوں میں یہ رجحان بہت کم نظر آتا ہے۔ اختر رضا سلیمی کے ناول "جاگے ہیں خواب میں" میں اگرچہ یوٹوپیا یا ناسٹیلجیا کا رجحان تو نہیں پایا جاتا لیکن مصنف نے وقت کی تقسیم کو بڑے دلچسپ انداز سے کہانی کے پلاٹ سے منسلک کیا ہے۔ ناول کی

کہانی میں ماضی سے حال یا حال سے ماضی کی جانب سفر کرنا کوئی نئی بات نہیں لیکن مذکورہ ناول میں ایک ہی کردار بیک وقت ماضی، حال اور مستقبل میں زندہ اور متحرک نظر آتا ہے۔ "دکھیارے" ناولٹ اَنیس اشفاق نے تحریر کیا جو ماضی پرستی یعنی ناسٹیلجیا کے عنصر پر مبنی ہے۔ ایک نیم پاگل کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے مصنف لکھنؤ کی عظیم اور شان دار تہذیب کا نوحہ بھی تحریر کرتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کا تحریر کردہ ناول "کئی چاند تھے سر آسمان" میں بھی ماضی پرستی نظر آتی ہے۔ مصنف نے یہ ناول مشہور شاعر داغ دہلوی کی زندگی پر لکھا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا دوسرا ناول جو اکیسویں صدی میں شائع ہوا، اس کا نام "قبضِ زمان" تھا۔ اس میں فاروقی نے وقت کی تقسیم کو مختلف انداز سے زیرِ بحث لایا ہے جس کو اس نے آفاقی اور زمانی تقسیم کہا ہے۔ اگر ناول میں یوٹوپیائی عناصر کی بات کی جائے تو ایک ہی ناول سامنے آتا ہے اور وہ بھی ترجمہ شدہ۔ ۲۰۰۵ء میں مشرف عالم ذوقی کا ناول سائنس فکشن "پوکے مان کی دنیا" منظر عام پر آیا۔ یہ ایک بچے کا یوٹوپیا ہے۔ ناول میں بچوں کے نفسیاتی ہیجانات کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے۔

۲۱ویں صدی میں شائع ہونے والے افسانوں کا اگر ذکر کیا جائے تو ڈاکٹر انور سجاد کے افسانوی مجموعے "سورج کو ذرا دیکھ" میں شامل افسانوں میں کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ نظر آتا ہے۔

بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

"انور سجاد کے افسانے تاریخ نہیں بنتے بلکہ اس سے عظیم تر حقیقت بنتے ہیں"(۶۰)

انور سجاد حقیقت سے ماورا حقیقت (fantasy) کو تصور کے روپ میں بیان کرتے ہیں۔ استعاروں اور علامتوں کی بھرمار سے تحت الشعور کو بے نقاب کرتے ہوئے لاشعور تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ ناول یا افسانے کی کہانی کو ایک خاص وقت اور خاص مقام کی ضرورت ہوتی ہے لیکن انور سجاد کے مذکورہ افسانوں میں یہ مقام تصوراتی ہوتا ہے اور یوں وہ اپنا یوٹوپیا تشکیل دیتا ہے جس کو تکنیکی زبان میں antistate کہا جاتا ہے۔ انور سجاد کے افسانہ "چوراہے" میں انسان کی بے چینی ڈسٹوپیا ہے اور اس کا سیاق و سباق انسانی تاریخ ہے جو آفاقی موضوع بھی ہے۔ انور سجاد نے اس افسانے میں ماورائے حقیقت (Surrealistic) تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ انسانوں اور مناظر کی منطقیت کو مصنف نے اپنے جذباتی تجربے کے زیرِ اثر پس منظر سے منقطع کر دیا ہے اور یوں زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر اپنا یوٹوپیا تشکیل دیا ہے۔ متن کی یہی تخفیف کاری (decontextualization of text) کہانی کے عمل کو کبھی ماضی تو کبھی مستقبل میں لے جا کر اس کا یوٹوپیا

یا جنتِ ارضی تشکیل دیتی ہے۔ تجرید، شعور کی رو اور فنٹیسی کا استعمال ڈاکٹر انور سجاد کو کافکا سے مماثل کرتا ہے۔ ڈاکٹر انور سجاد کے جن افسانوں میں یہ رجحان نظر آتا ہے، ان میں "سورج کو ذرا دیکھ"، "تلاشِ وجود"، "رات کے مسافر" اور "زرد کونپل" شامل ہیں۔

بطور ناقد ادیب معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے۔ وہ اپنے معاشرے کی برائیوں کی نشان دہی کرنے کے ساتھ ساتھ ایک مکمل معاشرے کی تصویر پیش کرتا ہے جو اس کا یوٹوپیا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف ماورائے حقیقت اپنی دنیا تخلیق کرتا ہے اور وہ شعور کی رو میں بہہ کر حقیقت سے رابطہ منقطع کر دیتا ہے اور اپنی خیالی دنیا کی تشکیل کرتا ہے جیسا کہ ماورائے حقیقت (Surrealism) کی تکنیک کا استعمال مصنف اس وقت کرتا ہے جب وہ حقیقت اور تخیل کو باہم ملا کر پیش کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں مصنف جب کردار کے خیالات کو کہانی کے سیاق و سباق سے مربوط کرتے ہوئے ان میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ قاری کو بھی کہانی کا حصہ محسوس ہوتے ہیں لیکن دراصل وہ کرداروں کا تصور ہوتا ہے۔ مثلاً شمس الرحمٰن فاروقی نے انیسویں صدی کے برصغیر کی تصویر پیش کی ہے لیکن اس کا مرکزی کردار وزیر خانم جب اپنے ماضی کو یاد کرتی ہے تو وہ کہانی کا حصہ بن جاتا ہے۔

۲۱ویں صدی میں تحریر کردہ سفر ناموں کا ذکر کیا جائے تو مستنصر حسین تارڑ کا نام سرِ فہرست نظر آتا ہے۔ تارڑ سفر نامے کو زندگی اور انسانی نفسیات سے جوڑ کر پیش کرتے ہیں۔ اسی لیے اُن کے سفر نامے زیادہ مقبول ہیں۔ سفر نامہ احساس کا نام ہے اس لیے جب بیان کردہ مناظر کو کیفیت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے تو قاری کو اس میں مبالغے کا عنصر نظر آتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ مناظر کو دوبارہ زندگی بخشتے ہیں۔ ناقدین کے بقول مستنصر نے پیرس کی سڑکوں کے فرضی نام تحریر کیے۔ ان کے سفر ناموں میں افسانوی عنصر غالب نظر آتا ہے۔ وہ قاری کو ایسی دنیا دکھانا چاہتے ہیں جو ان کے دل کی ہے۔ کبھی وہ صوفیانہ عناصر شامل کر کے اپنا یوٹوپیا سامنے لاتے ہیں۔ مستنصر تارڑ کے سفر ناموں "ہنزہ داستان"، "سفر شمال کے" اور "جہاں داستان" میں ان کی رومانویت پسندی کھل کر سامنے آتی ہے۔ جو سفر نامے کو مقصدیت سے نکال کر جذباتیت (Subjectivity) کی خصوصیت بخشتی ہے کیونکہ وہ اپنی ذات کا اظہار سفر نامے میں کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے نہ صرف سفر کی روئیداد بیان کرتے ہیں بلکہ کرداروں کی نفسیات تک بھی رسائی دیتے ہیں۔ یوں مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے خارجی دنیا سے سفر کرتے ہوئے کرداروں کی داخلی دنیا میں داخل ہوتے نظر آتے ہیں۔

اردو کالم اور یوٹوپیا

ایک کالم نگار اپنے کالم میں اصلاح احوال کے لیے تجاویز پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے علم کو بروئے کار لاتے ہوئے حالات پر تجزیہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی مستقبل کی پیش گوئی بھی کرتا ہے۔ کالم نگار کالم میں ذاتی تجزیہ اور اپنی ذاتی رائے پیش کرتے ہیں، اسی لیے کالم ذاتی نوع کی چیز ہوتی ہے۔ ایک مثالی نقطہ ءنظر معاشرے کی تشکیل کے لیے موجودہ حالات میں جن تبدیلیوں کا خواہاں ہوتا ہے، ان کا بھی ذکر گاہے بگاہے کرتا ہے۔ اس کو کالم نگار کا یوٹوپیا کہا جاسکتا ہے۔ اس تحقیق میں اُن منتخب اردو کالم نگاروں کے کالموں کا احاطہ کیا جائے گا جن کے ہاں یوٹوپیا کی اقسام اسلامو ٹوپیا، فیمنسٹ یوٹوپیا، سماجی یوٹوپیا اور موک یوٹوپیا کا رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔

منتخب کالم نگاروں کا مختصر تعارف

اس باب میں منتخب کالم نگاروں کا تعارف دیا جارہا ہے جن کا انتخاب کالموں میں یوٹوپیائی رجحان کی موجودگی کا جائزہ لے کر کیا گیا ہے۔ منتخب کالم نگاروں کا جامع تعارف متعلقہ ابواب میں دیا جائے گا۔

ا۔ منو بھائی

منو بھائی نے شاعری سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ بعد ازاں کالم نگاری کا آغاز انہوں نے روزنامہ "تعمیر" راولپنڈی میں ۱۹۵۸ء میں کیا۔ جس کے بعد وہ روزنامہ "جنگ" میں ۲۰۱۸ء یعنی اپنی وفات تک مستقل کالم نگاری سے منسلک رہے۔ ان کے کالم کا مستقل عنوان "گریبان" تھا۔ انہوں نے اپنے کالم کا ایک "مونو گرام" بھی بنوایا جس میں ایک کوّے اور چڑیوں کو اُڑانے والا چوکیدار کھڑا ہے، جسے بڑاوا کہا جاتا ہے۔ مگر ایک کوا اس کے سر پر بھی بیٹھا دکھائی دے رہا ہے۔ چوکیدار صحافت کی علامت ہے جب کہ کوا معاشرے کا منفی کردار ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ صحافت معاشرے کو منفی کرداروں سے ہوشیار کرنے اور ان سے نجات دلوانے کی کوشش کرتی ہے مگر المیہ یہ ہے کہ معاشرے کے یہ منفی کردار صحافت کے سر پر بھی سوار ہو جاتے ہیں۔ منو بھائی کی وجہ شہرت فکاہی کالم رہے ہیں مگر طنز و مزاح کے لبادے میں انھوں نے المیاتی کالم کا بھی تجربہ کیا ہے۔ اپنے فکاہی کالموں میں المیہ نگاری کی یہ روش اپنا کر انہوں نے اردو کالم نگاروں کو ایک نئی راہ دکھائی۔ انہوں نے اقتباسی کالم بھی لکھے ہیں۔ ان کے اکثر فکاہی کالموں میں یوٹوپیا کے عنصر نظر آتے ہیں۔

۲۔ کشور ناہید

عہدِ حاضر کی نمائندہ ادیب کشور ناہید بیسویں اور اکیسویں صدی کی ترجمان، شاعرہ اور کالم نویس کے طور پر ابھرتی ہیں۔ وہ عہد جدید کے تقاضوں اور ترجیحات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ کشور ناہید نے انگریزی زبان میں بھی کالم لکھے۔ فنِ صحافت کا باقاعدہ آغاز انہوں نے رسالہ "پاک جمہوریت" کی ادارت سنبھالنے سے کیا۔ کچھ عرصے کے بعد "ماہِ نور" کی مدیرہ کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا۔ ۱۹۹۷ء میں انھوں نے روزنامہ "جنگ" سے وابستگی اختیار کی۔ ان کے کالموں کے مندرجہ ذیل مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

۱۔ دکانِ ہنر

۲۔ ورق ورق آئینہ

۳۔ گمشدہ یادوں کی واپسی

ان کے کالموں کو تانیثی یوٹوپیا کے پس منظر میں دیکھا جائے گا۔

۳۔ عطاء الحق قاسمی

عطاء الحق قاسمی شاعر، ڈراما نگار اور سفر نامہ نگار ہیں۔ اس کے ساتھ وہ گزشتہ تین دہائیوں سے کالم نگاری کر رہے ہیں۔ ان کے کالم ایک ادبی حیثیت رکھتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی کے کالموں کے اب تک چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں "دیوار"، "جرم ظریفی"، "سرگوشیاں" اور "تجاہلِ کالمیانہ" اردو ادب کا سرمایہ قرار دیے جاتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کی کالم نگاری کا ایک مخصوص انداز ہے۔ وہ فکاہی کالم نگاری کرتے ہیں۔ ان کے فکاہی کالموں میں ایک فرضی ماحول نظر آتا ہے۔ اپنے تحقیق کردہ فرضی کرداروں اور ماحول کی مدد سے وہ معاشرے کے منفی پہلوؤں پر طنز کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ ان مسائل کا حل بھی اپنے کالموں میں تجویز کرتے ہیں۔ ان کے کالموں میں موک یوٹوپیا نظر آتا ہے۔

۴۔ ہارون رشید

مذہبی حوالوں اور اشعار سے بھرپور منفرد کالم لکھنے والے ہارون رشید "ناتمام" کے مستقل عنوان سے مختلف اخباروں میں کالم نگاری کرتے ہیں۔ ہارون رشید صحافتی پس منظر لکھنے والے کالم نگار ہیں۔ اپنے کالموں میں وہ زیادہ تر ملک کے سیاسی معاملات کو ہی زیرِ بحث لاتے ہیں۔ وہ اکثر اوقات کسی تاریخی حوالے سے بات

شروع کرتے ہیں۔وہ خلافتِ راشدہ اور خلافتِ عثمانیہ کے حکمرانوں کے حوالے ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ کلامِ اقبال پر انھیں کافی دسترس حاصل ہے۔ اپنی بات اور نقطہء نظر کو معتبر اور مؤثر بنانے کے لیے وہ اقبال کے اشعار ہی سے مدد لیتے ہیں۔ ان کے کالموں میں سیاسی و سماجی یوٹوپیا کا رجحان نمایاں ہے۔ جس کی بنیادی مثال تھامس مورنے دی تھی۔

۵۔ اوریا مقبول جان

پاکستان کے معروف کالم نگار، شاعر، دانش ور، ڈراما نگار اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ بحیثیت دینی دانش ور اور بطور کالم نگار ان کے کالمز باقاعدگی کے ساتھ پاکستان کے معروف اردو اخبار روزنامہ "ایکسپریس" میں شائع ہوئے ہیں۔ ۲۰۰۱ء سے ۲۰۰۴ء تک ان کو وزارتِ اطلاعات کی جانب سے مسلسل پاکستان کے بہترین کالم نگار کا اعزاز بھی مل چکا ہے۔ ان کا کالم "حرفِ راز" کے نام سے روزنامہ "جنگ" میں شائع ہونا شروع ہوا۔ اس نام سے ان کے کالموں کے سات مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ "ضربِ مومن" اخبار میں چھپنے والے کالموں کا مجموعہ "مجھے ہے حکمِ اذاں" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ ان کی دیگر تصانیف میں "گرد باد" بھی شامل ہے جو بلوچستان کے قبائل سے متعلق ایک ڈراما سیریل ہے۔ ان کا شعری مجموعہ "قامت" ۲۰۱۱ء میں طبع ہوا۔ ان کے کالموں میں اسلاموٹوپیا کا رجحان بہت نمایاں ہے۔

۶۔ خورشید ندیم

خورشید ندیم ۱۹۵۲ء میں گجرات لالہ موسیٰ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے صحافت کا آغاز ۸۰ء کی دہائی میں کیا۔ وہ منفرد سوچ رکھنے والے مذہبی اسکالر ہیں۔ وہ روزنامہ "دنیا" سے منسلک ہیں اور "تکبیرِ مسلسل" کے نام سے مختلف موضوعات پر تاحال کالم نگاری کر رہے ہیں۔ ان کے کالموں میں بھی اسلاموٹوپیا کا رجحان نظر آتا ہے۔

۷۔ جاوید چودھری

جاوید چودھری نے صحافت میں ماسٹر ڈگری حاصل کی اور صحافت و کالم نویسی کو ہی اپنا پیشہ بنایا۔ الیکٹرانک میڈیا پر بہت سے اخباری چینل پر بطور میزبان اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ان کو سب سے زیادہ مقبولیت بطور کالم نگار حاصل ہوئی۔ جاوید چودھری کے کالموں میں انگریزی زبان کا عکس اور ایک خاص تمہید پائی جاتی ہے۔ اکثر اوقات وہ اپنا کالم یوں شروع کرتے ہیں گویا کوئی کہانی بیان کر رہے ہوں۔ ان کے کالموں

کے ۷ مجموعے "زیرو پوائنٹ" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ ان کے کالموں کا سیاسی و سماجی یوٹوپیا کے تناظر میں جائزہ لیا جائے گا۔

۹۔ ارشاد بھٹی

ارشاد بھٹی صحافت کی دنیا میں نو وارد کالم نگار ہیں۔ کالم نگاری کے ساتھ ساتھ وہ الیکٹرانک میڈیا پر بھی بطورِ تجزیہ کار اپنی رائے اور تبصرے پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ روزنامہ "جنگ" میں کالم لکھتے ہیں۔ ان کے کالموں میں حالات و واقعات کی تجزیہ نگاری کے ساتھ الفاظ کا بھی خوب صورت اور برجستہ استعمال نظر آتا ہے۔ وہ ہم قافیہ الفاظ کی گردان سے سامع اور قاری کے ذہن اور سماعت پر لطیف اثرات چھوڑتے ہیں۔ انھوں نے کالم نگاری کا آغاز "الاخبار" سے کیا۔ بعد ازاں جنگ گروپ سے منسلک ہو گئے اور جیو کے پروگرام "رپورٹ کارڈ" کی میزبانی کے فرائض بھی سرانجام دیتے رہے ہیں۔ ان کے ہاں بھی سیاسی و سماجی یوٹوپیا کا رجحان نمایاں ہے۔

کالم عنوان کے تحت کسی بھی موضوع پر مصنف کی وہ تحریر ہے جس میں اس کی شخصیت کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ کالم نگار اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرتا ہے اور مستقبل کے خواب بھی دکھاتا ہے جس کو اس کا یوٹوپیا کہا جا سکتا ہے۔

برصغیر میں کالم نگاری کا آغاز ۱۷۸۰ء میں انگریزی ہفت روزہ "ہکی گزٹ" سے ہوا جبکہ پہلا اردو اخبار "جام جہاں نما" ۱۸۲۲ء میں شائع ہوا۔ کالم نگاری کے پہلے دور میں کالم خبروں کی صورت میں تھے دوسرے دور میں کالم نے ایک باقاعدہ صورت اختیار کر لی اور تیسرے دور تک پہنچنے تک کالم ایک صنف اور اخبار کا ناگزیر حصہ بن گیا۔ کالموں کی مختلف اقسام کا تعین اسلوب اور موضوع کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے۔ پاکستان کے اہم اخبارات میں روزنامہ نوائے وقت، روزنامہ جنگ، روزنامہ دنیا، روزنامہ ایکسپریس، روزنامہ پاکستان اور روزنامہ خبریں شامل ہیں۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں ذکر ہو چکا کہ یوٹوپیا سے مراد جنتِ ارضی ہے جس کا تصور دنیائے ادب میں سب سے پہلے تھامس مور نے ۱۵۱۶ء میں ایک مثالی ریاست کی صورت میں دیا تھا۔ تھامس مور کے یوٹوپیا کے دو بنیادی عناصر ہیں؛ مثالیت پسندی اور تکمیل پسندی۔ انگریزی ادب میں یوٹوپیا پر مبنی ناول اور کہانیاں کثرت سے مل جاتی ہے۔ اب یہ ایک علیحدہ صنف کی صورت اختیار کر چکا ہے جسے سائنس فکشن کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ادب میں یہ رجحان چند مخصوص ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کے ہاں نظر آتا ہے۔ اس لیے یوٹوپیائی

ادب کی تاریخ کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ کلاسیکل یوٹوپیا، تھامس مور کا یوٹوپیا اور جدید یوٹوپیا۔ جن اردو کالم نگاروں کے ہاں یہ رجحان نمایاں ہے، ان میں اوریا مقبول جان، خورشید ندیم، کشور ناہید، جاوید چوہدری، منو بھائی اور عطاء الحق قاسمی شامل ہیں۔

حوالہ جات

١. Oxford advanced learner's dictionary, 10th edition Pg 1015

٢. قادری، سید اقبال، رہبر اخبار نویسی، ترقی اردو بیورو، نئ دہلی، ١٩٨٩ء، ص ٣١٢

٣. فرہاد زیدی، ریت پر لکھا، رب پبلشرز، کراچی، ٢٠٠٦ء، ص ٩

٤. فیروز الغات، فیروز سنز لاہور، ٢٠٠٧ء، ص ٥٤٩

٥. مفتی ابولبابہ، شاہ منصور، تحریر کیسے کریں، الفلاح کراچی، ٢٠٠٨ء، ص ٣٨٥

٦. محمد اسلم ڈوگر، فیچر، کالم اور تبصرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ١٩٩٨ء، ص ٤٧

٧. ایضاً، ص ٤٧

٨. ایضاً۔ ص ٥١

٩. ایضاً، ص ٦٥

١٠. عطاء الحق قاسمی، "روزان دیوار سے" مجموعہ کالم "کالم تمام" سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ٢٠١٤ء، ص ٥٠

١١. جاوید اقبال، "اپنا گریبان چاک"، خود نوشت سوانح حیات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ٢٠٠٣ء، ص ٢٠٥

١٢. خورشید ندیم، "تکبیر مسلسل" کالم ادارتی صفحہ روزنامہ "دنیا"، ٢٠ اکتوبر ٢٠٢٠ء،

١٣. محمد اسلم ڈوگر، "فیچر، کالم اور تبصرہ،" "مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ١٩٩٨ء، ص ٩٨

١٤. محمد اسلم ڈوگر، فیچر، کالم اور تبصرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ١٩٩٨ء، ص ١٠٠

١٥. ایضاً، ص ١٨

١٦. ایضاً، ص ١٠٥

١٧. خورشید عبد السلام، "فن صحافت"، مرکزی اردو بورڈ لاہور، ١٩٢٨ء، ص ٢٥٦

١٨. ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، "کشاف تنقیدی اصطلاحات"، مرتب، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ١٩٨٥، ص ٦١٨

١٩. ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، "کشاف تنقیدی اصطلاحات"، مرتب مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ١٩٨٥، ص ١٦٥

۲۰. Bloom, Allan (1991) (1968) The Republic of Plato, Translated with notes and an interpretive essay. New York: Basic Books, P.973

۲۱. حضرت سید عبد الکریم بن ابراہیم جیلانی، انسان کامل، نفیس اکیڈمی، بلدسس اسٹریٹ ، کراچی، ۱۹۸۰ء، ص ۲۵۰، مترجم مولوی فضل میراں۔

۲۲. ایضاً، ص۱۷۵

۲۳. رانااعجاز احمد خان، "اقبال کے ہاں مرد مومن کا تصور"، ادارتی صفحہ، جنگ اخبار، ۹نومبر ۲۱۰۳ء

۲۴. ایضاً

۲۵. A.JM Mine. " The Scoial Philosophy of EnglishIdealism", Routledge Library Editions, 1989, P230

۲۶. McDonald, L (1993), "Early origins of Social Sciences", MC Gill-Queen's, Press- MQUP, P.250

۲۷. Babar Javed, "Social Utopia: A Study of Perfect Socio Political Setup", by University of Gondar, International Journal of Research, Jan 2014, P.72

۲۸. Sahgal, G (2006), Legislating Utopia, Violence against women: the sipuated Politics of Belonging, Retrieved from http:IIbooks:goggle

۲۹. Mark K, and Engels, (1847) "The Communist-Manifesto, retrived from http:www.gutenberg.

۳۰. Barclay, M.W (1990) "Utopia dystopia", a dissertation on Psychology and Utopian thinking. Doctoral disseratation, saybrook Institute Graduate School and Research centre, UMI, P: 83

۳۱. ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مرتب، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص۹۹

۳۲. Sigmund Freud,"An Outline of Pschonalysis" London, 1949, Textbook by Charles Stangor, P.14

۳۳. Prof. Sigmund Freud, "A General Introduction to psychoanalysis", Oxford Press, 1917, P: 419

۳۴. Prof. Sgmund Freud, "Freud and Utopia", Mark Holowchak Lexington Books, 2011, P. 50

۳۵. Ibid, Pg. 57

۳۶. Ibid, Pg 59

۳۷. Emaul Burnt, "Psychoanalysis, Rescue and Utopia", Lexington Books 2011, P.350.

۳۸. Review of Riot-Sarcay, "Utopia by Janathan Beecher", P520, Feb 2014

۳۹. F.H Bradley, "Apperance and Reality", 2nd edition, London, 1897, P,101

۴۰. Ibid, P105

۴۱. Ibid, P110

۴۲. ThomasMoor, "Utopia" Translated by Ralph- Robinson, Hasburg Netherlands, 1684, London P22

۴۳. Ibid: P27

۴۴. Ibid, P 28

۴۵. Ibid, P50

۴۶. Ibid, 44

۴۷. Ibid, 45

۴۸. Ibid, 48

۴۹. Ibid, P 250

۵۰. Ibid, P93

۵۱. Ibid, P100

۵۲. Ibid, P105

۵۳. Ibid, P109

۵۴. Ibid, P 210

۵۵. Ibid, P145

۵۶. Ibid, P88

۵۷. Ibid, P. 100

۵۸. H.G.Well, “A Modern Utopia” Published by Chapman and Hall, April 1905, England P.50

۵۹. Ibid, p 101

۶۰. محمد منصور عالم، شمس الرحمن فاروقی کی تنقید نگاری، مختار احمد پرنٹ آرٹس کریم گنج بودھ گیا، نومبر ۲۰۰۷ء، ص ۱۰۳

باب دوم:

مذہبی و ادبی کالموں میں یوٹوپیا کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

اسلاموٹوپیا کا مطلب ہے اسلام کو فلاحی ریاست کی بنیاد بنانا اور اسلام کو تمام درپیش مسائل کا حل سمجھنا۔ اس باب میں اسلاموٹوپیا کے رجحان کے تناظر میں اوریا مقبول جان اور خورشید احمد ندیم کے کالموں کا جائزہ لیا جائے گا دونوں مذہبی کالم نگار ہیں۔ اوریا مقبول جان کے کالموں کے ۷ مجموعے "حرف راز" اور مذہبی کالموں پر مبنی کتاب "مجھے ہے حکم اذاں" کے نام سے چھپ چکی ہے۔ کشور ناہید کے کالموں کا تانیثی یوٹوپیا کے تناظر میں دیکھا جائے گا۔

ا۔ اسلاموٹوپیا کے بنیادی رجحانات کا جائزہ

اسلاموٹوپیا، یوٹوپیا کی اسلامی شکل ہے۔ اس کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ یا اصطلاح عربوں کے ویلوٹ انقلاب (۱۹۷۸اور ۱۹۸۹ء) اور ایران کے اسلامی انقلاب کے زمانے میں پہلی بار سامنے آئی۔

مشرقِ وسطیٰ میں یہ رجحان بنیادی طور پر جدیدیت، کھلی سماجی آزادی اور مغربی استعمار کے خلاف ایک ردِ عمل کے طور پر ابھرا۔ اسلاموٹوپیا کا رجحان ایک ایسے طرزِ حکومت کی حمایت کرتا نظر آتا ہے جس کے بنیادی عناصر مغرب میں موجود آزاد خیال جمہوریت سے ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔ اسماعیلیہ کے بنیاد پرست سکول ماسٹر حسن النبا نے ۱۹۲۸ء میں "جماعت الاخوان المسلمین" کی بنیاد رکھی جو آج بین الاقوامی سطح پر معروف ایک اہم اسلام پسند تنظیم ہے جو اسلام کے سیاسی پیغام کی ترویج پر زور دیتی ہے۔ حسن البنا کا پیغام جلد ہی اسلامی حدود کو پھلانگتا ہوا امتِ مسلمہ سمیت یورپ میں بھی پھیل گیا۔ اِس کے ساتھ ساتھ اُس نے مختلف سیاسی، سماجی اور مذہبی جماعتوں کو بھی متاثر کیا۔

حسن البنا اور اس کے حامی مسلم اُمہ کے مختلف مصائب اور مسائل کا حل صرف ایک جملے میں یوں بتاتے ہیں کہ "ان تمام مسائل کا حل اسلام ہے"۔ یہ تحریک، اسلامی اور مذہبی قوانین کے احیا کی خواہاں ہے جن کے وسیلے زندگی کے ہر شعبے کو منظم بنایا جاسکتا ہے اور یوں اسلامی اُمہ کا یہ احیا، دین کو دنیا میں پھیلانے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس طرح مسلم معاشرے کو مغرب کی سیاسی، معاشی اور ثقافتی یلغار سے نمٹنے کے قابل بنایا

جاسکتا ہے۔ اس رجحان کے مطابق مسلمان معاشرے میں موجود ہر برائی کی جڑ مغرب کے مضر یا بد اثرات ہیں۔ اس سلسلے میں وہ ایک ایسے نظریے کا حوالہ دیتے ہیں جس کا تاثر یا بیانیہ مغرب کی مستقل مسلم دشمنی پر مبنی ہے۔ [1] میخائل محمد نائٹ نے اپنی کتاب Islam after Liberalism میں اسلاموٹوپیا کے قیام اور ان کے نظریات کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اسلامسٹس کے مطابق عہدِ وسطیٰ کے یورپ میں نشاۃ ثانیہ کی تمام ترقی مسلمانوں کی دریافت اور ان کی کوششوں کا نتیجہ ہے لیکن مغرب اپنے محسن کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے مسلمانوں اور ان کے مذہب کے خلاف ہو گیا اور اُس نے ان کے خلاف ایک سازش کا آغاز کیا جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو غیر مہذب اور دہشت گرد ثابت کیا گیا۔ مغرب نے مسلمانوں کی ثقافت کے خلاف ایک تحریک کا آغاز کیا جس میں وہ دین کے مقابلے میں دنیاوی تعلیم کو پروان چڑھانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لیے مشنری اور میڈیا کا استعمال کیا جاتا ہے۔

> "To relieve the implicit tension between this rejection and acceptance of the west, Islamists propose a religious interpretation of modern seculat ideas and institutions. Its adherents find precidents in Islamic tradition for every western achievement and portray its qualified appropriation as merely a return rather thana departure from them [1]

میخائل محمد نائٹ کے خیال میں اخوان المسلمین پر یہ الزام ہے کہ ایک طرف تو یہ عالم اسلام کی بربادی کی وجہ مغرب کو قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف مغرب کے نظریات کا اتباع بھی کرتے ہیں۔ میخائل کے نزدیک اس کشمکش کو حل کرنے کے لیے وہ جدید سیکولر خیالات کی تشریح مذہب کی روشنی میں کرتے ہیں۔ اخوان المسلمین کے پیروکار مغرب کی ہر کامیابی کی نظیر اسلامی روایات سے پیش کرتے ہیں اور اسے اسلام ازم کا نام دیتے ہیں۔ اس اسلام ازم کا بنیادی مقصد مغرب کے بد اثرات سے مسلم اُمہ کو بچانا ہے۔ جس کے لیے وہ مذہبی تعلیمات کو اپنا ذریعہ بناتے ہیں۔ اسلاموٹوپیا پر یقین رکھتے ہوئے اسلامسٹ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ان کی خواہشات پوری ہوں گی کیونکہ قرآن پاک اور رسول ﷺ کی تعلیمات میں اس کا وعدہ کیا گیا ہے۔

اس رجحان کا دوسرا مقصد ایک مذہبی اور سیاسی امر کی تشکیل ہے جس کی تعلیمات مرحوم جمال الدین افغانی، محمد عبدو اور راشدردا کے ان افکار میں نظر آتی ہیں جس میں وہ مغربی اصولوں کا اسلامی فقہ

---

1 .Islam After liberalism, Mikhael Muhammad Kinght, P.219-240

(Lexicon) کی مدد سے احیا چاہتے ہیں۔ اگرچہ اہم مقصد تو خالص اور بنیادی اسلام کی طرف واپسی ہے۔ مسلمانوں میں بھائی چارے کی تعلیمات، مغرب کے مکمل وجود سے انکار نہیں کرتیں بلکہ اسلاموٹوپیا کا بنیادی مقصد اسلام کی اصل اور خالص صورت کی جانب رجوع کرنا ہے۔ مسلم بھائی چارے کی مرکزی قیادت مغرب کو مکمل طور پر رد بھی نہیں کرتی بلکہ یہ مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی سے سیکھنے کی ضرورت پر زور دیتی ہے۔ سیاسی اسلام جدید خیالات اور اداروں کی مذہبی انداز میں ترجمانی کرتا ہے۔اس کے پیروکار مغرب کی ہر کامیابی میں اسلامی اصولوں کی جھلک دیکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس تحریک کے ماننے والے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ نجات اور کامیابی کا راستہ اسلام سے جڑا ہے۔ مغرب اس رویے کو بنیاد پرستی کا نام دیتا ہے۔ جبکہ اسلامسٹس یہ سمجھتے ہیں کہ حقیقت میں بنیاد پرستی ایک امریکی جارحانہ تحریک کا نام ہے۔ ان کے نزدیک مغربی بنیاد پرستوں نے جدیدیت (Modernism) کی مخالفت میں مذہب کا سہارا لیا۔ اس کے برعکس، اسلامسٹ اسلامی اصولِ فقہ (قرآن و حدیث) کی تخلیقی انداز میں ترجمانی کے حق میں ہیں۔ وہ بنیاد پرستی کے بارے میں بھی ایک مخصوص نقطہ نظر پیش کرتے ہیں۔ان کے مطابق بنیاد پرستی دراصل ایک عیسائی تحریک کا نام ہے جو مغرب میں جدیدیت کے رجحان کے ردِ عمل میں سامنے آئی۔ میخائل محمد نائٹ نے اپنی کتاب "American Islam" میں بنیاد پرستی کی تعریف اس طرح سے کی ہے:

> “The Concept of fundamentalism first emerged in American Christianity in the early 20th century. (2)

بنیاد پرستی کا تصور ۱۹۲۰ء میں عیسائیت میں جدیدیت کے رد عمل کے طور پر ابھرا۔اُن کے نزدیک اس تناظر میں دیکھا جائے تو اخوان المسلمین پر بنیاد پرستی کا الزام غلط ہے۔ میخائل محمد نائٹ کے مطابق:

> “The off made blanket identification of Islamism with fundamentalish is mistaken. The term “Fundamentalism originally referred to American Protestant movement that adopted a literal intrpretaton of religious cannon to support its rejection of modernism” (3)

اس کے برعکس اسلام ازم اسلامی نصاب کی تخلیقی انداز میں ترجمانی (Interpret) کچھ اس انداز سے کرتا ہے کہ یہ جدیدیت کے پہلوؤں کا بھی ساتھ دے سکے۔ باالفاظِ دیگر مسلمان وقت کے ساتھ بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکیں۔ جن کی مثال اسلامی فقہ کے قوانین ہیں جن میں بدلتے حالات کے ساتھ تبدیلی ہوسکتی ہے۔ اس طریقہ کار کو Ingenious Hermenautic Method کا نام دیا جاتا ہے جس کے

ذریعے قرآن و حدیث کی مدد سے جمہوریت کے نئے عناصر کو دریافت کیا جاتا ہے۔ دراصل ان کا یہ ماننا ہے کہ اسلام جمہوری اور انفرادی آزادی کی قدر کرتا ہے۔ یہ حکمتِ عملی مسلم اُمہ میں اتحاد اور ہم آہنگی کی فضا پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے جو بھائی چارے کے فلسفے کا بنیادی عنصر ہے۔ یہ اسلامی شوریٰ کا بنیادی نقطۂ نظر (version) ہے۔ قرآن پاک اور حدیث نے بھی اس کی حمایت کی ہے جبکہ وقت کے ساتھ ساتھ اسلامی دنیا نے اس کو نظر انداز کر دیا لیکن اب کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس طریقے کار کا از سرِ نو اجرا کیا جائے جو مغرب میں تیار ہوا اور ترقی کی منازل بھی طے کیں۔

اخوان المسلمین کا یہ نظریہ جمہوری طریقہ کار کو ایک مثبت بنیاد فراہم کرتا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید مستحکم نظر آتا ہے۔ حسن البنا نے اسمبلی کے انتخاب کی حمایت تو کی ہے لیکن وہ کثیر الجماعتی حکومت کے حق میں نظر نہیں آتے۔ اس حمایت کے پیروکار اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ منتخب حکومت کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے جواب دہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوریت، مطلق العنانی سے بہتر ہے اور مذہبِ اسلام بھی اس کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ بات ان کے لیے باعثِ شرم ہے کہ مغرب تو جمہوریت کے ثمرات سمیٹ رہا ہے جبکہ مسلمان سیاسی، معاشرتی اور مذہبی سطح پر استعمار اور استحصال کا شکار نظر آتے ہیں۔

> "خندق کھودنا فارس کا طریقہ تھا، عرب اس سے ناواقف تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت سلیمان فارسی کے مشورہ سے خندق کھودنے کی تدبیر اختیار کی جس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ کفار کے طریقہ ءجنگ کو اختیار کتنا درست ہے۔ موقع کی نزاکت اور حالات کے اعتبار سے طریقہ ءجنگ میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے۔"(۴)

اس اقتباس سے جماعت الاخوان المسلمین کے موقف کی تائید ہوتی ہے کہ خیر، برکت اور اچھائی کی بات آپ غیر مسلم سے بھی سیکھ کر فیض حاصل کر سکتے ہیں۔

حسن البنا نے بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں ایک مضمون لکھا جس میں اس بات پر اظہارِ افسوس کیا ہے کہ کوئی بھی عرب جنرل چارلس ڈی گول کی طرح اقتدار کو از خود نہیں چھوڑے گا خواہ عام انتخابات میں اسے ناکامی کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ اسی مضمون میں وہ جان الف کینیڈی کے اس انٹرویو کا حوالہ دیتا ہے جس میں اس سے سوال کیا گیا کہ اس کی یورپ کی سیر کا خرچہ حکومت کے جمع شدہ ٹیکس کے ذریعے دیا گیا تو وہ خلیفہ ثانی حضرت عمر کا واقعہ بیان کرتا ہے کہ کس طرح اُن سے اس جبے کے متعلق سوال کیا

گیا تھا جو مالِ غنیمت سے لیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ چوں کہ میں دراز قد ہوں اور ایک چادر سے میرا جبہ تیار نہیں ہو سکتا ہے، اس لیے اپنے بیٹے عبد اللہ کے حصے کی چادر بھی اس میں شامل کی۔[1]

حسن البنا اور ان کے پیروکاروں نے اُمتِ مسلمہ کو درپیش تمام مسائل کا حل اسلام کی تعلیمات پہ عمل پیرا ہونے کو بتایا ہے۔ وہ مسلم معاشروں کے ہر مسئلے کی بنیاد مغرب اور اس کی پالیسیوں کو سمجھتے ہیں۔ جس نے مسلمان مفکرین، سائنس دانوں اور دانشوروں سے علم و دانش کے موتی سمیٹے اور اب یہ احسان فراموش، ان کی احسان مندی کی بجائے انھی کے درپے ہو گئے ہیں۔

اخوان کے مطابق، مغرب مسلمانوں کو مقام و مرتبے سے محروم کر کے ایک کٹھ پتلی بنانا چاہتا ہے اور وہ اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہو چکا ہے۔ بین الاخوانین تحریک کا بنیادی مقصد مغرب کے استعمار سے نجات حاصل کرنا ہے جسے حاصل کرنے کے لیے انھوں نے جو طریقہ کار اپنایا ہے، اس میں روایتی مذہبی بنیاد کے ساتھ جدید آزادانہ سوچ اور رائے بھی شامل ہے۔ جس کے مطابق وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ مسلمانوں کو اپنی سوچ اور اندازِ فکر میں تبدیلی لانا ہو گی۔ یہ وقت کا تقاضا ہے جس کا حل یہ ہے کہ مذہب کی تعلیمات کا وہ حصہ جو روزِ محشر اور روزِ جزا سے متعلق ہے، وہ اٹل اور پُر مغز ہے لیکن کافی معاملات میں موقع کی نزاکت اور حالات کے ساتھ قانونِ فقہ کی مدد سے تبدیلی لائی جا سکتی ہے اور یوں غیر مسلموں کے اس دعوے کا دفاع کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان بنیاد پرست اور رجعت پسند ہیں۔ اس کی وضاحت وہ اس طرح کرتے ہیں کہ آج کا روایتی جنگوں کا دور نہیں رہا بلکہ میڈیا کو ایک طاقتور ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ تحریر و تقریر کے ذریعے دشمنانِ اسلام سے زیادہ بہتر طریقے سے لڑا جا سکتا ہے۔ اسلام کی تعلیمات کے مطابق وقت کے ساتھ طریقہ کار بدلا جا سکتا ہے جو اسلام کی جدت پسندی کو ظاہر کرتا ہے۔

یہ خیال روایت پسندی اور تجدید کا حسین امتزاج ہے۔ لبرل اسلام مغرب سے نئے نظریات برآمد کرنے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتا ہے بلکہ وہ اس بات میں بھی فخر محسوس کرتے ہیں کہ اسلامی جمہوریت کی جڑیں مغربی جمہوریت سے کہیں زیادہ مضبوط اور مستحکم ہیں کیونکہ اسلام غاصب بادشاہوں اور مطلق العنان حکمرانوں کی حاکمیت پر سوال اٹھاتا ہے۔ اسلام کی اقدار کا نظام اپنے پیروکاروں کو مہذب رویے کی تلقین کرتا ہے۔ مغربی جمہوریت میں اس رویے کا فقدان نظر آتا ہے۔

---

1 .Hassan-al Banass letter to fifth - Asswrs

حسن البنا ۲۵ اگست ۲۰۰۷ء کو مصر میں ایک مثالی اسلامی ریاست کا نقشہ پیش کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ریاست کثیر الجماعتی حکومت کی ہو گی جس میں صحافت اور عدلیہ آزاد ہو گی لیکن قرآن و سنت کے قوانین سے تصادم ناقابلِ برداشت ہو گا۔ جس کے لیے عوام کے نمائندوں کو مذہبی شوریٰ کے ارکان سے مشورہ کرنا ہو گا اور یہ حکومت اس کے مطابق مثالی ثابت ہو گی۔ ان کے مطابق امریکا اور دیگر غیر مسلم ممالک میں اسلاموفوبیا کا رجحان جس طرح پنپ رہا ہے، اس کا توڑ صرف اسلاموٹوپیا کے ان رجحانات کو فروغ دے کر ہو سکتا ہے۔

۲۔ اکیسویں صدی کی اردو کالم نگاری میں اسلاموٹوپیا کے رجحانات

مقالہ ہٰذا کا بنیادی موضوع منتخب کالم نگاروں کے ہاں یوٹوپیا کے رجحان کا مطالعہ ہے اور اسلاموٹوپیا اس مخصوص نقطۂ نظر یا اسلامی روشن خیالی کا نام ہے جس میں مصنف اسلام کو مثالی ریاست کے قیام کے لیے ایک بہترین ضابطۂ حیات، ایک روشن خیال بنیادی لائحہ عمل قرار دیتے ہیں۔ اسلاموٹوپیا پر یقین رکھنے والے تخلیق نگاروں کے ہاں دورِ جدید کے تمام تر مسائل کا حل صرف اور صرف اسلام کی تعلیمات پر مکمل طور پر عمل پیرا ہونے میں ہے۔ اس ضمن میں اگر ہم اکیسویں صدی میں لکھنے والے دینی کالم نگاروں کا جائزہ لیں تو اوریا مقبول جان، خورشید ندیم، محمد شفیق جان پسروری، محمود فیاض اور مفتی منیب الرحمٰن کے نام صفِ اول کے کالم نگاروں میں نظر آتے ہیں۔

البتہ اسلام کو ایک متحرک قوت اور تبدیلی لانے والے عنصر کے طور پر دیکھا جائے یا اسلاموٹوپیا کے تحت وضع کیے گئے اصول و قوانین کا جائزہ لیا جائے تو اوریا مقبول جان اور خورشید ندیم کے ہاں اسلاموٹوپیا ایک محرک اور مثبت قوت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ ان دونوں کالم نگاروں کا اسلامی ریاست کے متعلق نہایت واضح اور جامع نقطہ ءِ نظر ہے جس کے مطابق وہ ایک مثالی ریاست کی تکمیل ہوتے دیکھتے ہیں اور اس کے متعلق اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں۔ اسلاموٹوپیا کے منشور اور نقطہ ءِ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے ذیل میں ۲۱ویں صدی کے ان دونوں کالم نگاروں کے کالموں کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

۳۔ اوریا مقبول جان، بحیثیت کالم نگار

اوریا مقبول جان پاکستان کے صفِ اول کے کالم نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ انھیں ۲۰۰۰ء سے ۲۰۰۴ء تک وزارتِ اطلاعات حکومتِ پاکستان کی جانب سے پاکستان کے بہترین کالم نگار ہونے کا اعزاز بھی

حاصل رہا ہے۔ کالم نگار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ شاعر، دانشور اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ انھیں شہرت کالم نگاری سے ملی لیکن وہ خود کو شاعر کہلوانا اور بحیثیت شاعر ہی اپنی شہرت کو پسند کرتے ہیں۔ وہ پنجاب کے شہر گجرات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جامعہ پنجاب اور جامعہ بلوچستان میں بحیثیت طالب علم رہنے کے بعد جامعہ بلوچستان میں ہی معلم کے فرائض انجام دیتے رہے۔ بعد ازاں سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے بلوچستان کے مختلف علاقوں میں بطور سول سرونٹ تعینات رہے، پھر لاہور منتقل ہو گئے۔ ۱۸ جنوری ۲۰۱۶ء کو ۳۱ سال سرکاری ملازمت کرنے کے بعد ریٹائرڈ ہو گئے۔ اب پیشے کے لحاظ سے وہ ایک صحافی، کالم نگار اور ٹی وی پروڈیوسر ہیں۔

۴۔ اوریا مقبول جان کی کالم نگاری میں اسلاموٹوپیا کے رجحانات

ان کے خیالات و افکار منفرد نوعیت کے ہیں۔ طالبان کے افغانستان کے اقتدار پر جلوہ گر ہونے کی صورت میں انھیں اپنے افکار و خیالات کی ایک عملی شکل نظر آنے لگی۔

ابتدائی طور پر "حرفِ راز" کے نام سے ان کے کالم روزنامہ "جنگ" میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ جب کہ مذہبی موضوعات پر مبنی کالم " مجھے ہے حکمِ اذاں" ہفت روزہ "ضربِ مومن" میں چھپتے رہے۔ "ضربِ مومن" ایک اسلامی ہفت روزہ ہے جو افغانستان میں طالبان کی حکومت کے قیام کے بعد ۱۹۹۶ء سے کراچی سے باقاعدگی سے جاری کیا گیا۔

"حرفِ راز" کے نام سے ان کے کالموں کے ۷ مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ اب اسی نام سے وہ حالاتِ حاضرہ کے ایک پروگرام میں بطور میزبان "نیو ٹی وی" پر فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔

ان کی تصانیف درج ذیل ہیں۔

۱۔ "حرفِ راز"، کالموں کے مجموعے، سات ایڈیشن

۲۔ "مجھے ہے حکمِ اذاں" ہفت روزہ "ضربِ مومن" میں شائع ہونے والے کالم، سن اشاعت ۲۰۱۲ء

۳۔ قامت (شعری مجموعہ)

انھوں نے پی ٹی وی کے لیے کئی ڈرامے لکھے جن میں روزن، گرداب، شہر زاد اور قفس شامل ہیں۔ انھیں دو بار بہترین ڈراما نگار کا ایوارڈ آف ڈیکیڈ (Decade) دیا گیا۔ یہ ایوارڈ پہلی بار انہیں ۱۹۹۷ء میں اور دوسرا ۲۰۰۷ء میں ملا۔

وہ زندگی کے متعلق ایک مختلف فلسفہ ءحیات رکھتے ہیں۔ وہ زندگی، حالاتِ زندگی اور سیاسی حالات کو بھی اپنے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے قائل ہیں اور یہ نقطۂ نظر بڑی حد تک اسلام کی ایسی صورت دکھاتا ہے جسے اسلاموٹوپیا کے پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اپنے کالموں میں ماضی کا وہ حوالہ دیتے ہوئے آج کے دور کی جھلک دکھاتے ہیں۔ ان کے کالموں میں نہ صرف تاریخی حوالے اور حالاتِ حاضرہ کا ذکر آتا ہے بلکہ وہ ذاتی زندگی کے واقعات کو بھی افسانہ نگاری ایسے انداز میں رقم کرتے ہیں۔ اپنے کالموں میں وہ قرآن وحدیث اور اسلامی تاریخ سے بکثرت حوالے دیتے ہیں۔

ان کی تحریر و تقریر میں انتہا پسندی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے جس کی مثال افغانستان میں طالبان حکومت کی پُرزور حمایت ہے۔ جس کے باعث ان پر شدت پسندی، بنیاد پرستی اور انتہا پسندی کا لیبل بھی لگایا جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر وہ طالبان کی حکومت کو مثالی اسلامی ریاست قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق افغانستان کی چودہ سو سالہ تاریخ میں طالبان سے بہتر کوئی حکومت نہ تھی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور خلفائے راشدین کے بعد دنیا نے ایسا پُر امن دور نہیں دیکھا۔ ان کے بقول، قندھار سے ایک عورت چلتے ہوئے کابل پہنچتی ہے اور بے فکر ہوتی ہے کہ کوئی اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا ہے، یہ واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت کی یاد دلاتا ہے۔ جب ایک تنہا عورت زیورات سے لدی مدینہ منورہ کا سفر بے خطر کرتی ہے، کیوں کہ عمر رضی اللہ عنہ مسند حکومت پر فائز ہیں جو دریائے نیل پر ایک بکری کے بچے کا بھی خیال رکھتے ہیں تو اس سے کیوں کر غافل ہو سکتے ہیں۔ مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دورِ حکومت مثالی تھا، جب انصاف کا یہ عالم تھا کہ کسی ڈاکو کی جرات نہ تھی کہ نہتی عورت کو بھی نقصان پہنچا سکے۔

اوریا مقبول جان State becomes invisible (ترجمہ: "دنیا کی کامیاب ریاست وہ ہے جو نظر نہ آئے") کا تصور دیتے ہیں۔ جیسا کہ پولیس کا وجود نظر نہ آئے لیکن چوراہے پر کوئی قانون کی خلاف ورزی نہ کرے۔ اوریا مقبول جان کے مطابق طالبان کی حکومت نے ایسا کر دکھایا ہے۔

اوریا مقبول جان کا صحافت کے متعلق بھی ایک مختلف نقطۂ نظر ہے۔ وہ میڈیا کے کردار پر اکثر تنقید کرتے ہیں۔ ان کے مطابق ہمارا میڈیا ایک مغرب زدہ غیر اسلامی معاشرے کی تصویر پیش کرتا ہے۔ نئی نسل کو شعائرِ اسلام پر مبنی طرزِ زندگی نہیں دکھایا جاتا۔ تو پھر اُن سے کس طرح یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ سچے اور باعمل مسلمان بنیں گے۔ اس کے برعکس میڈیا مذہبی لوگوں کو دہشت گرد بنا کر پیش کرتا ہے اور یوں وہ مغرب کے نظریے کو تقویت دینے کا باعث بنتا ہے۔ اوریا مقبول جان میڈیا کے اس کردار کے خلاف ہیں جو

اغیار کی ثقافت کی ترویج کر رہا ہے اور پوری دنیا میں مسلمانوں کی ایسی ہی تصویر کشی کی جا رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسا نصابِ تعلیم اور ایسا میڈیا ہماری آنے والی نسل کو غلط رستے کی طرف لے جا رہا ہے۔ ان کی منزل کا تعین کرنے والے راہزن ہیں، رہنما نہیں۔ اوریا مقبول جان میڈیا کی نسبت کتاب کی اہمیت کے زیادہ قائل ہیں بلکہ ان کا یہ خیال ہے کہ میڈیا کی آزادی کی وجہ سے عظیم شخصیتیں سامنے آنا بند ہو گئی ہیں۔ ان کے مطابق، ہمارا میڈیا سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کرتا ہے۔ وہ حدیثِ نبوی ﷺ کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"دجال کی آمد سے پہلے کے کچھ سال دھوکا اور فریب کے ہوں گے۔ سچے کو جھوٹا اور جھوٹے کو سچا بنا کر پیش کیا جائے گا۔ خائن کو امانت دار اور امین کو خائن بنا کر پیش کیا جائے گا اور، رویبضہ خوب بولے گا۔ عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ رویبضہ کون؟ فرمایا: گھٹیا لوگ جو اہم ترین معاملات پر گفتگو کریں گے۔"(۵)

وہ خود کو بھی ان رویبضہ میں شامل کرتے ہیں جن کے تجزیوں اور بحث و مباحث سے کبھی کوئی سود مند اور مثبت نتائج بر آمد نہیں ہو سکے۔ ان کے خیال میں میڈیا پر کام کرنے والے صحافی رویبضہ ہیں جو حکمرانوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح کام کرتے ہیں اور ان کے مفاد کے لیے لوگوں کو لڑا دیتے ہیں۔ اوریا جان مقبول اپنے دامن کو ان گناہوں سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ سادگی کو اپنے لیے عیب نہیں بلکہ زینت سمجھتے ہیں۔ ان کے متعلق اسلم شیخوپوری شہید نے ان کی کتاب "حرفِ راز" کے دیباچے میں لکھا ہے:

"ایسے لوگ اب جنسِ نایاب کی طرح کم ہوتے ہیں۔ ہیروں اور موتیوں کی طرح انھیں تلاش کرنا پڑتا ہے۔"(۶)

اوریا مقبول جان ان لوگوں میں سے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہر مسلمان کا یہ دینی فریضہ ہے کہ وہ دین کی تبلیغ کرے، اسے حکمِ اذاں ہے۔ جو اُن کے کالم کا عنوان بھی ہے۔ اس لیے ان کے مطابق، لا الہٰ سے لے کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تک اسی حکم کی تعمیل کی مختلف صورتیں ہیں۔ یہ اذان ہر مسلمان کی پیدائش پر دی جاتی ہے۔ جو اس بات کی علامت بھی ہے کہ خالق اپنی مخلوق سے مایوس نہیں ہوا ہے۔ یہ سلسلہء اذان اس وقت جاری رہے گا جب تک توبہ کا دروازہ کھلا رہے گا۔

اوریا مقبول جان مسلمانوں کے عظیم ماضی کو یاد کرتے ہیں، اپنے قارئین کو اسلاف کی عظمت اور ان کے عظیم کارنامے یاد دلاتے ہیں۔ اس طرح وہ نئی نسل کے اندر احساسِ زیاں بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ انھیں احساس ہو کہ وہ کیا کچھ کھو چکے ہیں۔ اب ہم اپنے شاندار ماضی کو تو ہرگز واپس نہیں لا سکتے لیکن

اس احساسِ زیاں کو کم کرنے کے لیے اپنے حال اور مستقبل کو بہتر بنانے کو شش ضرور کرسکتے ہیں۔ وہ اپنے قارئین کو کفار کے مکر و فریب اور ان کی چالوں سے خبر دار کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ کفار کے ہاتھوں میں مسلمانوں کو بہلانے کے لیے مختلف حربے ہیں جن میں معاشی خوش حالی، حقوقِ نسواں اور مغربی جمہوریت شامل ہیں جنھیں وہ نہایت دل کش انداز میں مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے ہوئے ان کا ایمان کمزور کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کے بقول، وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ دنیا اور اس کی لذتوں کی ایک سچے مسلمان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ایک سچا مسلمان جانتا ہے کہ اگر دنیا اور اس کی آسائشوں کی اللہ کے دربار میں ایک مچھر کے پر کے برابر بھی اہمیت ہوتی تو اللہ تعالیٰ کافروں کو دنیا کی ترقی اور اس کی آسائشیں عطا نہ کرتا۔ یہ دنیا ایک سچے مومن کے لیے آزمائش کی جگہ اور عبرت کا مقام ہے اور اس کا مقصد فقط اگلے جہاں کی تیار کرنا ہے۔

مصنف کے بقول مسلمانوں کے ایمان کے حرارت کی گواہی اس سے قبل مکہ کی وادیوں اور کربلا کے ریگ زاروں نے دی ہے اور اب اس گواہی میں عراق اور افغانستان کے ریگستان شامل ہو چکے ہیں جہاں مسلمانوں کا خون پانی سے بھی ارزاں ہو گیا ہے۔ اوریا مقبول جان یہ سمجھتے ہیں کہ جنگ میں ہار جیت تو ہوتی رہتی ہے لیکن اگر کفر و ایمان کی اس جنگ میں مسلمان اپنی روایات، تہذیب اور اقدار سے منہ موڑتے ہیں تو بے شک یہ نقصان کا سودا ہے اور آج کی جنگ تہذیبوں اور روایات کی جنگ ہے۔ مسلمان مغرب کی تہذیب اور ان کی روایات سے مرعوب نظر آتے ہیں، وہ اپنے اسلاف کی روایات اور اسلام کی تعلیمات کو بھلا چکے ہیں اور مغرب کی مادر پدر آزادی نے انہیں مرعوب و مرغوب کرر کھا ہے۔

وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس علیٰحدہ شناخت، مختلف رنگ و نسل اور جداگانہ مذہب کی اساس رکھنے والے لوگ ایک ملت واحدہ کے طور پر متحد ہو گئے ہیں۔

اوریا مقبول جان کے نزدیک مسلم اُمہ کو اس کے فرائض کی نشان کرنا اور یاد دلانا ان کی ذمہ داری میں شامل ہے کیونکہ تہذیبوں کی اس جنگ میں اپنی اساس، اپنی اقدار اور دین کی حرمت کی حفاظت قلم کی ذمہ داری بن جاتی ہے۔ ان کے نزدیک، تحریر و تقریر کی مدد سے یہ جنگ لڑی جاسکتی ہے اور یہ اللہ کا خاص فضل و کرم اور مہربانی ہے کہ کسے وہ اس نیک کام کی توفیق دیتا ہے۔

اوریا مقبول جان کی کالم نگاری پر جس مخصوص نقطۂ نظر اور انداز کی چھاپ نظر آتی ہے، اسے اسلاموٹوپیا کا رجحان کہا جاسکتا ہے۔ زندگی اور اسلام کے متعلق ان کا مخصوص نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ اوریا مقبول جان اتحاد بین المسلمین (Pan Islamism) کے حامی نظر آتے ہیں۔ اپنی نظم "خضرراہ" میں علامہ اقبال بھی اسی صورت حال کا ذکر کرتے نظر آتے ہیں:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

اوریا مقبول جان اکثر اپنے کالموں میں ماضی پرستی (Nostalgia) کا شکار نظر آتے ہیں اور عصرِ حاضر کے تمام مسائل کا حل اسلام کی بنیادی تعلیمات میں دیکھتے ہیں۔ اوریا مقبول جان کے نزدیک مغرب کی سازشوں کا جواب اسلام کے طرزِ عمل پر عمل پیرا ہونے میں ہے۔ ریاستِ مدینہ کا خواب دیکھتے ہوئے وہ آج کے دور میں اس کی عملی شکل طالبان کے دورِ حکومت میں دیکھتے ہیں جو اُن کے نزدیک ملکی انتظام و انصرام کی بہترین مثال ہے۔ اپنے کالم " نظامِ تعلیم کا بحران! تیری بربادیوں کے مشورے" میں انھوں نے مغرب کی چالوں کا اس انداز میں ذکر کیا ہے:

"یہ کالا پانی جیسی سزائیں برداشت کرتے ہیں، تنگ آکر ہجرت کرتے ہیں لیکن اپنا مذہب نہیں چھوڑتے۔ اس زمانے کے نو آبادیاتی حاکم اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر مسلمان ملکوں میں ایک ایسا تعلیمی نظام رائج کر دیا جائے جو ان سے ان کے اپنے اسلاف اور اپنی اقدار کی محبت چھین لے تو پھر ان کی آئندہ نسلیں ایسی ہوں گی جن کے نام تو مسلمانوں جیسے ہوں گے لیکن جن کے ہیروز، حق کے معیارات، جن کی زندگی گزارنے کے طریقے سب ہمارے جیسے ہوں گے۔ ان کو دو کمروں کے کچے مکان میں رہ کر آدھی دنیا پر حکمرانی کرنے والے فاروقِ اعظم کا کردار اچھا نہیں لگے گا بلکہ وہ سیزر کی کہانیوں اور نپولین کے قصوں کو یاد کریں گے۔"(۷)

اس کالم میں کالم نگار نے اپنے تئیں اغیار کی سازشوں کو بے نقاب کیا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگرچہ مسلمان اس وقت معاشی لحاظ سے پسماندگی کا شکار ہیں لیکن اہلِ مغرب اگر کسی بات سے خوف زدہ ہیں تو وہ مسلمانوں کا جذبہء حریت اور ان کا جذبہء ایمانی ہے۔ وہ آج تک صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں صلیبی جنگوں کی شکست کا زخم نہیں بھولے ہیں بلکہ آج بھی اس زخم کو چاٹ رہے ہیں اور مسلمانوں سے اس شکست کا بدلہ لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے مطابق، مغرب کی سازش کے تحت ہمارے تعلیمی اداروں میں مغربی مصنفین

اور نظریہ سازوں کے خیالات کو پڑھایا جاتا ہے۔ ہمارے اسلاف کی تعلیم کا ایک وسیع ذخیرہ مغرب کی لائبریریوں میں مغربی مفکرین کے ناموں سے پڑا ہوا ہے اور ہم ان کے مصنفین کی تقلید و تعریف میں مصروف ہیں۔ یوں مغرب نے نہ صرف ہم سے تہذیب بلکہ ہم سے ہمارا تہذیبی ورثہ بھی چھین لیا ہے۔ اوریا مقبول جان کو ملک کے تعلیمی نظام سے بھی شکایت ہے۔

وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے تعلیمی ادارے گزشتہ کئی برسوں سے اس راستے کو آسان کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جہاں پڑھنے والوں کی ساری نگاہیں آکسفورڈ سے کیمبرج تک اور کولمبیا سے برکلے تک مرکوز ہیں۔ ہماری آنے والی نسلیں صوفی تبسم، اسماعیل میرٹھی اور الطاف حسین حالیؔ کی نظموں کے بجائے نرسری (Rhymes) کی گود میں پروان چڑھ رہی ہیں۔ اس سارے نظام کو گزشتہ تین سال کی مغرب زدہ حکومت نے اپنے اور اپنے آقاؤں کے منصوبے کے مطابق آگے بڑھانے کی کوشش کی اور یہ ایجنڈا کوئی خفیہ نہ تھا۔ اب اس ماحول میں پروان چڑھنے والی نسل سے ہم کیسے اسلام اور اُس کے اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی توقع کر سکتے ہیں اور یہ سوال اوریا مقبول جان کا ہے۔

اوریا کے مطابق یہ تعلیمی نظام طبقاتی تقسیم کو فروغ دے گا۔ یوں یہ طبقاتی فرق مسلم معاشرے میں مزید بڑھتا چلا جائے گا۔ جب کہ اس کے مقابل اسلام ازم یا اسلاموٹوپیا کے تحت ایک ایسی فلاحی ریاست کا تصور دیتا ہے جس میں لوگوں کو بلا تفریق رنگ و نسل تمام بنیادی سہولتیں حاصل ہوں گی جن میں صحت، تعلیم، پانی، بجلی وغیرہ شامل ہیں۔

اس کی مزید وضاحت ہمیں ان کے کالم "محبِ وطن کے لوگوں سے ایک سوال" میں نظر آتی ہے۔

> "انھیں علم تھا کہ ایسے ہی بوریا نشین اسکولوں سے بو علی سینا نے جنم لیا تو یورپی دنیا میں طب کا باب کھلا، جابر بن حیان پیدا ہوا تو سائنس کی راہیں متعیّن ہوئیں۔ ابنِ الہیثم نے علم حاصل کیا تو ریاضی کے اصول متین ہوئے اور آج دنیا کی کوئی ماڈرن سے ماڈرن یونیورسٹی علوم کی اس سیڑھی پر قدم رکھے بغیر آگے بڑھ نہیں سکتی۔ ۱۰۰ سال پہلے اس ملک کو ایک بے سروپا نظامِ تعلیم دینے والے ایک بار پھر اسی مسلمان قوم کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ جن کے نصاب کی کتابوں میں ڈھونڈنے سے بھی صدیقِ اکبر کی صداقت کا تذکرہ نہ مل سکے۔"[۸]

اس کالم میں اسلاموٹوپیا کے منشور کی وضاحت نظر آتی ہے جس کے مطابق مغرب ہمارے آبا کی ایجادات سے فائدہ بھی اٹھاتا ہے اور ان کا احسان مند بھی نظر نہیں آتا۔ اس کالم میں کالم نگار عظیم ماضی کی

مثال دینے کے بعد مستقبل کے اندیشوں کا ذکر کرتے ہیں۔ یہاں ماضی پرستی یاNostalgiaیوٹوپیا بن جاتا ہے کیونکہ جب وہ اس شاندار ماضی کو واپس لانے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں اور مسلمانوں کے اسی عروج کو حال اور مستقبل میں دوبارہ دیکھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں تو ان کی یہ خواہش ان کے یوٹوپیا کو ظاہر کرتی ہے۔ چونکہ یوٹوپیا سے مراد ایک ایسی جنتِ ارضی ہے جو مثالی ہونے کے ساتھ ناپید ہے۔ اس کا وجود اس دنیا میں نہیں ہو سکتا، یہ ناممکنات میں شامل ہے اور مصنف کی یہ خواہش بھی بظاہر ناممکنات میں نظر آتی ہے۔ لیکن اس صورتِ حال میں وہ مستقبل کی جو تصویر پیش کرتے ہیں، وہ ڈسٹوپیا کی ترجمانی کرتی ہے جس میں وہ اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہیں جو انھیں لاحق ہیں اور ان کے گمان کے مطابق یہ عوامل مسلمانوں کے مستقبل کو دھندلا کریں گے۔ مصنف مسلمانوں کے شاندار ماضی میں کھو جاتا ہے، جب ان کا جذبۂ ایمانی طاقت ور تھا، ان کے افعال واعمال میں ان کے جذبے کی جھلک نظر آتی تھی۔ وہ ایمان کے پہلے دو درجوں پر فائز تھے، جب وہ برائی کو ہاتھ اور زبان سے روکنے کی کوشش کرتے تھے۔

اوریا مقبول جان کے نزدیک ہمارا مذہب اور اس پر استوار نظامِ تعلیم و نظریہ ءحیات سب ایک مثالی ریاست کی تشکیل میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ایک ایسی ریاست جو صحیح معنوں میں فلاحی ہو اور اس فلاحی ریاست میں زیر تعلیم طالب علم ملک و قوم کا نقشہ تبدیل کریں گے۔ کالم نگار کے مطابق دہشت گرد کا لیبل مغرب مسلمانوں پر لگاتا ہے جب کہ جرم و دہشت کی یہ نرسریاں تو خود مغرب کی تیار کردہ ہیں اور بنیاد پرستی کا آغاز بھی مغرب سے ہوا لیکن چوں کہ مغرب مالی وسائل کے لحاظ سے برتری رکھتا ہے، دنیا پر اس کی حکومت ہے اس لیے ان کے اداروں کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہیں کی جاتی۔ یہی اسلاموٹوپیا کا بنیادی تصور ہے۔ اس کے برعکس اسلامی تعلیمی ادارے نہ صرف طالب علموں کو دنیاوی تعلیم دیتے ہیں بلکہ ان کی اخلاقی تربیت بھی کرتے ہیں۔ یہاں وہ پھر سے ماضی کے پردوں میں پرانی درس گاہوں کا عروج اور تمکنت یاد کرتے ہیں جہاں روز شام کو مغرب کی نماز کے بعد کوئی معصوم طالب علم دروازے کی گھنٹی بجاتا ہے۔

کالم نگار ان طالب علموں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے بلکہ اگر انھیں خراجِ تحسین پیش کرتا ہے جنھوں نے نامساعد حالات میں بھی حصولِ تعلیم سے دست برداری اختیار نہیں کی۔ ان کے بقول، ہمارے عظیم ماضی نے تاریخ کو ابن الہیثم، جابر بن حیان اور بو علی سینا جیسے سائنس دان دیے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ہماری نئی نسل اپنے اسلاف کے کارناموں اور عظمتِ رفتہ سے ناواقف اور نابلد ہے۔ اب ضرورت اس امر کی

ہے کہ ان کے اندر اسلاف سے محبت اور تاریخ پر فخر کا جذبہ ابھارا جائے۔ اس کے لیے بقول مصنف، سب سے بہترین کام ہمارا میڈیا ہی سر انجام دے سکتا ہے۔

مصنف نے مذکورہ بالا کالم میں عورتوں کی مادر پدر آزادی کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری تعلیم یافتہ عورت یہ سمجھتی ہے کہ مغرب میں عورت کو تمام حقوق حاصل ہیں، وہ اس کی زندگی کو باعثِ تقلید سمجھتی ہے لیکن وہ حقیقت سے بے خبر ہے۔ اوریا مقبول جان کے نزدیک نہ صرف مغرب بلکہ ہندوستان جو ایک ہندو معاشرہ ہے، اس میں بھی عورت کا استحصال ہوتا ہے، اس پر جنسی تشدد ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مذہبِ اسلام نے عورت کو باعزت زندگی گزارنے کا حق عطا کیا۔ اسلام نے عورتوں کو ناحق قتل ہونے سے بچایا۔ اسلامی معاشرے میں عورت کو بحیثیت ماں، بیوی اور بیٹی عزت دی جاتی ہے۔ اس کے محرم رشتے اس کے محافظ ہیں۔ اپنے کالم "لو وہ بھی کہہ رہے ہیں" میں کالم نگار نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> "آپ ﷺ نے زندگی بھر صرف تین عورتوں کی تکریم میں چادر بچھائی تاکہ وہ اس پر بیٹھ سکیں۔ حیرت ہے ہمیں طعنہ وہ لوگ دیتے ہیں جن کی مائیں، بوڑھوں کے اداروں میں تنہا دم توڑ دیتی ہیں جب کہ آج بھی ہماری مائیں اپنے بیٹوں کے کندھوں پر قبرستان پہنچتی ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میں اس آقا ﷺ کی ملت سے ہوں جو عورت کو مساوی حق نہیں دیتا بلکہ اس پر مردوں کے مقابل میں زیادہ متعصف ہیں۔"(۹)

اوریا مقبول جان نے تانیثی یوٹوپیا(Feminist-utopia) کے تناظر میں اسلام کی تعلیمات اور عورت کے مقام کو پیش کیا ہے۔ مصنف کے نزدیک مغرب کے استحصال زدہ معاشرے میں عورت کو جس لذت اور تسکین کی علامت بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ یوں اسلامو ٹوپیا پر مبنی اسلامی ریاست میں عورت کے کردار اور مقام کو واضح کیا ہے۔

کالم نگار اپنے تئیں مغرب کے روشن خیال، مہذب اور مادر پدر آزاد معاشرے کی اندرونی کہانی منظرِ عام پر لاتے ہیں جس میں عورت آزاد ہے لیکن در حقیقت یہ نظام اسے اس کے تخلیقی حق سے محروم کر رہا ہے۔ اپنی نسل کا تسلسل اور اولاد کی خواہش ہر عورت کا فطری حق ہے لیکن مادیت پرستی کے اس دور میں وہ اس بنیادی حق سے لطف اندوز ہی نہیں ہو سکتی ہے۔ یوں اسے بنیادی حق سے محروم رکھ کر، اسے بنجر کر کے یہ بے حِس معاشرہ اپنی ترقی کی بنیاد رکھتا ہے۔ لیکن یہ اس حقیقت کو فراموش کر چکا ہے کہ خوشی، ترقی، اطمینان

اور سکون صرف فطرت سے جڑے رہنے میں ہی ہے۔اس سے انکار کر کے انسان صرف بے چینی اور اضطراب ہی پاتا ہے۔

کالم نگار کا یوٹوپیا ریاستِ مدینہ ہے یا پھر ایسی مملکت جس کا انتظام و انصرام اسلام کے زریں اصولوں پر قائم ہے۔ موجودہ دور میں افغانستان میں طالبان کی حکومت چونکہ خلافتِ اسلامی کی یاد تازہ کرتی ہے، اس لیے وہ اسے اسلامو ٹوپیا کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق موجودہ دور میں اسلام کی تعلیمات کی اس سے زیادہ عملی صورت ممکن نہیں ہے۔[۱]کچھ لوگ اس طرزِ حکومت پہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ اسلامی قوانین میں سزائیں بہت سخت ہیں جس کے جواب میں کالم نگار نے اپنے ایک کالم "کوا چلا ہنس کی چال" میں اس تاریخی واقعہ کا حوالہ دیا ہے جب حجاج بن یوسف جو اپنی سخت گیر طرزِ حکومت کے باعث شہرت رکھتے ہیں، ایک مقدمے کے فیصلے میں انھیں مجرم پر رحم آیا جس پر انھوں نے حضور ﷺ کا ایک فیصلہ یاد کیا تو انھوں نے مجرم کو سنگسار کرنے کا حکم دیا تھا۔ حضور ﷺ سے زیادہ رحم دل کوئی نہیں ہے لیکن قوانین پہ سختی سے عمل کرنا اسلامی مملکت کے قیام کے لیے بہت ضروری ہے۔ اپنے مذکورہ بالا کالم "کوا چلا ہنس کی چال" میں وہ اس مثالی طرزِ حکومت، جو کالم نگار کا یوٹوپیا ہے، کی تصویر یوں پیش کرتے ہیں:

> "میں عالمِ حیرت میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ یہ کوئی ہزاروں سال پہلے کی بات نہیں، صرف ۱۵ سال پہلے سٹیشن سے چند میل دور مکیار گاؤں کا قصبہ ہے۔ اس قتل کا مقدمہ میری عدالت میں ایک سال سے چل رہا تھا۔ بندوق سے مسلح افراد، کالے کوٹوں میں ملبوس وکیل عدالت کے احاطے میں جمع ہوتے اور امن و امان نافذ کرنے والوں کی جان پر بنی ہوتی ہے۔ جرگہ بیٹھا تو پھر نہ قانونِ شہادت کی کتابیں کھلیں اور نہ PLD کے صفحات اُلٹے گئے، نہ جھوٹے گواہ تیار ہوئے اور نہ دوسرے فریق کو عدالت کے احاطے میں قتل کرنے کوشش ہوئی۔ ٹھیک دس سال بعد جب میں نے امریکا کی ریاست ٹیکساس کے شہر آئین کی سٹی کونسل کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا تو وہاں موجود کونسلروں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایک خاتون نے کھڑے ہو کر کہا: Where is that heaven? (یہ جنت کہاں ہے) "[(۱۰)]

اوریا مقبول جان حکومتی مشینری کے اہم پرزہ رہے ہیں لیکن وہ نہایت صاف گوئی سے پاکستانی نظامِ عدل کی کمزوریاں بیان کرتے ہیں۔ وہ طالبان کے اسلامی نظامِ حکومت کی تعریف کرتے ہیں کہ یہ اسلامی

۱۔ حافظ ابن حجر عسقلانی، تہذیب التہذیب، جلد ہفتم، ۲۲۶

قوانین کا ہی طرۂ امتیاز ہے جو قاتل کو سزا کا حکم دینے کے ساتھ معاف کرنے والے کے لیے بڑے اجر کا وعدہ کرتا ہے۔ ان کے مطابق ایسا اس لیے ہے کہ اس آگ کو ٹھنڈا کرنے والے اور عفو و درگزر کی بات کرنے والے نہ انگریزی جانتے ہیں اور نہ قانون کی موٹی موٹی کتابوں سے آشنا ہیں۔

کالم نگار نے اس طرزِ حکومت کو سنہری دور سے تعبیر کیا ہے جس میں نہ جھوٹے گواہ پیش ہوتے ہیں نہ وکیل غلط کو درست اور درست کو غلط پیش کرنے کے لیے بھاری معاوضہ وصول کرتے ہیں بلکہ Talk of Town ہی Talk of court ہوتی ہے۔ یہ ہی ان کا یوٹوپیا ہے۔ ایک مکمل مثالی ریاست جو یوٹوپیا کی تعریف پہ پوری اترتی ہے۔ چوں کہ یوٹوپیا سے مراد ایسی جگہ ہے جو بیک وقت اچھی اور ناپید ہو اور طالبان کی حکومت جو ایک بار امریکا کے حملے کے باعث اپنا وجود کھو چکی تھی۔ گو کہ حال ہی میں ان کی حکومت پھر افغانستان پر قائم ہو چکی ہے لیکن اب تک اس کے بارے میں مجموعی طور پر کوئی مثبت رائے سامنے نہیں آئی۔

اپنے ایک اور کالم "یہ کیسے لوگ تھے؟" میں کالم نگار نے اپنے یوٹوپیا کی وضاحت میں انگلستان کی یونیورسٹی بوم برگ کے پروفیسر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ گزشتہ ہفتے انگلستان کی یونیورسٹی بوم برگ کے پروفیسر گراہم فیسرل نے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اس نے اپنی تحقیقات منظر عام پر لاتے ہوئے کہا ہے کہ: منشیات کے کنٹرول کے لیے دنیا میں سب سے بہترین ماڈل طالبان نے پیش کیا۔ یہ صرف ان مذہبی رہنماؤں جنھیں لوگ مسجد کا ملا کہتے ہیں، کی ترغیب اور اثر و رسوخ سے ممکن ہوا ہے۔ وہ جن کے بیان میں اس لیے جادو تھا کہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اگر ان کا بھائی یا بیٹا بھی افیون اگانے کا مرتکب ہو تو وہ بھی سزا سے نہیں بچ پائے گا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ طالبان اپنے نفع و نقصان کی پروا کیے بغیر سنتِ نبوی پر عمل پیرا ہیں۔ ان کا طرزِ عمل دیکھ کر ذہن میں اس واقعے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جب مدینہ منورہ کی ریاست اسلام کے عظیم حکمران نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ نے قبیلہ بنو اسد کی عورت فاطمہ کو سزا سے بچانے کے لیے سفارش کرنے والوں سے یہ کہا تھا کہ اگر اس کی جگہ میری بیٹی فاطمہ بنت محمد ﷺ بھی ہوتی تو سزا سے نہ بچ پاتی۔

ایسے ہی عظیم رویے اور انصاف کے تقاضے ہوتے ہیں جو کسی مملکت کو مثالی ریاست کی صورت میں بدل دیتے ہیں۔ اوریا مقبول جان نئی نسل کو اپنے کالموں کے ذریعے آگاہی دیتے ہوئے ان کا ماضی یاد دلاتے ہیں۔ جب مسلمان علم و حکمت میں سب سے آگے تھے تو وہ دنیا پر حکومت کرتے تھے۔ یہ کالم نگار کا ناسٹلجیا یا ماضی پرستی ہے جو انھیں آج کے دور سے اُس شاندار عہدِ رفتہ میں لے جاتا ہے جب مسلمانوں کا عروج تھا۔ اس لیے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی بھی علم کی تاریخ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اس میں مسلمانوں کا ناقابلِ

فراموش حصہ نظر آتا ہے۔ سائنس، فلسفہ، طب، فلکیات اور ریاضی، ان تمام علوم کے ماہر بغداد میں یوں جمع تھے گویا آسمان پر چمکتے ستارے لیکن اہلِ یورپ نے ان کے علمی خزانوں کو نذرِ آتش اور دریابرد کر دیا اور ان کی علمی فتوحات کو خود اپنے نام سے منظرِ عام پر لے آئے۔ انھوں نے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا۔ بغداد کے سب سے بڑے کتب خانے کو آگ لگا دی گئی جس کی راکھ سے دریائے دجلہ کا پانی کئی دنوں تک کالا رہا۔

اوریا مقبول جان کے اکثر کالم مغرب کے اس متعصب رویے کو بے نقاب کرتے ہیں جو امتِ مسلمہ کے زوال کا باعث بنے۔ ان کے نزدیک آج بھی یہ استعماری طاقت نو آبادیات (colonization) کے نام پر امتِ مسلمہ کے وسائل پر قابض ہے اور انھیں ذہنی اور جسمانی دونوں طرح سے زچ کرنے کے درپئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ کبھی مسلمانوں کے ساتھی نہیں ہو سکتے۔ آیتِ مبارکہ ہے، ترجمہ: ہنود و یہود کبھی تمہارے دوست نہیں بن سکتے ہیں۔"[1] وہ مثال دیتے ہیں کہ یہی کچھ ترکی میں ہوا۔ ایک سیکولر شخص ملک پر قابض ہو گیا جو ترک مسلمانوں کی غیرت اور حیا کو ختم کرنے کے درپئے ہے۔ اپنے ایک کالم "حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے" میں کالم نگار اس صورتِ حال پر اپنی رائے یوں دی ہے۔

> "جمعہ کے خطبہ کو ترکی کی زبان میں دینے کا حکم دیا گیا اور اذان بھی ترکی میں دینے کے احکام صادر کیے گئے۔ جس اسمبلی میں قرارداد پاس ہو رہی تھی وہاں ایک غیرت مند مسلمان ممبر نے مائیک پر "اللہ اکبر" کی صدا بلند کی تو اسے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ دوسرا اٹھا اور اس نے اذان کو آگے بڑھایا۔ اسے بھی گولی کا سامنا کرنا پڑا۔ یوں سات راسخ العقیدہ مسلمان ممبران اسمبلی نے اپنی جانوں کا نذرانہ دے کر اسمبلی کے فلور پر اذان دی۔"[11]

کالم نگار نے ترکوں کے اس عظیم الشان جذبہء ایمانی کی مثال دی ہے جس کا مظاہرہ انھوں نے صلیبی جنگوں کے دوران بھی کیا تھا۔ کالم نگار کے نزدیک اسلاموٹوپیا پر مبنی ریاست کا وجود دراصل ایک ایسی نظریاتی مملکت ہے جس کی بنیاد اسلامی قوانین پر کسی حد تک لیکن جذبہء ایمانی پر زیادہ ہے۔ کیوں کہ یہ وہ جذبہ ہے جس کی بنا پر ان صیہونی قوتوں کو زیر کیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلاموٹوپیا کے متعلق اوریا مقبول جان کا نقطہء نظر شدت پسندانہ اور جذباتی نوعیت کا ہے۔ قبل ازیں اسلاموٹوپیا کی وضاحت میں ذکر کیا گیا ہے کہ اسلاموٹوپیا کی بنیاد جدت پسندی اور تغیر پسندی میں ہے لیکن اوریا مقبول جان کے نزدیک ایمان کی کمزوری کے باعث آج مسلمان زبوں حالی کا شکار ہیں۔ اس موجودہ ڈسٹوپیا سے نکلنے کے لیے ایک لہو کو

۱۔ سورۃ المائدۃ: ۸۲/ ۵

گرماتی انقلابی سوچ کی ضرورت ہے جس کا ذکر مولانا ظفر علی خان نے کیا ہے اور جس کے فقدان پر کالم نگار نوحہ کناں ہیں۔ کیوں کہ ان کے نزدیک یہی وہ سوچ ولولہ اور جذبہ تھا جو ریاستِ مدینہ کی تشکیل اور بعد ازاں خلافتِ راشدہ کی بنیادی ستون بنا۔ آج اسی جذبہ ءایمانی، اسی غیرت اور حمیت کی رخصتی نے ہمیں یہ دن دکھائے ہیں کہ ہم جن پر صدیوں سے حاکم رہے، آج انھی کی نظر التفات کے منتظر ہیں۔ بقول مولانا ظفر علی خان:

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

اسلاموٹوپیا کے مضبوط داعی ہونے کی حیثیت سے اوریا مقبول جان اسلاموفوبیا کے رجحان کی شدت اور اس کے مضر اثرات سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ وہ جابجا اپنے کالموں میں اس کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ جس کا بنیادی مقصد امتِ مسلمہ کو ان خطرات سے آگاہ کرنا ہے جنھیں اس ڈر اور خوف میں مبتلا لوگ پہچان نہیں سکتے ہیں۔ اپنے کالم "خوف زدہ یورپ" میں انھوں نے اوریانا فلاچی کے اسلاموفوبیا کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "خوف زدہ فلاچی نے اس کتاب میں یورپ کے حکمرانوں کو نااہل اور نیند میں ڈوبے ہوئے کہا ہے کیوں کہ انھیں اندازہ نہیں کہ پورا یورپ آہستہ آہستہ اور خاموشی کے ساتھ "اسلامی کالونی" بنتا جارہا ہے اور ایک دن یہ یورپ نہیں" یوروبیان" ہو جائے گا۔ اس نے اپنے ہزاروں پڑھنے والوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے علاقوں، شہروں اور محلوں میں مسلمانوں کا پیچھا کریں اور انھیں یورپ سے نکال دیں ورنہ وہ ایک دن اپنے ہی ملک میں اجنبی ہو جائیں گے۔ اس کتاب کو اس وقت کی اٹلی کی موجودہ حکومت کے گروپ ناردرن لیگ کے کارکن اپنے تقریروں، مباحثوں اور گفتگو میں موضوع بنائے ہوئے ہیں۔"[۱۲]

یہ کالم نگار کا یوٹوپیا ہے جو اوریانا فلاچی کو یوروبیا کی شکل میں نظر آرہا ہے۔ اوریانا فلاچی ایک شدت پسند عیسائی صحافی اور مصنفہ رہی ہے۔ جس کا تعلق روم سے تھا۔ وہ اسلاموفوبیا کے پھیلاؤ کے حوالے سے کافی شہرت رکھتی ہے۔ اس کی چار کتابیں جن کا موضوع اسلام مخالف نظریات کی ترویج ہے، ہاتھوں ہاتھ بک چکی ہیں۔ اس کے خوف کی بنیادی وجہ دراصل دنیا کے بدلتے ہوئے نقشے کا پس منظر ہے۔

اگر اسلامی فلاحی ریاست کا خواب کالم نگار کا یوٹوپیا ہے تو موجودہ صورتِ حال میں غیر مسلموں کی منافقت، بربریت اور اسلام دشمنی کا پردہ چاک کرنا بھی ان کا مقصد ہے یا دوسرے لفظوں میں مغرب کے

اسلاموفوبیا کو دنیا کے سامنے لانا مصنف کا اہم منشا ہے۔ مصنف کو اس بات کا بھی دکھ ہے کہ مسلمان ممالک مغربی قوتوں کے ساتھ ایک مصالحت آمیز رویہ روا رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے مطابق ضرورت اس امر کی ہے کہ وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے مسلمان ممالک خود کو اندرونی اور بیرونی دونوں لحاظ سے مستحکم کریں۔ اس وقت Pan-Islamism کی شدید ضرورت ہے۔ مسلمانوں کو ایک ایسے پلیٹ فارم پر متحد ہونا چاہیئے جہاں سے ان کی آواز کو دنیائے عالم میں سنا جائے اور اسے اہمیت دی جائے۔ مسلمانوں کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے متحد کرنا "بین الاخوان مسلمین" کے منشور کا بنیادی حصہ ہے اور یہی تجویز کالم نگار نے اپنے کالموں میں دے کر اس کے منشور کی پیروی کی ہے۔ کالم نگار نے جہاں مسلمانوں کے روشن ماضی کو بطور ناسٹلجیا پیش کیا ہے، وہیں غیر مسلموں کی صلیبی جنگوں میں شکست اور اس شکست کا انتقام جس کو یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی زندگیوں کا مقصد بنالیا ہے، کو بھی پیش کیا ہے۔ اس کا اعتراف صدر بش نے عراق اور افغانستان پر حملہ کرتے ہوئے کیا تھا۔ جنگ کے بعد مسلمان قیدیوں کے ساتھ جس قدر سفاکانہ سلوک کیا گیا، اسے نہایت دکھ اور درد سے بیان کیا گیا ہے۔

وہ اپنے مخصوص طرزِ بیان میں کہتے ہیں کہ بات صرف یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ کچھ ظلم و ستم تو ایسے ہیں جن کو ذکر کرنے کا نہ تو زبان کو یارا ہے اور نہ قلم میں اتنا حوصلہ ہے اور نہ دل میں اتنی طاقت۔ آنسو جو اس عالم بے بسی میں آنکھ سے جاری ہوتے ہیں لیکن اس وقت ان آنسوؤں کی شدت سے غصہ اور نفرت ظاہر ہوتی ہے۔ جب انسانیت کے ان قاتلوں کو مسلمانوں کی سرزمین، اپنی مٹی پر جہازوں سے اترتے استقبالیہ وصول کرتے، اکٹھی پریس کانفرنسیں کرتے اور مسکراتے ہوئے ہاتھ ملاتے دیکھا جاتا ہے۔ ظلم پر خاموش رہنے کے جرم پر تو تاریخ شاہد ہے کہ اللہ نے کسی قوم کو معاف نہیں۔

کالم نگار عصرِ حاضر میں طالبان کی حکومت کی مثال بھی جابجا اپنے کالموں میں دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں اگر یہی طرزِ حکومت باقی اسلامی ممالک بھی نافذ کریں تو عصرِ حاضر کے تمام مسائل حل ہو سکیں گے اور مسلمانوں کو اپنی کھوئی ہوئی عزت اور وقار بھی دوبارہ مل سکے گا۔ ان کے نزدیک اسلامی ریاست مدینہ اور خلافتِ راشدہ عدل و انصاف کی اعلیٰ مثال ہیں جن کی گواہی تاریخ میں درج ہے۔ آج بھی زمانہ ایسے منصف مزاج کی تلاش میں ہے جن کے دورِ حکومت سے انصاف کی خوشبو آتی ہے۔ مسلمانوں کو ان کی عظمتِ رفتہ کی یاد دلانا اور ان کو یہ بات باور کرانا کہ وہ کوئی گری پڑی چیز نہیں ہیں، اہم ہے۔ ان کے آباؤ اجداد نے علم الحیات، علم الکیمیا اور علم الجبرا کی بنیاد رکھی تھی۔ اگر آج بھی مسلمان علم کی شمع سے محبت کرتے ہیں تو وہ خود

کو مستحکم اور آزاد بناسکتے ہیں۔ اسلاموفوبیا (یعنی کفار کا مسلمانوں کے عروج اور ان کی ذات سے خوف) کے موضوع کو علامہ اقبال نے بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ اسی خوف کی طرف ڈاکٹر علامہ اقبال نے اپنی نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں اشارہ کیا تھا:

ہے اگر مجھ کو خطرہ کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

اس نظم میں اقبال نے یہودیوں کی اس تنظیم کی پیش گوئی کی ہے جس کا نام Neo-cons ہے۔ یہ ۵۰ افراد پر مشتمل ایک ٹولہ ہے۔ جو یہودیوں کا بہی خواہ ہے اس کا بنیادی نظریہ اسرائیل کا تحفظ ہے۔ اس کا چیئرمین رچرڈ ہرل ہے جس کو امریکا میں "تاریکی کا شہزادہ" کہا جاتا ہے۔

اس اسلاموفوبیا کا ذکر کالم نگار نے اپنے کالم "ریت کی بوریاں" میں کچھ اس انداز سے کیا ہے:

> "کمیونزم کے خلاف پروپیگنڈا کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج اس کی تحریک چلانے والے اور اس نام سے سیاسی پارٹی بنانے والے دنیا سے تقریباً ناپید ہو چکے ہیں جب کہ جس دن سے امریکا نے مسلمانوں کے خلف پروپیگنڈا مہم کا آغاز کیا ہے، ایک جانب تو امریکا میں لوگوں میں اسلام کے مطالعے کا رجحان بڑھ رہا ہے اور دوسری جانب اسلام قبول کرنے والوں میں اضافہ ہوا ہے۔"(۱۳)

اس بابت ان کا مزید کہنا ہے کہ اسلاموفوبیا میں مبتلا ان لوگوں نے مسلمانوں کو تقسیم کرنے کے لیے تین منصوبے بنائے ہیں جن کی بنا پر یہ مسلمانوں کے درمیان باہم نفرت اور اختلافات کو پروان چڑھا سکیں گے۔ اس میں سب سے اہم مسلمانوں کے اندر شیعہ سنی اختلافات کا فروغ ہے۔ دوسرا عربی اور عجمی کی تقسیم یا تفاخر ہے اور تیسرا قبائلی نسلی اور علاقائی تقسیم ہے۔ ان ہتھیاروں کو پہلے برطانیہ نے استعمال کیا تھا اور اب امریکا کر رہا ہے۔ اسلام کے خوف اور جاہ وجلال کا اصل مظاہرہ امریکی فوج نے افغانستان میں دیکھ ہی لیا ہے۔ جھوٹ اور مکاری، خود فریبی اور خود ستائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ لوگ پوری دنیا کے سامنے اپنی فتح کا جشن منا رہے ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے زخم چاٹ رہے ہیں۔ یہی وہ ناکامی ہے جس کی وجہ سے امریکا نے افغانستان سے اپنی فوج واپس بلانے کا اعلان کر دیا۔ اس لیے کہ وہ اپنی فوج کو مزید فوبیا اور ہسٹیریا میں مبتلا ہونے کا نقصان برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کالم نگار نے اس واقعے کو اسلام کی تعلیمات اور طالبان حکومت کی عظیم الشان فتح قرار دیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ، ابھی بھی میرے ملک کے عظیم دانشور اور دنیا کے ماہر تجزیہ نگار اسے

پشتون قوم کی تاریخ اور ان کے نسلی کردار کی فتح قرار دیتے ہیں۔ کوئی اس پہ قوتِ ایمانی اور اللہ پر بھروسے سے جنگ جیتنے کی بات نہیں کرتا لیکن انھیں اس بات کی حقیقت کا شاید علم ہی نہیں کہ پشتون قوم میں اسلام اس قدر راسخ ہے کہ وہ اس کی ثقافت کا حصہ بن چکا ہے۔ ایک پشتون کسی کو یہ طعنہ نہیں دیتا کہ تم کیسا مسلمان ہے کہ نماز نہیں پڑھتا بلکہ کہتا ہے تم کیسا پشتون ہے کہ نماز نہیں پڑھتا ہے۔ اگر بحیثیت نسل ایسا تعلق اللہ سے جڑ جائے تو ایسی قوم کو کون شکست دے سکتا ہے؟ وہ مزید لکھتے ہیں کہ یہ واقعی میرے اللہ کا حکم ہے کہ وہ ہدایت کو اس قوم کی طرف منتقل کر دیتا ہے جو اس کی اہل ہوتی ہے۔ ہم آج مغرب کی فرعونیت میں حقوقِ نسواں کی جنگ سے ہی نہیں نکل پاتے جبکہ اسی مغرب میں اسلام قبول کرنے والوں میں اکثریت عورتوں کی ہے جو پہلے دِن حجاب سے اس کا آغاز کرتی ہیں۔

مصنف کے نزدیک قلم کی حرمت اور اس کی اہمیت سب سے زیادہ محترم ہے اور جس کو یہ ذمہ داری سونپ دی جاتی ہے، اس کو اپنے قلم سے نکلے ہر لفظ کی حرمت اور قدر و قیمت کا پاس کرنا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ روایتی جنگوں کا دور نہیں ہے بلکہ میڈیا کی جنگ کا دور ہے جس کے بارے میں اسلاموٹوپیا کے رجحان میں ذکر کیا گیا ہے۔ میڈیا سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کرتا ہے اور سننے والا اس بات پر یقین کر لیتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پاس معلومات کا دوسرا متبادل کوئی ذریعہ موجود نہیں ہوتا اس لیے ایک قلم کار اور کالم نگار کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کے قوتِ بیان سے سچ جھوٹ میں بدل کر دنیا کو گمراہ تو نہیں کر رہا۔ مصنف کے مطابق قوم کی رہنمائی کا فریضہ اس پر عائد کیا گیا ہے۔ یہ اس قلم کی ذمہ داری کا تقاضا ہے کہ وہ اپنا فرض نیک نیتی سے نبھائے اور اسی بات مد نظر رکھتے ہوئے وہ اپنے کالموں میں مسلمانوں کو دشمنوں کی چالوں سے باخبر کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ کالم نگار رجائیت پسندی کا دامن بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور قارئین کے سامنے ایک ایسی مثالی صورت حال پیش کرتے ہیں جس کی بنیاد اسلام کے مطابق رکھی جائے گی۔ کالم نگار کے نزدیک اسلام سے دور جاکر روحانی و جسمانی سکون تک حاصل نہیں کیا جاسکتا تو مثالی ریاست کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ کالم نگار کے نزدیک وہ ملک یا ریاست جہاں اسلام کے اصولوں کے مطابق زندگی کا نظم و نسق رواں دواں ہے، وہ مثالی اسلامی ریاست یاUtopian State ہے۔ ایک ایسی ریاست جوThomas Moor کے تخیلاتی جزیرے کے مطابق تمام برائیوں، بے ضابطگیوں اور ناانصافیوں سے مبرا ہو گی۔

اپنے ایک کالم بعنوان "بہترین ایمان کے امین" میں کالم نگار نے ملک یمن کا حوالہ دیا ہے جس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ "اچھا ایمان بھی یمن کا ہے اور حکمت و دانائی بھی یمن کی ہے۔ یہ

سیدنا اویس قرنی کا دیس جن کے لیے آپ ﷺ نے اپنا لباس سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو دے کر کہا تھا کہ جب تمہاری ان سے ملاقات ہو تو میرا اسلام پہنچانا اور میری امت کے لیے دعا کرنا۔ یمن کی کل آبادی دو کروڑ ۲۳ لاکھ ہے۔ یہ جزیرہ نما عرب کا واحد جمہوری ملک ہے جہاں تین سو منتخب ارکان کی پارلیمنٹ صدر کو منتخب کرتی ہے۔ صدر سو کے قریب صاحبانِ علم و بصیرت لوگوں کو نامزد کرتا ہے جو مجلسِ شوریٰ کے طور پر اپنے مشورے دیتے ہیں۔ یمن سید الانبیا ﷺ کے زمانے میں اسلامی ریاست کا حصہ بن چکا تھا اور مختلف نشیب و فراز سے گزرا ہے۔ ملکہ بلقیس کا دیس، روم کے لوگ اسے عربین فلیکس یعنی "خوش کن عرب" کہتے ہیں۔ اس کی بندرگاہ عدن کے حوالے سے ہی جنتِ عدن کا محاورہ عرب میں مشہور ہے۔ یہی یمن آج مغربی استعمار کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑا ہے۔ امریکا کے ۲۰۰۲ء میں ڈرون حملے کے چند دن بعد یمن کے ۱۵۸ لوگ ایک مقام پر متحد ہوئے۔ انھیں کسی وزیرِ داخلہ اور وزیرِ مذہبی امور نے نہیں بلایا تھا اور نہ وہ اوقاف کے تنخواہ دار مولوی تھے، وہ سب اسلامی غیرت و حمیت اور جذبہ حب الوطنی سے سرشار تھے۔ انھوں نے ایک قرارداد تیار کی جس کے مطابق وہ اِن معاملات میں مصلحت اور خاموشی نہیں بلکہ جہاد کا راستہ اختیار کریں گے۔ شیخ عبدالحمید الزندانی جنھیں امریکا عالمی دہشت گرد قرار دیتا ہے لیکن یمن کی عدالتیں انھیں ایک محبِ وطن اور صاحبِ ایمان شخصیت کا درجہ دے چکی ہیں۔

یمن کو اپنے یوٹوپیا یا مثالی ریاست کا درجہ دیتے ہوئے کالم نگار اپنے کالم "بہترین ایمان کے امین" میں اپنے وطنِ عزیز پاکستان کے حالات و واقعات کو یمن کے حالات کے مطابق بدلنے کی خواہش کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> "پتہ نہیں کیوں میں یہ خواب دیکھتا ہوں کہ میرے ملک کے علما ایک جگہ ایسے جمع ہوں کہ انھیں کوئی وزیرِ داخلہ نہ بلائے، اوقاف کے سیکریٹری ان کے ٹکٹ اور وزارتِ مذہبی امور ان کے رہنے سہنے کا بندوبست نہ کرے۔ انھیں صرف احکامِ قرآنی اور ملک و قوم کی غیرت و حمیت کے سوا کسی فرقے، پارٹی یا مسلک کی یاد نہ آئے اور وہ صرف ایک دفعہ بیک آواز یہ کہہ دیں کہ اسلام کسی ملک کی جارحیت کے خلاف کیا درس دیتا ہے؟ ڈرون حملوں سے معصوم جانوں کو مارنے والے سے دوستی کا ہاتھ بڑھانے کو کہتا ہے یا اس وقت تک قتال کا حکم دیتا ہے جب تک فتنہ ختم نہ ہو جائے۔"[۱۴]

کالم نگار کی یہ خواہش ہے کہ مسلمانوں کا ایمان اس قدر پختہ ہو جائے کہ دنیاوی سود و زیاں کا احساس انہیں پریشان نہ کرے۔ اہلِ پاکستان بھی ان طاقتوں کے خلاف اپنے حقوق کے لیے اور اپنے دین کے لیے سینہ سپر ہو سکتے ہیں اور ہونا چاہیے اور ان میں وہی جذبہ ءایمان اسی شدت کے ساتھ لوٹ آئے گا جو ریاستِ مدینہ کی تشکیل کے دوران کار فرما تھا۔ جب مسلمان اپنے جان و مال کی پروا کیے بغیر اپنا سب کچھ اپنے رسول ﷺ کی حرمت و غیرت پر لٹا دیتے تھے یا پھر وہ درخشاں دور جب مسلمان علم و ترقی میں عروج پر تھے اور اس کی وجہ اسلام سے والہانہ لگاؤ تھا۔ جب صلیبی جنگوں کے فاتح کی حیثیت سے وہ یورپ کے گرجا گھروں میں اذانیں دیا کرتے تھے اور وہ افریقا میں آباد تھے اسلام کا بول بالا تھا لیکن تم کو ان سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔

کالم نگار کا یہ اندازِ فکر اور ماضی پرستی کا نقطہ ءنظر قارئین کو اسلام کے اولین دور کی جانب کھینچتا ہے اور وہ برصغیر کے ان ایام کی یاد اپنے قارئین کو دلاتا ہے جب مسلمان اس خطۂ ارضی کے حکمران تھے۔ علم کا بول بالا تھا اور امن کی حکمرانی تھی اور سب مسلمان و ہندو شیر و شکر تھے۔ یہ وہ دور تھا جب قطب الدین ایبک کی حکومت تھی اور سن ۱۲۰۶ء تھا۔

> "میں جب بھی قدیم تاریخ کی گرد آلود کتابوں میں جھانکتا ہوں تو مجھے ایک ایسا ہندوستان نظر آتا ہے جس میں امن و آشتی، بھائی چارہ، معاشی خوش حالی اور آسودگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں نوے فیصد کے قریب لوگ زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوں۔ ملک کے طول و عرض میں مدرسوں، مکتبوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کا جال بچھا ہو اور جس کی تصدیق باہر سے آنے والا ہر سیاح کرے۔ کوئی قصبہ، قریہ یا کوچہ ایسا نہ ہو جہاں اس زمانے کے علم سے مزین طیب موجود نہ ہوں۔ لارڈ میکالے کا وہ مشہور فقرہ جو ہندوستان کی تاریخ کی کئی صدیوں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔" یہاں نہ کوئی بھیک مانگنے والا نظر آتا ہے اور نہ کوئی چور۔" (۱۵)

ایسی ہی جنتِ ارضی کی خواہش مصنف کا نہ صرف ناسٹلجیا ہے بلکہ یوٹوپیا بھی ہے۔ آگے چل کر کالم نگار نے مسلمانوں کے اس عظیم دور کے زوال کی وجوہات بھی بیان کی ہیں جن میں ایک وجہ بنیادی فوج کا قیام ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ قطب الدین ایبک کے دورِ حکومت ۱۲۰۶ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک کا، یہ وہ دور تھا جب تمام مذاہب کے لوگ باہم امن اور سکون کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے لیکن پھر سازشِ اغیار نے اس خطے

کا سکون تہہ و بالا کر دیا اور وہ لوگ جو تجارت کی غرض سے اس علاقے میں داخل ہوئے تھے، اس قوم کے سیاہ و سفید پر قابض ہو گئے۔ یہاں انھوں نے انگریزوں کا حوالہ دیا ہے۔

کالم نگار قطب الدین کے دور کو مسلمانوں کا دورِ زریں قرار دیتے ہیں بلکہ ان کے خیال میں ہر گزرا وقت آنے والے وقت سے بہتر ہو گا۔ قرآن پاک کی تعلیمات بھی یہی درس دیتی ہیں۔ جوں جوں قربِ قیامت ہو گا مسلمانوں کے جذبہء ایمانی میں بتدریج کمی واقع ہو گی۔ اس لیے مسلمانوں کی موجودہ صورت حال کالم نگار کے لیے نہایت مایوس کن ہے جسے وہ ڈسٹوپیا قرار دیتے ہیں۔ یہی وہ مایوس کن صورتِ حال ہے جس کے باعث کالم نگار کو مسلمانوں کا درخشاں ماضی، ریاستِ مدینہ کا تصور اور طالبان کا دورِ حکومت ایک مثالی ریاست نظر آتے ہیں جو نہ صرف موجودہ پریشان اور مایوس کن صورتِ حال سے نکلنے کا ایک رستہ ہے بلکہ کالم نگار کا یوٹوپیا بھی ہے جس کا وجود موجودہ دور میں نہ ہے اور نہ عملاً نظر آتا ہے لیکن یہ مصنف کا یوٹوپیا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق موجودہ مسائل کا واحد حل بس یہی ہے کہ ایک ایسا خطۂ ارضی ہو جس پر اسلام کے اصولوں پر مبنی حکومت قائم ہو جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے خلیفہ کی حکومت ہو جو خود کو حاکم سے زیادہ نگران اور خدا کے سامنے جواب دہ سمجھتے ہوں۔ اگر دریائے نیل کے کنارے ایک بکری کا بچہ بھی بھوکا ہو تو ان کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی تھی۔ امن و امان کا یہ حال کہ بغداد سے مدینہ تک ایک نوجوان زیورات سے لدی عورت بے خطر سفر کرتی۔ کیوں کہ اسے یقین تھا کہ یہ عمر بن خطاب کی حکومت ہے۔ ایک ایسی مثالی حکومت جس میں ایک عام بدو بھی خلیفۂ وقت سے سوال کر سکتا ہے۔ اگر اسے اس کے کردار پر شک ہے تو وہ اس کا گریبان پکڑ سکتا ہے۔ اس بات کا اعتراف ہندوستان کے سیاسی رہنما گاندھی نے بھی کیا ہے۔ ہندوستانی اخبار "ہریجن" میں گاندھی نے ہندوستانی پارلیمنٹ کو سادگی اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مثال دی:

> "میں رام چند اور کرشن کا حوالہ نہیں دے سکتا کیونکہ وہ تاریخی ہستیاں نہیں تھیں۔ میں مجبور ہوں کہ سادگی کی مثال کے لیے ابو بکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کے نام پیش کرتا ہوں۔ وہ بہت بڑی سلطنت کے حاکم تھے پر انہوں نے فقیروں والی زندگی گزاری۔"[۱۶]

کالم نگار کے نقطۂ نظر کے مطابق وہ نظامِ حکومت جس کی تائید اسلام کرتا ہے، وہ نظامِ خلافت ہے۔ اس کے متصادم وہ کسی بھی طرزِ حکومت کو ناپسند کرتے ہیں خواہ وہ جمہوریت ہو یا فوجی طرزِ حکومت۔ مصنف نہ جمہوریت کی تائید کرتے ہے ہیں بلکہ اسے مغرب سے منسلک کرتے ہیں۔ وہ فوجی طرزِ حکومت کی بھی

مخالفت کرتے ہیں کیونکہ یہ افراد کو جبر کے ذریعے کنٹرول کرتی ہے۔ وہ خلافت کو بہترین طرزِ حکومت قرار دیتے ہیں۔ خلافت ایک ایسے شخص کے گرد گھومتی ہے جو صادق، امین اور اعلیٰ کردار کا مالک ہوتا ہے اور ایسا شخص ہی مسلمانوں کا حکمران کہلانے کا اہل ہو سکتا ہے۔ جمہوریت کے متعلق ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس میں لوگوں کو اکثریت کے مطابق گنا جاتا ہے اور یہی اس کا عیب ہے۔

اس لیے ان کے نزدیک اصل اور عیب سے پاک وہی طرزِ حکومت ہو سکتا ہے جو اسلام کی روح سے مطابقت اور قربت رکھتا ہے۔ اس طرزِ حکومت کے سبب کالم نگار نے طالبان کے طرزِ حکومت کو مثالی قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے کسی تبدیلی یا لچک کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یہی نہیں بلکہ کالم نگار مستقبل قریب میں ان لوگوں کو اسلام کی دوبارہ سربلندی اور عروج کا باعث قرار دیتے ہیں اور ان کے بارے میں مثبت پیش گوئی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ، افغان مسلم امہ کا وہ سرمایہ ہیں جس پر میرے اللہ کا یہ فرمان صادق آتا ہے کہ، " تم اگر تعداد میں کم بھی ہو گے تو ہم تمھیں گروہ پر غلبہ عطا کریں گے "۔ برطانیہ جس پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا، شکست کھا کر نکلا۔ روس جس کے آپ بہت ممدوح تھے اور طورخم کے بارڈر پر سرخ جھنڈوں کا انتظار کرتے تھے، ایسی شکست کھا کر نکلا کہ اس کی عظیم سلطنت کا نشان باقی تک نہ رہا۔

افغان قوم کے متعلق کالم نگار کی سوچ عمومی فکر سے مختلف ہے۔ وہ ان کی اقدار کے باعث انھیں بہترین قوم گردانتے ہیں۔ ان کے مطابق مسلم امہ کے خاکستر میں اگر کوئی چنگاری دشمن کو جلا کر راکھ کر سکتی ہے تو وہ یہ پٹھان قوم ہے۔

کالم نگار نے جمہوریت کی مخالفت اس لیے کی ہے کہ وہ اسے مغرب کا ایک حربہ سمجھتے ہیں جس کے ذریعے وہ خلافت کو شکست دے سکیں گے اور اسی جمہوریت کے باعث وہ مسلمان ممالک میں اقدار کو مضبوط نہیں ہونے دیتے۔ پارلیمنٹ کی حیثیت ربڑ سٹمپ سے زیادہ نہیں ہے۔ صیہونی طاقتیں مابعد نوآبادیات کے تناظر میں ان ممالک کے حکمرانوں کو اپنے کنٹرول میں رکھتی ہیں، ان کی کمزوریوں سے کھیلتی ہیں، اپنی مرضی کے فیصلے کرواتی ہیں اور یوں ہم آزاد ہو کر بھی آزاد اور خودمختار نہیں ہیں۔

ان کے خیال میں جمہوریت مغرب کی پیداوار ہے۔ اس لیے وہ جمہوریت کو سرمایہ دارانہ جمہوریت کے نام سے پکارتے ہیں اور اسے یہ آمریت کی بدترین صورت کہتے ہیں۔ اگر تاریخِ عالم کا جائزہ لیا جائے تو جمہوریت کو دنیا میں متعارف ہوئے دو سو سال سے زیادہ کا عرصہ نہیں گزرا ہے۔ اس سے پہلے بادشاہت کا نظام

رائج تھا۔ کالم نگار دونوں مذکورہ طرزِ حکومت کے خلاف ہیں۔ اپنے کالم "ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس" میں جمہوریت سے متعلق وہ ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

> "یہ پارلیمنٹ، ایک بد معاش، چور اچکے، بد دیانت کو لوگوں کو لوٹنے، بے چینی سے عوام کا خون چوسنے کا اختیار، عام آدمی کی دولت سے دنیا بھر میں جائیدادیں خریدنے کا سرٹیفکیٹ دینے والے، کیا مضحکہ خیز بات ہے کہ یہ ١٦ کروڑ عوام کی رائے ہے۔"(١٧)

کالم نگار کے مطابق جمہوریت ایک نئے انداز کی سرمایہ کاری ہے جس میں ملک کی اشرافیہ میڈیا کے ذریعے اپنے پسندیدہ امیدوار کے حق میں مہم چلاتی ہے۔ اس کھیل میں سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ صرف شعبدہ بازی ہے۔ جب کروڑوں روپوں کی سرمایہ کاری کے بعد ان کا امیدوار منتخب ہو جاتا ہے تو پھر اس کی مدد سے دونوں ہاتھوں سے ملک کی دولت کو لوٹا جاتا ہے اور اپنی تجوریاں بھری جاتی ہیں۔ اسلاموٹوپیا کے بنیادی رجحانات میں جمہوریت کو پسندیدہ طرزِ حکومت کہا گیا ہے لیکن مصنف اس سے انحراف کرتے ہوئے خلافت کو ایسا طرزِ حکومت گردانتے ہیں جو ماضی میں اور مستقبل میں بھی امت کے مسائل کا حل ہو سکتا ہے۔ طرزِ خلافت اس لیے بھی مصنف کا پسندیدہ طرزِ حکومت اور یوٹوپیا کے حصول کے لیے ایک راستہ ہے کیونکہ ان کے مطابق اس نظام کے تحت مسلمانوں نے دنیا کو ایک بہترین تعلیمی پالیسی دی اور اسے نافذ کیا۔ تراجم کو فروغ ملا اور علم کی ترویج ہوئی۔ اسی نظام تعلیم کی مدد سے مسلمان سائنس دانوں، فلسفیوں، تاریخ دانوں اور ماہرینِ طب کا دنیا کے علوم پر راج رہا۔ جب دنیا اعلیٰ تعلیم سے ناواقف تھی، اس وقت خلافت کے زیر اثر مسلمان علاقوں میں اعلیٰ درس گاہیں قائم تھیں۔ خارجہ پالیسی کو بھی ریاست کا اہم ستون سمجھا جاتا ہے۔ یہ ملک کے مفاد اور وقار کو ملحوظ خاطر رکھ کر مرتب کی جاتی ہے۔ خلافت میں ڈر یا خوف کے باعث کبھی سمجھوتے نہیں کیے گئے۔ حضور اکرم ﷺ کی زندگی میں ریاستِ مدینہ اور اس کے بعد خلفائے راشدین کے دور میں زندگی کے تمام شعبوں میں اسلام کے قوانین نافذ تھے اور اسلامی قوانین انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے بنائے گئے تھے اس لیے کبھی بھی عوامی بغاوت یا انقلاب کی آواز نہیں سنائی دی تھی۔ حالانکہ ان کے زیر اثر علاقوں میں اکثریت مسلمانوں کی نہیں تھی۔ مصنف کے نزدیک اسلام نے بہترین معاشی نظام دیا ہے جسے طالبان نے افغانستان پر کامیابی سے نافذ کر کے ایک مثال قائم کر دی ہے۔ اس لیے مصنف یہ کہتے ہیں کہ اسلام نے وہ سادہ سے اصول وضع کیے ہیں جو آج بھی قابلِ عمل ہیں۔ انصاف کی بالادستی، عہد و پیمان کی اہمیت، ناپ تول میں دیانت داری، منافع کی کم از کم شرح، معاشرے کی پس ماندہ

طبقوں کی مدد اور ریاستی ذمہ داری، اخلاقی بے راہ روی روکنے کے لیے حدود کا تعین، معاشرے سے قتل و غارت ختم کرنے کے لیے قصاص اور امن وامان قائم رکھنے کے لیے معافی اور صلہ رحمی کے اصول دیے۔ پانی، چراہ گاہیں اور آگ پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا جاتا، یہ سب عوام کی ملکیت ہیں۔ کالم نگار نے اپنے یوٹوپیا کی چند خوبیاں گنوائی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ مصنف کی یہ تجویز ہے کہ ایسی سوچ کو پروان چڑھایا جائے جو غور و فکر کے بعد مسلم امہ کے مسائل کے مطابق کوئی آئینی خاکہ ترتیب دے اور اسلامی اصولوں کو وقت کے بدلتے تقاضوں کے مطابق اور قوانین فقہ کی روشنی میں مرتب کیا جائے۔ جن میں معاشی نظام، بنک کے طریقہ کار، ضابطہ فوجداری اور دیوانی سے لے کر ایک ایک قانون کی شق مرتب کی جائے اور امتِ مسلمہ کے بہترین دماغوں کی مشاورت سے یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے۔ ان کے مطابق موجودہ صورت حال میں طالبان حکومت نے اسلامی معاشی نظام اور سود سے پاک بینکاری کے ذریعے دنیا کے سامنے ایک مضبوط معیشت کی مثال قائم کر دی ہے۔ افغان کی کرنسی مضبوط، ملک میں انصاف اور امن وامان مصنف کے یوٹوپیا کی عملی تصویر بن کر دنیا کے نقشے پر ابھر رہا ہے۔ افغان اور اس کے باہمی کالم نگار کا آئیڈیل ہیں اس لیے ان کے ہر قول و فعل میں کالم نگار کو پسند ہے اور اس کو دوسروں کے لیے آئیڈیل قرار دیتے ہیں اور موجودہ مسائل کا حل بھی۔

پشتونوں کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ پشتون وہ واحد قوم ہے جس کے ٹپوں اور گیتوں میں طالب ایک ہیرو اور ٹپوں کا مرکزی کردار ہے اور اس کی وجہ یقیناً سیّد الانبیاصَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی وہ بشارت ہے کہ امام مہدی کے لشکر میں خراسان[1] سے سیاہ جھنڈے اٹھائے لوگ شامل ہوں گے۔ یہاں خراسان سے مراد ایک وسیع علاقہ ہے جو غزنی سے قندھار، ہلمند اور کسی حد تک ایران کا مشہد شامل ہے۔ پشتو زبان میں اکھڑ آدمی کو خراسانی کہا جاتا ہے۔ اہلِ ایران کے ہاں بھی خراسانی گفتگو کرنے والے کو اجڈ کہا جاتا ہے۔ افغان قوم اللہ کی وحدانیت اور سید الانبیاصَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی محبت کے جذبے سے سرشار ہے۔ وہ قوم اپنے ماضی سے نفرت کرتی ہے جس میں وہ دارا سکندر، کنشک اور پن قوم کی غلام تھی لیکن شاید اہلِ اکستان اس غلامی کی جانب واپس لوٹنا چاہتے ہیں۔ قاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ "مطلع الانوار" میں سے ایک تاریخی حوالہ دیا ہے کہ جب ابرہہ نے خانہ کعبہ پر حملہ کرنے کے لیے تیاری کی تو اس وقت کعبے کے بہت سے دشمن نزدیک و دور سے آکر ابرہہ کے گرد جمع ہو گئے۔ انہی لوگوں میں افغان قبائل بھی شامل تھے۔

۱۔ خراساں: مشرق میں بدخشاں تک پھیلا ہوا تھا اور اس کی شمالی سرحد دریائے جیحوں اور خوارزم تھے اور بلخ اس کا دار لحکومت ہے۔
آزاد دائرۃ المعارف:wikipedia

اس لیے وہ افغانوں کی دین پرستی کے قائل ہیں اور اس کے مقابلے میں جدید جمہوریت کو پسند نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک جمہوریت کا یہ طرزِ حکومت دراصل مسلمانوں کے طرزِ خلافت کے خلاف ایک حربے کے طور پر سامنے آیا جب خلافتِ عثمانیہ کی بدولت مسلمانوں کو عروج حاصل تھا۔ اس وقت پوری امتِ مسلمہ کو یوں کاٹا گیا جس طرح کیک کے ٹکڑے کیے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا گیا۔ جن علاقوں میں وسائل کی کثرت تھی، ان کو قلیل رقبہ دیا گیا تاکہ وہ کمزور رہیں۔ اس کے بعد نوآبادیاتی نظام کے ذریعے وسائل سے مالا مال علاقوں کی تمام دولت سمیٹ لی گئی۔ برصغیر جس کو سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا۔ اس کے تمام ذخائر تاجِ برطانیہ کی زینت بنے۔ یہی نہیں، انگریز نے اپنے دورِ حکومت میں ایسے وفادار پالے جو اس کے جانے کے بعد آج جمہوریت کے ذریعے اقتدار کے مزے لے رہے ہیں۔ یہ مابعد نوآبادیت کا زمانہ ہے جس میں فاصلاتی طرزِ حکومت کے تحت ریموٹ کنٹرول ان صیہونی طاقتوں کے ہاتھ میں ہے جس کے ذریعے وہ ان ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک میں اپنی مرضی کی حکومتوں کا نفاذ عمل میں لاتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنی نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کے اس شعر میں اسی طرزِ حکومت کا ذکر کیا ہے۔ اس نظم میں ابلیس اپنے حواریوں سے کچھ اس طرح سے مخاطب ہے:

ہم نے خود شاہی کو پہنچایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

اور یوں اپنے حواریوں بلکہ وفاداروں کی قیادت پر جمہوریت کی مہر تصدیق ثبت کر دی گئی۔ یہی لوگ اپنے اثر و رسوخ عطا کردہ جائیدادوں اور حاصل کردہ عہدوں سے اس ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بن گئے ہیں۔ اگر آج ہم وطنِ عزیز کی قیادت کا شجرہ نصب تلاش کیا جائے تو کہیں نہ کہیں کوئی خان بہادر، کوئی اعزازی مجسٹریٹ، کوئی نواب، سردار، ٹمن دار یا وکٹوریہ کراس حاصل کرنے والا جاںنثار فوجی ضرور ملے گا۔

اپنے ایک اور کالم "ڈورا ٹوٹ چکا" میں لکھتے ہیں کہ، کائنات کے پُراسرار رازوں میں سے بہت سے راز ایسے ہیں جنھیں عالمِ غیب کا مالک و مختار اور اس عالم رنگ و بو کا بادشاہ اور فرماں روا انسانوں پر وا کرتا رہتا ہے۔ کبھی یہ علم اور تحقیق کے پردے سے ظہور پذیر ہوتے ہیں اور دنیا کو حیران کر دیتے ہیں اور کبھی کسی کو ایسی باخبر چھٹی حِس عطا کر دی جاتی ہے کہ اس کے خوابوں بلکہ اکثر اس کی آنکھوں کے سامنے آنے والے حادثات و واقعات گھومنے لگتے ہیں۔ اس میں آدمی کے علاقے، مذہب اور نسل کی کوئی قید نہیں، ادراک یا نفسیات کی زبان میں وجدان (intuition) عطا کرتا ہے۔ کچھ یہ بوجھ برداشت کر پاتے ہیں اور کچھ اس حد سے بڑھی عالم

حیرت اور آنے والے واقعات کی پہلے سے خبر ہونے کی وجہ سے جذب کے عالم میں آجاتے ہیں۔ سائنسی تحقیق کی اولین کہانیاں پڑھیں تو حیرت ہوتی ہے اور اللہ کا وہ دعویٰ کہ اسرار و رموز کو جبلت میں وحی کہا جاتا ہے، اس کو وحی جبلی کہتے ہیں سچ ثابت ہوتا ہے۔ نیوٹن کے ذہن میں یہ خیال کیوں آیا کہ سیب زمین پر ہی کیوں گرتا ہے؟ سٹیفن سن نے کیتلی سے نکلتی بھاپ پر کیوں غور کیا اور ریلوے انجن ایجاد کیا۔ یہ دونوں اور اکثر سائنس دان مسلمان نہیں تھے لیکن انھوں نے قدرت کے راز افشاں کرنے کے لیے اپنا تن من دھن وقف کر دیا اور اللہ تعالیٰ کسی انسان کی محنت ضائع نہیں کرتے ہیں۔ "**لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی**" انسان کے لیے اس کی کوشش سے زیادہ کچھ نہیں۔ سائنس آج ان تمام قرآنی پیش گوئیوں کی تصدیق کر رہی ہے جو رسولِ عربی ﷺ نے ۱۴ سو سال قبل کی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب سائنس دانوں پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے تو وہ اس کے قائل ہو جاتے ہیں کہ دینِ الٰہی ہی آفاقی، آخری اور سچا مذہب ہے۔ ایک ایسا مذہب جو انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کرتا ہے۔

اپنی اسی اسلاموٹوپیا کے تحت اپنے ایک اور کالم "خوفِ خدا رکھنے والوں سے خوف زدہ مذہب" میں کالم نگار نے اسلامی فلاحی ریاست کے قیام پر زور دیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ ایک سماجی ٹرسٹ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں جو حکومت کی پابندیوں کے باوجود اپنے نصب العین کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہے۔ ان کو کسی قسم کی کوئی سرکاری مدد حاصل نہیں لیکن اللہ اور اس کے دین کی سربلندی کے لیے یہ لوگ اپنے کام میں نفع نقصان کی پروا کیے بغیر لگے ہوئے ہیں۔

اوریا مقبول جان کے اکثر کالموں میں اسلام کی تعلیمات اور حضور ﷺ کے ارشادات کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کے اکثر کالم ایک حدیث یا آیتِ قرآنی کی مکمل تفسیر اور تشریح میں لکھے جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ حضور ﷺ کی زندگی ہم سب مسلمانوں کے لیے ایک نمونہ ہے جس پر عمل پیرا ہو کر ہم نہ صرف اپنی زندگیوں کو سنوار سکتے ہیں بلکہ اپنے مسائل حل کر سکتے ہیں۔ حضرت محمد ﷺ نے تکبر اور غرور سے منع فرمایا ہے اور آج بھی اہلِ مغرب کے اندر تعصب اور تکبر کا عنصر پایا جاتا ہے۔ کالے اور گورے کے درمیان امتیاز جس کی بنیاد پر معاشرے میں ایک حدِ فاصل کھینچ دی گئی ہے۔ صدیوں تک فرعونوں، شہنشاہوں، آمروں، ڈکٹیٹروں اور ان کے چھوٹے چھوٹے کارپردازوں کی سواریاں بھی ایسی تھیں کہ ان کا عام لوگوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ سواریاں جہاں عوام الناس کا مذاق اڑاتی تھیں، وہاں ان پر سفر کرنے والے بھی انسانوں کے درمیان تمیز، تفریق اور آقا و غلام کے قانون میں تھے۔ کالم نگار اپنے مذکورہ کالم میں تاریخ سے

مثال دیتے ہیں۔ وہ عظیم الشان رومی سلنطت کی تاریخ بیان کرتے ہیں کہ تکبر، غرور اور گھنٹوں ساتھ چلنے، آرام پہنچانے والے شخص سے کراہت اور دوری کے اس ماحول میں ہر شخص کو اپنا ماضی شدت سے یاد آتا ہے۔ اسلاف کے وہ معیار آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں:

> "روم کے بادشاہوں کی طرح رہن سہن اور لباس پہننے والے عیسائیوں کے بیت المقدس پر جب پھٹے پرانے کپڑے پہننے والے مسلمانوں نے فتح حاصل کی تو شہر حوالے کرنے کے لیے خلیفہ وقت عمر ابن خطاب کا انتظار تھا۔ ایک گھوڑا جس کے سم گھس کر بیکار ہو چکے تھے، رک رک کر قدم رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ خلیفۂ وقت اور فاتح ایران و شام عمر ابنِ خطاب اور غلام موجود تھے، طے ہو کہ آدھا راستہ غلام سواری کرلے گا اور آدھا راستہ خلیفہ بیت المقدس قریب آیا تو باری غلام کی آگئی اور پھر تاریخ نے انسانی احترام کا ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ غلام گھوڑے پر سوار اور خلیفہ باگ تھامے بیت المقدس میں داخل ہوا۔"(۱۸)

یہ وہ مثالی حکمرانی کا تصور ہے جو کالم نگار کا آئیڈیل ہے اور یہی وہ روشن اور شاندار ماضی ہے جس کی وہ بار بار مثال دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری تاریخ بھی ایسے عظیم حکمرانوں سے بھری پڑی ہے اس لیے ہمیں کسی نپولین، سکندر کی تقلید اور تعریف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر شاہی کروفر اور لباس پہنے رومی عیسائی صرف ایک فقرہ بول سکے کہ ایسا ہی شخص عزت کا مستحق ہے اور ایسے ہی شخص کو فتح نصیب ہو سکتی ہے۔ اس تاریخی فقرے کے بعد بھی اگر آج کوئی مسلمانوں سے یہ سوال کرتا ہے کہ ہم دنیا میں ذلیل و رسوا کیوں ہیں، بے آسرا اور بے آبرو کیوں ہیں تو اتنے شاندار اسلاف کی مالک قوم سے ایسا سوال پوچھنے والے پر شاید کسی کو بھی حیرت نہیں ہونی چاہیے۔

اوریا مقبول کے کالموں میں جہاں اسلاموٹوپیا کے منشور کی حمایت نظر آتی ہے، وہیں ساتھ اسلاموفوبیا بھی ان کے کالموں کا موضوع ہے جس کے ذریعے وہ کفار کے خوف اور ڈر کو بار بار واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے منظرِ عام پر لاتے ہیں۔ اس طرح وہ اسلام کے کروفر، اس کے جاہ و جلال کو مزید قوت کے ساتھ اجاگر کرتے ہیں۔ ہر وہ عمل، ہر وہ روش اور ہر طرزِ حکومت جو اسلام اور اس کی روح کے منافی اور اس کے خلاف ہے، وہ اس کی مذمت کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال مطلق العنانی اور جمہوریت کے خلاف اس کا نقطہء نظر ہے۔ مطلق العنانی میں جبر اور ظلم کی مدد سے عوام کے حقوق غصب کیے جاتے ہیں اور ایک مطلق العنان حکمران کو عوام سے کوئی ہم دردی نہیں ہوتی ہے۔

اپنے کالم "آتش فشاں" میں وہ انقلابِ فرانس کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ عوام بھوک، افلاس، بے روز گاری اور بیماری کے ہاتھوں تنگ تھے اور ملک کی سیاسی قیادت چار گروہوں میں تقسیم تھی۔ دنیا بھر کے ممالک بادشاہ کے ساتھ تھے۔ یہاں تک کہ انگلستان جیسا جمہوریت پرست ملک بھی بادشاہ کی حکومت گرانے کا مخالف تھا لیکن ظلم جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو دوا بن جاتا ہے اور یہی اہلِ فرانس نے کیا۔ ایک دن ظلم و ستم اور بھوک و ننگ سے ستائے یہ لوگ تنگ آکر گھر سے نکلے اور یہ بپھرا ہجوم حکومت کے ایوانوں میں داخل ہوا۔ وہ صرف روٹی روٹی کے نعرے لگا رہے تھے۔ بادشاہ کے ٹوڈیوں اور مسلح لوگوں نے سنگینوں سے ان کو منتشر کر دیا اور دو افراد کو پکڑ کر تختہ دار پر لٹکا دیا۔ حکمران یہ خیال کر بیٹھے تھے کہ ہم ان سب کو دبا سکتے ہیں۔ کیونکہ حکومت بہت طاقتور ہوتی ہے لیکن انھیں اس بات کا احساس تک نہ ہوا کہ لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے۔ انھوں نے بادشاہ کے ساتھ مل کر ایک سازش کی۔ اسمبلی میں انسانی حقوق کی قرارداد منظور کی اور شہر سے میلوں دور بادشاہ کے محل تک پھیلا بھوکوں ننگوں کا یہ ہجوم ہر غاصب کی گردن کاٹ رہا تھا۔ جس نے ایک دفعہ بھی بادشاہ کو مطلق العنان بنانے کا ذکر کیا تھا، نہ ان کو جاگیر بچا سکے نہ طاقتور فوج اور جس نے گھاس کھانے کا مشورہ دیا تھا اس کے منہ میں گھاس بھر کر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

> "تاریخ شاہد ہے کہ ایسا صرف فرانس میں نہیں ہوا۔ ہر اس جگہ دہرایا گیا جہاں ملک کا خزانہ بھرتا رہے اور غربت کی شرح بھی ساتھ ہی بڑھتی رہے۔ تاریخ اس بات پر بھی شاہد ہے کہ جوں جوں غریبوں کی بے چینی میں اضافہ ہوتا ہے، مطلق العنان حکمران اپنی طاقت میں اور قانون نافذ کرنے والوں کی قوت میں اضافہ کرنے لگتے ہیں۔ لیکن کوئی یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ مفلس و نادار، بیروز گار و بیکار اور زخم خوردہ انسانوں کے سیلاب کو روکنے کے لیے تاریخ میں کوئی بندہ کوئی ریت کی بوری اور کوئی بارود کی فصل ایجاد نہیں ہو سکی۔ وہ آتش فشاں کی طرح ہوتے ہیں۔"(۱۹)

رجائیت، کالم نگار کے یوٹوپیا کا اہم عنصر ہے۔ کالم نگار نے انقلابِ فرانس کی مثال اس امید پر دی ہے بلکہ اس تاریخی مثال کے پس منظر میں درحقیقت ان کا وہ یوٹوپیا وہ مثالی اور تصوراتی دنیا کا نقطہ کار فرما ہے جس کے تحت وہ اپنے وطن کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے ملک میں ایسا ہی انقلاب چاہتے ہیں اور اس تاریخی واقعے کی مدد سے اپنے اہلِ وطن کو متحرک کر رہے ہیں بلکہ ایک مہمیز کا کام کر رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ہم وطنوں کے اندر بھی ایسا جوش اور جذبہ بیدار ہو جس کے تحت وہ مطلق العنان، غاصب حکمرانوں کے خلاف

سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو جائیں۔ ان کے خلاف علمِ بغاوت بلند کریں اور اپنے حقوق حاصل کریں۔ ہر شخص کو اپنے حقوق اور اپنے حصے کی جنگ خود ہی لڑنا پڑے گی۔ اس سلسلے میں وہ یہودی قوم کی مثال دیتے ہیں۔ یہودیوں کی مثال دیتے ہوئے کالم نگار اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ کاش یہی احساسِ زیاں میرے ملک کے باسیوں کے اندر بھی بیدار ہو جاتا۔ ان کی خواہش ہے کہ ہم اپنی ناکامیوں سے کچھ سبق سیکھ لیتے اور کچھ نہیں تو ان ناکامیوں اور محرومیوں کی یادداشتوں کا ایک میوزیم بنا ہی لیتے، ان کو یاد کر لیتے تاکہ یہ احساسِ ناکامی ہمارے اندر ناقابلِ شکست جذبہ اجاگر کرتا۔ ایک ایسا جذبہ جس کی سیڑھی چڑھ کر ہم اپنے دشمن سے بدلہ لینے کے قابل ہو جاتے۔

کالم نگار دراصل قوم کے اندر تعمیرِ نو کا احساس اجاگر کرنا چاہتے ہیں جو دوبارہ اسے ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی تشکیل کی جانب لے جاسکے۔ وہ ایسی قوم چاہتے ہیں جس نے تاریخ سے بہت کچھ سیکھا ہو۔ نازیوں کے ظلم اور بربریت نے یہودیوں کو زندگی جینے کا ایک نیا راستہ دکھا دیا تھا۔ ایک ایسا راستہ جس نے پھر ان کی زندگیوں اور ان کے مقاصد کو ہی بدل کر رکھ دیا۔ یہودی وہ واحد قوم ہے جس نے اس سفر کی تلخی اور اذیت کو آج تک یاد رکھا ہوا ہے۔ وہ اس تلخی کو اپنی آئندہ آنے والی نسلوں تک ویسے ہی منتقل کرتے ہیں جیسے کوئی اپنا قیمتی ورثہ آنے والی نسلوں کو منتقل کرتا ہے۔ مذکورہ واقعہ سے متعلق لکھے گئے کالم میں ایک دادی اور پوتے کا ذکر کیا گیا ہے۔ دادی پوتے کو عجائب گھر میں یہودیوں کے بچ جانے والے ورثے سے روشناس کروا رہی ہے۔ نازیوں کا یہ ظلم صرف یہودیوں پر نہیں تھا، ان کی پہلی اذیت دینے والا کیمپ ۱۹۳۳ء میں سیاسی مخالفین اور ادیبوں اور شاعروں کے لیے بنایا گیا۔ وہ پولینڈ کی آبادی کو غلام تصور کرتے اور مشہور آپریشنAB-AK Tion میں پولینڈ کے پادری، ادیب اور دانشور اکٹھے کیے گئے اور ان کو گولیوں سے بھون دیا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب اپنے زخم بھول گئے مگر اس اذیت کی یاد نے یہودی قوم کو اس طرح تیار کیا کہ آج دنیا کی واحد سپر پاور ان کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے۔ اذیت، تکلیف، ظلم اور قربانی کی اس تاریخ کو یاد رکھ کر ایک بار پھر سے ابھرنے کا جذبہ ہی تھا کہ آج وہ دنیا کی حکومت، سیاست او سائنس پر چھائے ہوئے ہیں اور اذیت بھولنے والا روس اپنے انجام کو جا پہنچا جب کہ پولینڈ اس نئی دنیا میں کسی قابلِ ذکر مقام کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ سب بتانے کے بعد کالم نگار لکھتے ہیں کہ، "مجھے آج بھی وہ دادی اور پوتا رہ رہ کر یاد آرہے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کاش ایسی ہی ایک دادی اور پوتا واہگے کے بارڈر پر مجھے نظر آجائیں جہاں وہ بتا رہی ہو کہ بیٹا یہ وہی سرحد ہے جس پر تمہارے دس لاکھ آباؤ اجداد کے خون کے نشان ہیں۔ کسی آڈیو لائبریری میں وہ چیخیں سنائیں

دیتیں جو مسلمان عورتوں نے درندوں کے قبضے میں بند کی تھیں، کاش کوئی اس میوزیم کی دیواروں پر ان ۸۰ ہزار کشمیریوں کے نام کندہ کرواسکتا جن کی قربانیوں سے قبرستان آباد ہوئے اور یہ فہرست روز بروز بڑھتی ہے۔"

آئیڈیلزم یوٹوپیا کا اہم عنصر ہے اور غیرت مند اقوام مذکورہ کالم نگار کی آئیڈیل ہیں اور یہ کالم نگار کے یوٹوپیا کا اہم عنصر ہے۔ ایک ایسے نظریے، جذبے اور احساسِ زیاں کو اجاگر کرنا جو ان کے بقول مسلمانوں میں اور پاکستانیوں میں من حیث القوم کہیں کھو گیا ہے۔ اگر یہ احساسِ زیاں زندہ ہو جائے تو پھر گزرے وقت اور اس کے نقصانات کا ازالہ کیا جا سکتا ہے۔

کالم نگار کا یوٹوپیا جسے اسلاموٹوپیا کہا جا سکتا ہے، کے تحت وہ اسلام کو ایک مکمل ضابطہء حیات سمجھتے ہیں ایک ایسا طرزِ زندگی جو تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ طرزِ زندگی وقت کے بدلتے تقاضوں اور حالات کے بھی عین مطابق ہے۔ اس میں جدت کے ساتھ ندرت کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ انسانی زندگی کے معاشرتی، معاشی، اقتصادی، ثقافتی سب پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ اسلام نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۲۷۵ میں فرمانِ الٰہی ہے کہ (ترجمہ): "سود لینے اور دینے والا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف جنگ کا اعلان کرتا ہے۔" مخالفین نے اس پر یہ نکتہء اعتراض اٹھایا ہے کہ اسلام معیشت کو بھی گناہ اور ثواب کے ترازو میں تولتا ہے۔ ان سوالات کو سن کر عام مسلمان خواہ وہ کتنا ہی پڑھا لکھا ہو، لاجواب ہو جاتا ہے۔ لیکن اسے یہ بات تکلیف ضرور پہنچاتی ہے۔ اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کا حلال ذرائع سے کمایا گیا زر، سود میں سرمایہ کاری کے باعث حرام ہو رہا ہے۔ عام لوگ بجلی، پانی اور گیس کی عدم اور کم دستیابی کے لیے تو صدائے احتجاج بلند کرتے نظر آتے ہیں لیکن اس نظام کے خلاف کوئی اٹھ کھڑا نہیں ہوتا۔ البتہ یہ بات کسی قدر حوصلہ افزا ہے کہ امریکا کے شہر نیویارک میں لوگ اس نظام کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں جس نے ان کے اربوں روپے ہڑپ کر لیے ہیں۔ مادی دنیا کی معیشتیں تباہی کے دہانے پر کھڑی ہوئی ہیں۔ کالم نگار کے نزدیک اس تباہی اور دیوالیہ پن سے نکلنے کا فقط ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے، اسلامی بینک کاری۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں اس کا نفاذ عمل میں لایا جائے۔ مصنف کی آئیڈیل حکومت طالبان نے ان کے بقول سود سے پاک بینکاری کر کے دنیا کے سامنے ایک مثال قائم کر دی ہے۔

اپنے کالموں میں مصنف ان نام نہاد جمہوری حکمرانوں کا ذکر طنزیہ کرتے ہیں جو مغرب کے پروردہ ہیں اور ان کے ایما پر اپنے عوام کو قتل کرواتے ہیں۔ اپنے کالم "سیکولر، لبرل آمروں کا یومِ حساب" میں کالم

نگار مصر کی ۲۰۱۱ء کی صورت حال کے بارے میں لکھتے ہوئے تحریک اخوان المسلمین کی حمایت ان الفاظ میں کرتے نظر آتے ہیں:

"مصر کے جمال عبد الناصر نے فوجی انقلاب کے ذریعے اقتدار حاصل کیا۔ وہ اپنے آپ کو فرعون کا جانشین سمجھتا تھا۔ اس نے اس ملک سے اظہارِ رائے اور اسلامی شناخت کا صفایا کرنے کے لیے ۱۹۲۸ء میں شروع ہونے والی تحریک اخوان المسلمین کے ہزاروں لوگوں کو جیل میں ڈالا اور اس کے بڑے بڑے صاحبان علم کو پھانسیاں دیں۔ اس تحریک نے اپنے قیام سے برطانوی اقتدار کے خلاف جدوجہد کی۔ سن البنا کی قیادت میں علمی اور دفاعی کاموں پر توجہ مرکوز کی۔ اس تنظیم کے اسلامی سکالر سید قطب کی تحریروں کا اثر ہے کہ آج فلسطین میں حماس سے شام، اردن، عراق، تیونس اور الجزائر تک میں سیکولر اور لبرل آمریت کے خلاف تحریکیں عروج پر رہیں۔" (۲۰)

مندرجہ بالا کالم میں کالم نگار اخوان المسلمین کے سیاسی و مذہبی کردار کی بھی مکمل حمایت کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ ان کے نصب العین یعنی "اسلاموٹوپیا" کے تحت شریعتِ اسلام کے نفاذ کی بھی مکمل حمایت کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے مطابق تحریک اخوان المسلمین وہ مذہبی سیاسی تحریک ہے جس نے امتِ مسلمہ میں جہاد کے جذبے کو ابھارا ہے۔ مغرب اس پر بنیاد پرستی کا الزام لگاتا ہے جب کہ حقیقت تو یہ ہے کہ بنیاد پرستی دراصل امریکا میں بیدار ہونے والی ایک تنظیم کا نام تھا جس کا مقصد امریکا میں پروردہ جدیدیت کے رجحان کو توڑنا تھا۔ وہ مغربی طرزِ حکومت یعنی جمہوریت کے خلاف ہیں اور اسے اسلامی طرزِ خلافت کے خلاف مغرب کی ایک سازش قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق یہ طرزِ حکومت عوام کی صحیح معنوں میں نمائندگی نہیں کرتی کیونکہ اس میں حکمرانوں کے کردار اور ان کی صلاحیتوں کو نہیں جانچا جاتا اور نااہل لوگوں کو اقتدار سونپ دیا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اوپر سے نیچے تک Right man in the right job کا قانون مسترد کیا جاتا ہے۔

مجموعی طور پر اوریا مقبول Pan-Islamicus کی حمایت کرتے ہیں اور تحریک اخوان المسلمین کے منشور کی تائید کرتے ہیں۔ ان کے مطابق اسلاموٹوپیا Islam is the solution یعنی اسلام کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا ہی اس وقت مسلمانوں کے تمام تر مسائل کا حل ہے۔

اوریا مقبول جان کا آئیڈیل ریاست مدینہ ہے جس کی عملی شکل کسی حد تک ان کو موجودہ طالبان کی حکومت میں نظر آتی ہے، مصنف کی آئیڈیل شخصیات میں حضرت محمد ﷺ اور خلفائے راشدین ہیں۔

حضرت عمر ﷛ کا دور حکومت ان کا آئیڈیل ہے کیونکہ حضرت عمر فاروق ﷛ نے دنیا کو ایسا نظام دیا جو آج تک رائج ہے سن ہجری کا اجرا کیا موذنوں کی تنخواہیں مقرر کیں۔ فوجی چھاؤنیاں قائم کیں، پولیس اور عدالتی نظام کا اجرا کیا۔ آپ نے دنیا میں پہلی بار دود پیتے بچوں، بے آسروں اور بیواؤں کے اساسے مقرر کیے۔ حکمران کلاس کا احتساب کیا آپ راتوں کو تجارتی قافلے کی نگرانی کرتے تھے۔ اسلامی دنیا کے پہلے خلیفہ جنھیں امیر المومنین کا خطاب دیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر میرے دور میں فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو اس کی سزا عمر کو بھگتنا ہو گا۔ دنیا میں سکندر کا نام صرف کتابوں میں سمٹ گیا ہے لیکن حضرت عمر ﷛ کے بنائے گئے نظام دنیا کے ۲۴۵ ممالک میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔ لاہور کے مسلمانوں نے ایک بار انگریز کو دھمکی دی تھی تو جواہر لال نہرو نے مسکرا کر کہا کہ افسوس آج مسلمان یہ بھول گئے ہیں کہ ان کی تاریخ میں ایک عمر بھی تھا جن کے بارے میں مستشرقین بھی یہ بات قبول کرتے ہیں کہ اگر ایک اور عمر ہوتا تو اسلام دنیا کا واحد دین ہوتا۔

ان کے نزدیک یہ سرحدی لکیریں بے معنی ہیں اور برصغیر ہی وہ علاقہ ہے جس سے مسلمانوں کی آخری فتح ونصرت کا پرچم بلند ہونا ہے۔ اس کا جغرافیہ خود رسول اکرم ﷺ نے بیان فرما دیا ہے۔

وہ یہ کہتے ہیں کہ تاریخ کے مطالعے سے یہ بات واضح ہے کہ جب سیاست اور مذہب دونوں کو جدا جدا کر دیا گیا تو ملک تباہ و برباد ہو گئے۔ اس کی مثال وہ ۴ مغربی ممالک سے دیتے ہیں۔ یورپ میں ۱۹۰۸ء میں ریاست کو مذہب سے الگ کر دیا گیا جس کے نتیجے میں جنگیں لڑی گئیں۔ عرب ممالک (مصر، شام، عراق) میں جب مذہب اور حکومت کو الگ کر دیا گیا تو سیکولر، جابر اور شدت پسند حکومتیں معرضِ وجود میں آئیں جن کے حکمران ظلم و بربریت میں چنگیز خان سے کم نہیں تھے۔ اگر حکمران اقتدار کے خوف اور جواب دہی سے منکر ہو گا تو وہ آمرِ مطلق ہو گا۔ ان کے نزدیک سود کا توڑ قرضِ حسنہ ہے اور وہ (سنن ابن ماجہ حدیث نمبر ۲۱۱۳۶۷) رسول ﷺ کی وہ حدیث پیش کرتے ہیں جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ "میں نے جنت کے دروازے پر لکھا ہوا دیکھا کہ صدقے کا اجر دس گنا اور قرضِ حسنہ کا اجر اٹھارہ گنا ہے۔"

الغرض اوریا مقبول جان کے کالموں میں اسلاموٹوپیا کے حوالے سے پیش کیے گئے خیالات و افکار یوٹیاپیا کی ایک واضح مثال پیش کرتے ہیں۔

۲۔ خورشید ندیم کی کالم نگاری میں یوٹوپیا کے عناصر

خورشید ندیم اسلامی سکالر ہیں۔ وہ ایک طویل عرصے سے روزنامہ دنیا میں "تکبیر مسلسل" کے نام سے کالم لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے ۸۰ء کی دہائی میں کالم نگاری کا آغاز کیا۔ وہ سیاسی، معاشرتی اور دینی موضوعات پر کالم لکھتے ہیں۔ وہ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی سے شائع ہونے والے ادبی جرنل "فکر و نظر" کے ایڈیٹر بھی رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ حکومتی جریدے "اجتہاد" کے بھی ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ آج کل وہ PTV پہ "ارتقا" کے نام سے ہفتہ وار شو کی میزبانی بھی کرتے ہیں۔

ان کے کالموں کا بنیادی موضوع مذہبی مسائل ہوتے ہیں۔ اسلامی ریاست کی تشکیل کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر روایتی علما سے قدرے مختلف نظر آتا ہے۔ ان کی سوچ میں روایت پسندی اور شدت پسندی نہیں ہے۔ اسلامی ریاست کی تشکیل میں ان کا نقطۂ نظر منفرد ہے۔ اس ضمن میں وہ نہ تو سیکولرازم کی حمایت کرتے ہیں اور نہ لبرل ازم کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ خورشید ندیم پاکستان کو بطور ایک مذہبی ریاست بھی نہیں دیکھنا چاہتے کیوں کہ ان کے خیال میں مذہبی ریاست میں بنیاد پرستی اور شدت پرستی کو ہوا ملتی ہے۔ اس کے برعکس کالم نگار ایک ایسی اسلامی ریاست کی تشکیل کے خواہاں ہیں جو قائدِ اعظم کے نقطۂ نظر اور اقبال کے خواب کی تکمیل کرے۔

جلالِ بادشاہی ہو یا جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

مصنف مذہب کو کسی بھی ریاست کی تشکیل میں بنیادی عنصر قرار دیتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دراصل مذہب ہی وہ اخلاقی بنیاد فراہم کرتا ہے جو سماج کو متوازن اور صحت مند بناتا ہے اور تحمل و برداشت کی خُو پیدا کرتا ہے۔ مذہب، وطن پرستی اور حب الوطنی کے جذبے کو معتدل کرتا ہے اور اس کو تعصب کی حد تک بڑھنے نہیں دیتا۔

خورشید ندیم روایت پسندی اور ہٹ دھرمی کی بجائے آزادیِ رائے اور روشن خیال نقطۂ نظر کی حمایت کرتے ہیں۔ وہ ان مولویوں کی مخالفت کرتے ہیں جنھوں نے دین کے بارے میں اس قدر خوف پھیلایا ہے کہ وہ خود ہی ڈر کی صورت بن گئے ہیں۔ کالم نگار کا مقصد دنیا کے سامنے اسلام کی معتدل اور عملی صورت پیش کرنا ہے جسے وہ اسلام کا اصل روپ بھی قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں خالق اپنی مخلوق کے ساتھ مہربان ہے نہ

کہ سخت اور جابر۔ اس ضمن میں وہ اجتہادی نقطہ ء نظر اپناتے ہیں۔ اجتہاد عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "سوچ بچار" کے ہیں۔ اجتہاد اسلامی قوانین کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر کوئی اصطلاح قرآن، حدیث اور اجماع سے واضح نہ ہو سکے تو علما اس مسئلے کا قرآن وسنت اور اجماع کی روشنی میں کوئی نہ کوئی حل تلاش کرتے ہیں کیونکہ زمانہ حالتِ جمود میں نہیں ہے۔

اپنے کالم "اجتہاد" میں وہ ظفر اللہ خان کی کتاب کا حوالہ دیتے ہیں:

"اجتہاد"۔۔۔ایک مجتہدانہ کتاب۔۔۔

> "اجتہاد، ظفر اللہ خان کے نزدیک محض احتیاطِ احکام یا چند فقہی آرا اختیار کرنے کا نام نہیں بلکہ یہ دین کی ایک نئی تعبیر ہے جو تمام شعبۂ ہائے حیات پر محیط ہے۔ اہلِ اسلام کو آج اس کی ضرورت ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مذہب کی موجودہ غالب تعبیر مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں حائل ہے جس سے نجات ہی سے اصلاحِ احوال ممکن ہے۔"[۲۱]

بیرسٹر ظفر اللہ خان پاکستان کے معتبر سیاست دان اور مصنف ہیں۔ وہ "پاکستان اور سیاست دان" نامی کتاب کے مصنف ہیں۔ انھوں نے (۱۸-۲۰۱۶) تک وزیر اعظم پاکستان کے مشیر کی حیثیت سے فرائض سر انجام دیے ہیں۔

مندرجہ بالا کالم میں کالم نگار نے بیرسٹر ظفر اللہ خان کی تاریخی کتابوں کا حوالہ دیا ہے جو انھوں نے چالیس برس کے عرصے میں لکھیں۔ ان کے لیے اجتہاد فکرِ اسلامی کی تشکیلِ نو ہے۔ یہ محض امتیاطِ احکام یا چند فقہی آرا اختیار کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ دین کی ایک نئی تعبیر ہے۔ جو تمام شعبۂ ہائے زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور کالم نگار کے نزدیک یہ وقت کی ضرورت بھی ہے۔ دنیا کو بدلنے اور من چاہے حالات پیدا کرنے کے لیے بھی اجتہاد کی ضرورت ہے۔

کالم نگار سے کیے گئے انٹرویو میں انھوں نے اس بات کا اظہار کیا کہ وہ پاپولر اسلام اور سیکولر اسلام دونوں کو مختلف سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں سیکولر ازم ایک مکمل آئیڈیالوجی ہے جبکہ سیکولر اسلام کا اختیار ریاست کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ریاست جس نظریہ یا طبقہ ء فکر کو پسندیدہ سمجھتی، ہے اس کو لاگو کرتی ہے۔ کالم نگار کے مطابق یہ طریقہ کار درست نہیں ہے۔ ان ے مطابق، پاپولر اسلام سے مراد اسلام کی وہ عام صورت ہے جسے عام آدمی سمجھتا ہے۔ مثلاً نماز، روزہ، جمعہ کا خطبہ، وغیرہ۔ یعنی مذہب کی وہ صورت جسے عام آدمی

پسندیدہ سمجھتا ہو۔ جبکہ پاپولر السلام مسجد، خانقاہ، مزار اور صوفیانہ اقدار کی طرف رغبت ہے۔ اس میں ریاست کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔

روزنامہ دنیا میں تحریر کیے گئے اپنے کالم "پاپولر اسلام اور سیکولر اسلام" میں وہ اسلام کی منفرد توضیح پیش کرتے ہیں:

> "پاپولر اسلام، آج جو صورت اختیار کر چکا، اس میں خود مذہب کی مختلف تعبیر کے لیے کوئی جگہ نہیں اس لیے ریاست اور سماج کا سیکولر بندوبست ہی حقیقی مذہب کے مفاد میں ہے۔ جب پاپولر اسلام اور سیکولرازم کا موازنہ کرتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ سیکولر ازم ہی ایک موزوں سیاسی بندوبست ہے۔ تجدید و احیائے دین کی آواز بھی ایک سیکولر ماحول ہی میں اُٹھ سکتی ہے۔"(۲۲)

مندرجہ بالا کالم میں کالم نگار نے اسلام کی منفرد توضیحات پیش کی ہیں۔ انھوں نے "پاپولر اسلام" کی ایک نئی اصطلاح متعارف کروائی ہے۔ ان کے مطابق اگر ہم دوسرے مذاہب بالخصوص یہود کی تاریخ کو پڑھیں جو قرآن مجید اور عہد نامہ جدید میں بھی بیان ہوئی ہے تو اس سے واضح ہو گا کہ مذہبی سرگرمیوں کے بڑھنے سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ سماج مذہبی ہو گیا ہے۔ اس مطالعے سے یہ بات بھی نکھر کر سامنے آجائے گی کہ مذہبی شخصیت اور مذہبی معاشرے کے اوصاف کیا ہوتے ہیں۔ کسی فرد یا معاشرے کے مذہبی ہونے کا پیمانہ یہ نہیں ہے کہ اس میں مذہبی سرگرمیاں کتنی ہیں بلکہ پیمانہ یہ ہے کہ اس کی اخلاقی سطح کیا ہے؟ اسی کالم میں آگے چل کر پاپولر اسلام اور سیکولر اسلام کی مزید وضاحت بھی ان کے کالم میں نظر آتی ہے:

> "مذہب کی وہ صورت جو سماج میں قابلِ قبول ہو یا دوسرے لفظوں میں عام آدمی مذہب کے بارے میں کیا نقطۂ نظر رکھتا ہے، ایک ایسے مذہب کو پسندیدہ قرار دیتا ہے جو سماجی رویوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ یا پھر ایک عملی مذہب نہ کہ کتابوں میں بند ہدایات کا پلندہ جو علمی سطح پر کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو سماجی رویے اور ریاستی پالیسی کی تشکیل میں اس کا کوئی کردار نہیں ہوتا ہے۔ پاپولر مذہب کے سامنے ریاست بے بس ہوتی ہے۔ مذہب اور ریاست کے باہمی تعلق کی بحث اسی وقت معنی خیز ہو سکتی ہے جب مذہب سے مراد پاپولر مذہب ہو۔ جنرل مشرف کی سیکولرازم کی تحریک کو اسی لیے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ پاپولر اسلام نے اسے مسترد کر دیا تھا۔ پاپولر اسلام کا تصور صوفیانہ روایات سے جڑا ہے۔"(۲۳)

پاپولر اسلام وہ فکری جدوجہد ہے جس نے عوام کا زاویہء نظر بدل ڈالا، جس نے ان کے سیاسی، سماجی اور مذہبی خیالات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور افکار کی ایک نئی فصل کو ہوا دی۔ اس کے نتیجے میں مضبوط سیاسی اور سماجی ادارے وجود میں آئے۔ ان اداروں نے ایک بنیادی نظامِ اقدار پر اتفاق کیا جس میں جمہوریت سرِ فہرست تھی۔ آج عوام کی مرضی کے بغیر کوئی ان پر مسلط نہیں ہو سکتا۔

کالم نگار نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اسلامی ممالک اور غیر اسلامی ممالک کے درمیان ایک تقابل پیش کر کے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی ممالک میں جمہوریت اس طرح نہیں پنپ سکی جس طرح غیر اسلامی ممالک میں ہے۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ فیصلہ سازی کا اختیار عوام کے بجائے خاص طبقے کے پاس ہے۔ مصنف کے نقطۂ نظر میں جمہوریت بہترین طرزِ حکومت ہے۔ مغرب کی جمہوریت کی مثال دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اس کے پیچھے تین سو سال کی فکری جدوجہد ہے جس نے عوام کا زاویہء نظر بدل ڈالا جبکہ مسلم معاشروں کی تاریخ اس جدوجہد سے خالی ہے۔ ہم اگر کوئی خواب بھی دیکھتے ہیں تو ماضی کے حوالے سے۔ اس کالم میں مصنف نے اسلامی اصولوں کو بہترین قرار دیا ہے۔ کیوں کہ وہ ایک مثالی معاشرے کی تشکیل میں بہتر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ جیسے کہ قتل، دوطرفہ نہیں بلکہ یک طرفہ معاملہ ہے۔ ایک انسان کا قتل معاشرے کو لرزا دیتا ہے۔ اس لیے اگر قاتل اور مقتول دونوں گروہ معافی نامہ پر دستخط کر بھی دیتے ہیں تو ریاست کا حق بنتا ہے کہ وہ اس کے خلاف عمل کرے۔

کالم نگار کے نزدیک مذہب ایک سماجی عمل کی تعمیری حیثیت سے ہمیشہ سے کسی بھی معاشرے کی سب سے بڑی اخلاقی قوت رہا ہے۔ فرد ہو یا سماج، اگر دونوں اس اخلاقی قوت سے محروم ہو جاتے ہیں تو ان کا مادی اور غیر مادی یعنی روحانی وجود بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

اس کے برعکس انسانی تاریخ میں یہ کوشش کی جاتی رہی کہ سماج کو غیر مذہبی اخلاقی نظام دیا جائے لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ آپ اخلاقی نظام کو مذہب کی بنیادوں سے آزاد کر کے اسے غیر مذہبی تو قرار دے سکتے ہیں لیکن ایسے اخلاقی نظام کا کوئی نہ کوئی سماجی اور تاریخی پس منظر تو ہوتا ہے جیسا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا معاملہ ہے۔ سماج مذہب سے آزاد نہ ہو تو پھر کوئی اخلاقی نظام کیسے بن سکتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ہر اخلاقی نظام بہر حال مابعد الطبیعاتی اساس کا مطالبہ کرتا ہے اور یہ مابعد الطبیعاتی اساس مذہب فراہم کرتا ہے۔ اسی صورت حال کو مصنف نے اپنی کتاب "مسلم سماج اور سیکولرازم" کے دیباچہ میں بیان کیا ہے۔ اخلاقی نظام صرف مادی تناظر میں قائم نہیں رہ سکتا بلکہ تاریخ میں یہ اساس صرف مذہب ہی نے کامیابی کے ساتھ فراہم کی

ہے۔وہ کہتے ہیں کہ چینی صدر ہمیں معلوم ہے کہ کسی مذہب کو نہیں مانتے اس لیے اخلاقیات کے مابعد الطبیعاتی تصور پر یقین نہیں رکھتے۔ گویا مان لیا گیا کہ ایک مادی تصورِ حیات کی بھی اخلاقی بنیاد ہو سکتی ہے اور نتیجہ خیز بھی۔ میرے لیے یہ بات بہت اہم ہے اور میرا خیال اب بھی یہی ہے کہ مستحکم اخلاقی بنیاد صرف مذہب دے سکتا ہے جو انسان کو اصلاً ایک اخلاقی وجود تسلیم کرتا ہے۔

مصنف جب اخلاقیات کے مابعد الطبیعاتی تصور کی بات کرتے ہیں تو ذہن میں ڈیکارٹ کا، mind body dualism کا تصور آتا ہے جس میں وہ ذہن کی جسم پر برتری ثابت کرتا ہے اور ذہن کی تخلیق، اس کے تصورات، مابعد الطبیعات نوعیت کے ہیں اس لیے وہ اخلاقی تصحیح، ذہن اور اس کے مذہبی عقائد سے منطبق کرتا ہے۔ کالم نگار کے نزدیک بھی اصلاحِ معاشرہ کے لیے جو دو بنیادی اقدام اٹھانے کی ضرورت ہے، وہ فکر اور اخلاق کی اصلاح ہیں۔ اس کے بعد وہ تصوف کا ذکر کرتے ہیں جس کا احیا مسلم سماج کو روحانی اور اخلاقی برائیوں سے محفوظ کر کے اخلاقی بنیادوں پر استوار ایک مثالی معاشرے کی تشکیل میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ یہ تھامس مور اور H.G. Well کے یوٹوپیا کی عملی تصویر ہو سکتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں Pan Islamism کا تصور جو دراصل مسلمان معاشرے کو داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر درپیش نئے سیاسی سماجی اور معاشی حالات کا نہ صرف فکری بلکہ عملی حل بھی پیش کرتا، یہی اسلاموٹوپیا کا منشور ہے۔ اصل بات اس سچائی کی تلاش ہے جس کا اپنا تصورِ علم ہے اور اس کی توجہ کا مرکز ایک جمہوری کلچر معاشرے اور سماج کی تشکیل ہے اور یہ تشکیل انفرادی رویے کی تعمیر کے ذریعے ہو سکتی ہے، ریاستی سطح پر نفاذِ شریعت کے ذریعے نہیں، کیونکہ اسلامی شعور جب تک انفرادی اور بنیادی سطح پر نہیں آئے گا، معاشرے میں لائی جانے والی کوئی بھی تبدیلی فقط سطحی اور وقتی نوعیت کی ہو گی۔

مصنف فکری ارتقا کو ایک خوش آئند عمل قرار دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ یہ عمل شعوری ہونا چاہیے۔ بصورتِ دیگر یہ فکری اپاہج پن کی صورت اختیار کر جائے گا۔ ایسی صورتِ حال میں ہم بیک وقت کئی متضاد بیانات اور طبقہء فکر کو مان رہے ہوتے ہیں جس سے ہماری اپنی سوچ کی گہرائی ناقابلِ اعتبار نظر آتی ہے۔ ان کے نزدیک چائنا، مغربی ممالک اور ریاستِ مدینہ کی ایک مبہم سی تصویر مثالی ریاست کی صورت میں موجود ہے اور وہ بہ وقتِ ضرورت ان میں سے کسی ایک کی مثال دیتے ہیں۔ چین ایک سیکولر ملک ہے اور اس حقیقت کو ماننے کے باوجود کہ چین نے حیرت انگیز انداز سے معاشی ترقی کی ہے اور اس کی

اخلاقی بنیادی ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جو مضبوط اخلاقی نظام کا ڈھانچہ ہمارے مذہب نے دیا ہے، وہ لافانی ہے اور چین اس سے محروم ہے، اس لیے مثالی ریاست کی تمام شرائط پر پورا نہیں اترتا۔

"ایک جمہوری معاشرہ اسی وقت توانا ہوتا ہے جب اس میں اختلافِ رائے کا احترام کیا جاتا ہو اور مذہب ہو یا سیاست میں ایک سے زیادہ آرا کو قبول کیا جاتا ہو۔ جہاں کی فضا آزادیِ رائے اور فکری ارتقا کے لیے سازگار ہو۔ جہاں سیاسی جماعتیں جمہوری رویوں کی تربیت گاہ، جہاں سول سوسائٹی اتنی توانا ہو کہ وہ ریاست پر اثر انداز ہو سکے۔ جہاں خوف کی حکمرانی نہ ہو، محبت کی فراوانی ہو، جہاں سیاسی اور سماجی ادارے مضبوط ہوں، جہاں آئین کا احترام کیا جاتا ہو اور عام آدمی بھی آئین شکنی جیسے جرم کی سنگینی سے پوری طرح واقف ہو؟"[۲۴]

اپنے اس کالم میں مصنف نے جہاں ایک مثالی ریاست کا تصور پیش کیا ہے وہاں ایک مثالی حکمران یا سیاست دان کا تصور بھی پیش کر رہے ہیں اور ان کے نزدیک یہ تمام صورتِ حال اس وقت پیدا ہونا ممکن ہے جب ہماری موجودہ سیاست اس جمود سے باہر نکلے گی۔

عوام طاقت کا سرچشمہ ہیں لیکن ان کو اس طاقت کا اندازہ ہی نہیں ہوتا ہے۔ حقوق کی پاس داری اور انصاف کی فراہمی کسی بھی مثالی ریاست کے لیے جزوِلاینفک ہیں۔ اپنے کالم "ووٹ کو عزت دو" میں کالم نگار سماج کی تشکیل کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ:

"اب سماج کو کیا دین سکھانا چاہیے، اس کی تعلیم کا اہتمام مدارس میں نہیں کیا جاتا ہے۔ اس لیے میرا یہ خیال ہے کہ عالم کی طرح دینی خطبا اور واعظین کی تیاری کا الگ نصاب ہونا چاہیے۔ اس کے نصاب میں علما کا سماجی کردار، دعوت کے آداب، سماج کے زندہ مسائل اور اسلامی معاشرے کی تشکیل، اسلامی کردار، سماجی اور بین المذاہب تعلقات جیسے موضوع شامل ہوں"۔[۲۵]

کالم نگار کے نزدیک خطبہء جمعہ کے دوران خطیب کو ان تمام مسائل کے بارے میں بات کرنی چاہیے۔ مندرجہ بالا کالم میں مصنف نے ایک اہم نقطے کی جانب توجہ مرکوز کروائی ہے۔ وہ جمعہ کے خطبہ کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور مسلمانوں کے درخشاں ماضی سے اس کی مثال دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عملی طور پر خطبہء جمعہ کی اہمیت ہماری معاشرتی زندگیوں میں کم ہو گئی ہے۔ اس کے کم ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ اب خطبہء جمعہ ایک رٹے رٹائے بیان کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مسلمانوں کی معاشی و معاشرتی زندگی کو مخاطب نہیں

کیا جاتا جس کی وجہ سے لوگوں کی اس میں دلچسپی ختم ہو رہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار مصنف نے اپنے انٹرویو میں کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ مصنف وعظ و نصیحت کی کثرت سے بھی منع کرتے ہیں۔ مصنف کے مطابق کثرت بے زاری پیدا کرتی ہے۔ عبداللہ بن مسعود بھی ان خوش بختوں میں سے ہیں جن کے علم کے لیے اللہ کے آخری رسول سیدنا محمد ﷺ نے دعا فرمائی۔ ان کے بارے میں روایت بیان ہوئی ہے کہ وہ ہر جمعرات کو وعظ کیا کرتے تھے۔ ایک شخص نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ آپ ہمیں روزانہ درس دیا کریں۔ ابنِ مسعود نے فرمایا، "میں ایسا اس لیے نہیں کرتا کہ کہیں تم بیزار نہ ہو جاؤ۔" اسلام ایک مکمل دین ہے جو نہ صرف انسانی زندگی اور اس کے مسائل کا حل پیش کرتا ہے بلکہ الہامی دین ہونے کے ناطے انسانی نفسیات کو بھی مدِ نظر رکھتا ہے اور انسان کی فطرت ہے کہ کسی بھی چیز یا عمل کی تکرار بیزار کر دیتی ہے۔ اگر آپ ہر وقت نصیحت کریں گے تو وہ بیزار ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً فرد اس عمل سے متنفر ہو جاتا ہے اور اس کے وجود میں اکتاہٹ اتر جاتی ہے۔ جس کے باعث وہ بغاوت پر اتر آتا ہے۔ اگر وہ بغاوت پر نہ اترے تو ایک ذہنی مریض بن جاتا ہے اور باغی انسان سماج کو متاثر کرتا ہے۔ یوں نفسیاتی و ذہنی مریض اپنی ذات کو دونوں صورتوں میں نقصان پہنچاتا ہے۔

کالم نگار کے نزدیک قائد اعظمؒ کا خیال تھا کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہو گی جبکہ اس بارے میں عام خیال یہ ہے کہ قائد اعظم نے پاکستان کے لیے ایک سیکولر ریاست کا خواب دیکھا تھا لیکن مصنف کے نزدیک قائد اعظم پاکستان کو ایک اسلامی ریاست دیکھنا چاہتے تھے۔ جس طرح تھامس مور نے ایک فلاحی ریاست کی تعمیر کے لیے تجاویز پیش کیں، اسی طرح مصنف نے پاکستان کے بارے میں قائد اعظم کے نقطہء نظر کو اپنے کالم "قائد اعظم کا اسلام" میں مندرجہ ذیل نکات میں پیش کیا ہے:

"۱۔ پاکستان کی ریاست اپنے سیاسی و معاشی نظام کی تکمیل میں اسلام کی تعلیمات کو بنیاد بنائے گی۔

۲۔ قرآن مجید کے مطابق انسان زمین پر خدا کا خلیفہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے دوسرے انسانوں کے ساتھ اسی طرح معاملہ کرنا ہے جس طرح خدا اپنے بندوں کے ساتھ کرتا ہے اور یہ محبت اور تحمل و برداشت سے عبارت ہے۔

۳۔ اسلام انسانوں کے درمیان امتیاز نہیں کرتا ہے۔ بطور نظام، تہذیب اور تمدن اسلام انسانی برابری، بھائی چارے، آزادی اور مساوات کا قائل ہے اور پاکستان کا نظام اسی تصورِ اسلام کی اساس پر بنے گا۔

۴۔ پاکستان کی ریاست میں مذہب کی بنیاد پر شہریوں میں تفریق نہیں کیا جائے گی۔ وہ اپنے مذہبی وجود کے اظہار میں آزاد ہوں گے۔

۵۔ پاکستان کی ریاست ان صفوں میں کوئی مذہبی ریاست (Theocracy) نہیں بن رہی جس میں مذہبی پیشواؤں کا ایک طبقہ کسی خدائی مشن کے تحت حکومت کرے گا۔ خواتین کو معاشرت اور سیاست میں متحرک کردار ادا کرنا ہو گا۔ تاہم اس کا مطلب مغرب کی نقالی نہیں۔"(۲۶)

مصنف نے قائدِ اعظم کے وژن اور سوچ کی روشنی میں اسلام کے اصولوں پر مبنی اسلامی ریاست کی تشکیل کا جو عندیہ دیا ہے، وہی ان کا یوٹوپیا ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک کالم میں وہ مذہبی اور اسلامی ریاست کا فرق واضح کر چکے ہیں۔ مذہبی ریاست سے ان کی مراد شدت پسند اور بنیاد پرست ریاست کا قیام ہے جو نہ تو اسلامی تعلیمات کے مطابق ہوتی ہے اور نہ ہمارے مسائل کا حل ہو سکتی ہے کیونکہ مذہبی ریاست پر ایک فرقے یا گروہ کی اجارہ داری ہوتی ہے اس لیے وہ اسلامی ریاست کا قیام چاہتے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ مذہبی ریاست سے مراد ایک ایسی ریاست ہے جو صرف اپنے مذہب کے پیروکاروں کو تحفظ فراہم کرتی ہے۔ زمانہ موجود میں اس کی مثالVetican City ہے جس میں پاپائیت کی حکومت ہے۔ مصنف کے نزدیک اسلام ایک فلاحی ریاست کا تصور دیتا ہے جس کی مثال تاریخِ عالم میں سب سے پہلے حضور ﷺ نے ریاستِ مدینہ قائم کر کے دکھائی۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مذہب کی آڑ میں حکمران طبقہ عوام کا استحصال کرے۔ مذہب کا نام لے کر حکومت تو حاصل کرے لیکن اس کے بعد اسلام کے مطابق عمل نہ کیا جائے۔

ایک اسلامی ریاست اسلام کے طے کردہ اصولوں پر قائم کی جاتی ہے اور اسلام میں ہر مسئلے کا حل موجود ہے مثلاً اپنے مذکورہ کالم میں آگے چل کر وہ اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ اگر معاشرہ فساد کی طرف مائل ہے اور عدم استحکام کا شکار ہے تو خواتین کو باہر نکلتے وقت زیادہ احتیاط کرنی چاہیے۔ اس بات کو "سورۃ الاحزاب" میں بیان کر دیا گیا ہے اگر معاشرہ مستحکم ہے اور خواتین محفوظ ہیں تو اس کے احکام "سورۃ نور" میں دیے گئے ہیں۔ مصنف قرآن پاک کی سورتوں کا حوالہ دے کر اسلامی معاشرے میں عورت کا مقام اور اس کی حدود و قیود کو واضح کرتے ہیں۔ سورۃ نور میں عورتوں سے متعلق احکام کو نہایت خوب صورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ عورتوں کی نام نہاد آزادی کی مخالفت کی گئی ہے اور اسے مغرب کا منصوبہ قرار دیا گیا ہے

جس کی مدد سے وہ اسلامی معاشرے میں انتشار اور بدامنی پھیلانا چاہتا ہے۔ کالم نگار کے نزدیک انسان اور اس کے معاشرے کی بقا کا انحصار اسلام پر ہے اور یہی قانونِ فطرت ہے۔

اپنے کالم " قائداعظم کا اسلام" میں کالم نگار نے فلاحی ریاست کا تصور واشگاف الفاظ میں یوں پیش کیا ہے:

> "پاکستان کو اگر ایک فلاحی ریاست بننا ہے تو لازم ہے کہ مذہب و نظریے کے نام پر عوام میں استحصال کا سلسلہ ختم ہو۔ اس کے لیے لازم ہے کہ عوام کی شعوری سطح بلند ہو۔ انھیں معلوم ہو کہ حکمرانوں کی کارکردگی کا انحصار اس پر نہیں۔ پرکھنے کا پیمانہ یہ ہے کہ وہ عوام کے بنیادی حقوق کا تحفظ کر پاتے ہیں یا نہیں، صحت و تعلیم کی سہولتیں ملتی ہیں یا نہیں۔ قانون کی حکمرانی ہے یا نہیں؟"[۲۷]

یہاں کالم نگار ریاستِ مدینہ کو اپنا یوٹوپیا قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ ان کی دونوں تعریفات Noplace اور goodplace پر پورا اترتی ہے۔ البتہ اب ایسی مثالی ریاست کا وجود ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ ایسے الہامی اور آفاقی اقدام عام انسانوں کے بس کی بات نہیں یہ ایک معجزاتی عمل تھا۔

کالم نگار شخصی آزادی کے تصور کے حامی ہیں۔ مذکورہ کالم میں بھی انھوں نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ریاست کو ہرگز یہ اختیار نہیں کہ وہ لوگوں پر جبر کرے۔ ایک اسلامی ریاست کا تصور بھی قائداعظم نے اس لیے دیا تھا کہ وہاں مذہبی آزادی حاصل ہوتی ہے۔

اپنے مضمون "سیکولرازم اور مذہب" میں مصنف نے مذہب اور ریاست کے تعلق پر مزید بحث کی ہے۔ اس مضمون میں کالم نگار اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> "مسلم معاشروں میں بھی مذہب و ریاست کا باہمی تعلق کوئی اطمینان بخش صورت اختیار نہیں کر پاتا۔ ایک حلقے میں خلافت، اسلامی ریاست اور ولایتِ فقہ (نائب امام) جیسے نظریات مقبول ہیں اور دوسری طرف یہ نقطۂ نظر بھی موجود ہے کہ یہ نظریہ جدید ریاست کے تصور سے جوہری طور پر متصادم ہے"۔[۲۸]

مذکورہ بالا کالم میں مصنف خلفائے راشدین کے سنہری ادوار کو یاد کرتے ہیں جو ان کا یوٹوپیا بھی ہے۔ اس کالم میں وہ عقلِ کل اور عقلِ عام میں فرق واضح کرتے ہیں اور خلفائے راشدین کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ، اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو عقلِ کل سے نوازا تھا، وہ خلافت کے منصب پر فائز تھے اور اس کی صلاحیت بھی

رکھتے تھے۔ اللہ کے حکم سے ان کو عقل اور سمجھ عطا کی گئی تھی۔ وہ مشکل وقت میں بہترین اور عقل مندانہ فیصلے کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ جب کہ آج کے حکمران ان تمام شخصی اوصاف سے محروم ہیں اس لیے انتظامی صلاحیتوں اور معاملہ فہمی کا فقدان نظر آتا ہے۔" جمہوریت اور فسطائیت" کے عنوان سے تحریر شدہ کالم میں کالم نگار نے جمہوریت اور فسطائیت کا تقابل کچھ اس انداز میں کیا ہے:

> "جمہوریت ہی میں معاشروں کی بقا کا راز مضمر ہے، فسطائیت میں نہیں۔ دِلی کے انتخابات نے ایک بار پھر اس حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ فسطائیت، انتہا پسندی کی ایک صورت ہے۔ جب لوگ حُبِ عاملہ میں مبتلا ہو کر کسی بچھڑے کو خدا مان لیں تو فسطائیت وجود میں آتی ہے۔"(۲۹)

اس کالم میں تلیحانہ عنصر نظر آتا ہے۔ فسطائیت کی مثال میں مصنف نے فسطائیت اور جمہوریت کا تقابل پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں وہ ٹیلر اور مسولینی کا حوالہ دیتے ہیں۔ کالم نگار کے مطابق جن ممالک میں جمہوری کلچر کی جڑیں مضبوط ہیں، انھوں نے حکمرانوں کی فسطائیت کو شکست دے دی ہے اور یہی ان کی ترقی کا راز ہے۔

کالم نگار کے نزدیک ریاستِ مدینہ ملک کو اسلام کے اصولوں کے مطابق چلانے کی ایک تعبیر ہو سکتی ہے۔ ابلاغ کے لیے اس مفہوم کی حامل کئی اصطلاحیں اس سے پہلے بھی مستعمل رہی ہیں۔ جیسے اسلامی نظام، اسلامی انقلاب، نظامِ مصطفیٰ جس کا پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے۔ مصنف کے نزدیک یوٹوپیا کا مکمل تصور اس کی تعریف کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے۔ ریاستِ مدینہ کا تصور بیک وقت good place اور noplace کے تقاضوں پر پورا اترتا ہے۔ ایک ایسی جگہ جو مکمل اور مثالی ہونے کے ساتھ ساتھ اب حقیقت میں کہیں موجود نہیں ہے۔ کالم نگار کے نزدیک ریاستِ مدینہ معجزہ الٰہی تھا جس میں غیر انسانی صلاحیتوں کی کارفرمائی تھی۔ اپنے کالم "تکبیر مسلسل" میں وہ ریاستِ مدینہ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> "سیاسی نظام کے استحکام کے لیے سیاسی جماعتوں کا مضبوط اور مستحکم ہونا ضروری ہے۔ یہ سیاسی جماعتیں ہی ہیں جو وفاق کو متحد رکھ سکتی ہیں۔ عوام کو ریاستی جبر سے اکٹھا نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان کے مشرق و مغرب میں پھیلے مسلمانوں کو اگر کسی نے مطالبہ پاکستان پر جمع کیا تو وہ ایک سیاسی جماعت تھی۔ طاقت سے اگر کسی ریاست کو قائم یا باقی رکھا جا سکتا تو پاکستان کبھی قائم نہ ہوتا۔"(۳۰)

وہ مزید کہتے ہیں کہ پاکستان نظریے کے باعث وجود میں آیا تھا، بزورِ طاقت نہیں۔ مصنف نے مختلف نظامِ حکومت کے تقابل کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بہترین طرزِ حکومت دنیا میں اگر کہیں موجود ہے اور عوام کی ضروریات و خواہشات کو اگر کوئی نظام مطمئن کرنے میں کامیاب ہوا ہے تو وہ جمہوریت ہی ہے، نہ فسطائیت ہے، نہ بادشاہت اور نہ مذہبی حکومتیں جیسے روم کی پاپائیت، نہ مارشل لا، وغیرہ۔ کیونکہ یہ تمام طرزِ حکومت شخصی اقتدار کو فروغ دیتے ہیں جس میں عوام کے حقوق کو پامال کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا کوئی طرزِ حکومت کامیاب ہو سکتا تو برصغیر میں آج بھی سلطنتِ برطانیہ حاکم ہوتی کیونکہ وہاں بادشاہت کا نظام رائج تھا۔ مگر آج سب کچھ بدل چکا ہے۔ ملک کی سیاسی تاریخ کا جائزہ لینے کے بعد واضح ہوتا ہے کہ وطنِ عزیز طویل عرصے تک فوجی اقتدار کے زیر تسلط رہا ہے۔ آزادی رائے کی ہر قدغن ان کو جان لیوا معلوم ہوتی ہے۔ مطلق العنان اقتدار کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

اس لیے ضیاء الحق کی شخصی خوبیوں کے اعتراف کے باوجود وہ انھیں ہیرو ماننے پر آمادہ نہیں۔ مصنف کا یہ تصورِ تاریخ، اخلاقی شعور اور تجربات و مشاہدات سے پھوٹتا ہے۔

کالم نگار نے یہاں اپنا تصورِ تاریخ بھی بیان کیا ہے جو حالات و واقعات کے اثرات سمیٹتے ہوئے تغیر و تبدل کا شکار ہوتا ہے۔ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ ضیاء الحق کی مثال دیتے ہیں جو اُن کے نزدیک ذاتی طور پر کئی خوبیوں کے مالک تھے لیکن وہ انھیں کو ہیرو ماننے کو تیار نہیں۔ کیوں کہ وہ سٹالن اور ہٹلر کی روایات کے امین تھے اور عمر بن عبدالعزیز اور صدیق اکبر کے مقلدین نہیں تھے جو کالم نگار کے آئیڈیل ہیں۔ جس طرح مور نے اپنے معاشرے پر طنز کیا، اسی طرح کالم نگار نے مزاحیہ انداز میں موجودہ معاشرے پر طنز کیا ہے۔ ان کے خیال میں ہم نے روسو، ہیگل اور ابنِ خلدون جیسے فلسفیوں کے نظریات سے کچھ نہیں سیکھا ہے۔ اس لیے وہ اگر آج ہمارے ملک کو دیکھ لیں تو سر پیٹ لیں گے۔ فلسفیوں کے حکومت کرنے کی ذیل میں کالم نگار فلاطون کے ہم خیال ہیں جو یوٹوپیا پر فلسفیوں کی حکومت کا خواہاں تھا۔

> "مجھے لگتا ہے کہ ہم نے کامیابی سے ایک ایسا جزیرہ آباد کر لیا ہے جہاں فطرت کے قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا۔ جہاں ہم نے تجربات سے ثابت کیا ہے کہ انسان کا تہذیبی ارتقا ایک سفر رائیگاں ہے۔ علم و حکمت کی روایت ایک بے معنی مشق کے سوا کچھ نہیں۔ اگر روسو، ہیگل اور ابنِ خلدون جیسے حضرات آج اس طرف آنکلیں تو اپنے افکار کے تارو پود بکھرتا دیکھ کر عمرِ رائیگاں کا ماتم کریں۔"[۳۱]

یہ کالم مصنف کا Sociopolitical Satire ہے جو ملک کی صورت حال پر ایک سیاسی و سماجی طنز ہے۔ تھامس مور کی طرح وہ ملک کے موجودہ طرزِ حکومت پر طنز کرتے ہوئے اس میں جہالت اور بے عملی کا رونا روتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے شاید روایت سے ہٹ کر اپنا نیا تجربہ کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ آج تک یہ سیاسی حکومت ایک نئے اور ناکام تجربے کے علاوہ کچھ ثابت نہیں ہوئی ہے۔ مصنف کے مطابق ہم بے وقوفوں کی جنت (Fool's Paradise) میں رہتے ہیں، جس کا اپنا ہی لطف ہے۔

اس کا حل وہ ایک بار پھر اپنے فکری یوٹوپیا یا اسلاموٹوپیا ریاستِ مدینہ میں ہی دیکھتے ہیں۔ ریاستِ مدینہ کے متعلق ان کا نقطہء نظر منفرد ہے اور اس کا اظہار انہوں نے اپنے کالم "ریاست مدینہ" میں کیا ہے:

> "میثاقِ مدینہ دراصل سیاسی اکائیوں میں منقسم سماج کو ایک سیاسی نظام کے تابع کرنا تھا تاکہ مدینہ ایک مستحکم ریاست بن جائے۔ یہ کوئی مذہبی نہیں، سیاسی عمل تھا۔ اس سیاسی نظم کو وقت کے ساتھ ساتھ مسائل درپیش ہوتے گئے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے بطور حکمران بہت حکمت کے ساتھ اس صورتِ حال کا سامنا کیا۔"(۳۲)

ریاستِ مدینہ کے متعلق مصنف کا نقطۂ نظر منفرد، مختلف اور عملی طرز کا ہے۔ مصنف کے مطابق ریاستِ مدینہ کا تسلسل ایک مذہبی نہیں بلکہ سیاسی عمل ہے جو رسول ﷺ کی بہترین انتظامی صلاحیتوں کا مظہر تھا۔ ان کے مطابق مذہبی ریاست کسی خاص گروہ کی اجارہ داری پر یقین رکھتی ہے جب کہ اسلامی ریاستِ مدینہ اعلیٰ سیاسی نظم کی اعلیٰ مثال تھی جس کو وقت کے ساتھ ساتھ بہت سی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا جن کو رسول ﷺ نے اپنی حکمت اور معاملہ فہمی کے ساتھ حل کیا۔ اس لیے وہ ایسی ریاست کا تصور دیتے ہیں جو فرد کی اخلاقی و روحانی تربیت کا سامان کر سکے۔ کالم بعنوان "مذہبی اور اسلامی ریاست" میں ایک مثالی نظام زندگی کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

> "انسان کو کسی ایسے نظامِ فکر کی ضرورت ہے جو اسے مادی ہی نہیں ایک اخلاقی اور روحانی وجود بھی تسلیم کرتا ہو۔ اخلاقی وجود کا استحکام، کسی تصورِ خدا کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ صلاحیت صرف مذہب میں ہے جو انسان کو ایک پورا آدمی تصور کرتے ہوئے اس کو اپنا مخاطب بناتا ہے۔ اسلام مذہب کا جدید ترین عکس، مکمل اور سب سے ترقی یافتہ اور آخری شکل ہے۔ گویا یہی ایک ایسے نظام کی بنیاد بن سکتا ہے جو سرمایہ داری کے عذاب سے انسان کو بچا سکتا ہے۔"(۳۳)

مصنف شدت پسندانہ نظریات پر تو یقین نہیں رکھتے لیکن وہ اسلامی ریاست کو ایک مثالی ریاست قرار دیتے ہیں اور اس کی توجیہہ وہ یہ دیتے ہیں کہ اسلامی ریاست کی بنیاد مذہبِ اسلام کے اصولوں پر قائم ہوتی ہے اور مذہب ایک مکمل تصورِ حیات پیش کرتا ہے۔

وہ سرمایہ دارانہ نظام کے بھی مخالف ہیں کیوں کہ ان کے بقول، سرمایہ ہر اُس چیز کا مخالف ہے جو اس کی نشوونما میں مانع ہو جس میں مذہب سرِ فہرست ہے۔ مذہب اخلاقی حدود کا پابند ہے اور یہ قیود، سرمایہ کی بے لگام دوڑ میں معاون نہیں ہو سکیں۔ اسی طرح سرحدیں بھی سرمایہ دارانہ نظام کے رستے میں رکاوٹ نہیں ہیں اور انسان ان دونوں ضرورتوں کے بغیر نہیں رہ سکتا کیونکہ مذہب اس کے اخلاقی وجود کا مطالبہ کرتا ہے۔ وطن اس کی مادی بقا کا ضامن ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس حقیقت کو شعوری طور پر قبول کرتے ہوئے کوئی راستہ تلاش کیا جانا چاہیے۔

مندرجہ بالا کالموں میں کالم نگار کے ریاست کے متعلق نقطۂ نظر کو ان نکات میں ترتیب دیا جا سکتا ہے:

مذہب کسی بھی انسان کا ذاتی معاملہ ہے اور مصنف ریاست کے جبر کی مخالفت کرتا ہے۔

عقیدہ یا نقطۂ نظر ایک فرد کا انفرادی معاملہ ہے۔ فرد کے اس حق پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔

طرزِ عمل بھی ایک فرد کا ذاتی معاملہ ہے۔ اسے کسی خاص لباس، رہن سہن یا اسلوبِ حیات کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ ریاست عوام پر جبر کے تحت یہ تمام چیزیں لاگو نہیں کر سکتی۔

سماج کو فرد اور جرم سے بچانے کے لیے ریاست قانون سازی کرے گی۔ گویا ریاست یہ حق رکھتی ہے کہ اجتماعی مفاد میں فرد کی آزادی پر کوئی قید لگائے۔

یہ قانون سازی لوگوں کے مشورے سے ہو گی اور اختلافات کی صورت میں اکثریت کی رائے فیصلہ کن ہو گی۔ اس طرح عوام نہ صرف حکمرانوں کو منتخب کریں گے بلکہ مقننہ کا بھی حصہ ہوں گے۔

> "آزادیِ رائے ایک ایسی بنیادی قدر ہے جس پر کوئی فرد، گروہ یا ریاست پابندی نہیں لگا سکتی۔ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ اگر کوئی فرد یا گروہ اپنی حد سے تجاوز کرتے ہوئے کسی کے حق کو دبانے کی کوشش کرے تو اس کے خلاف اقدام کرے۔ حد سے تجاوز کا تعین فطری، قانونی اور سماجی مسلمات کی بنیاد پر ہو گا۔"[۳۴]

مندرجہ بالا کالم میں مصنف نے لبرل اسلام کا تصور پیش کیا ہے۔ مصنف کے نزدیک لبرل ازم ایک رویہ بھی ہے اور نظریہ بھی جبکہ مذہب ان دونوں کا مجموعہ ہے۔ لبرل ازم کے نزدیک انسان ایک آزاد وجود

لے کر دنیا میں آیا ہے۔ انسان ارتقا کا ایک مرحلہ ہے اور کائنات میں ارتقا کا عمل لاکھوں سالوں سے جاری ہے۔ الحاد بطور نظریہ، لبرل ازم کی بنیاد ہے جب کہ مذہب کے مطابق انسان آزاد نہیں، خدا کا بندہ ہے اور اس کائنات کے خالق کا غلام ہے۔ اُس نے انسان کو تخلیق کیا۔ موت، زندگی کا اختتام نہیں بلکہ ایک عہد سے دوسرے عہد میں داخل ہونے کا نام ہے۔ ایک زمین سے دوسری زمین میں منتقل ہونے کا نام ہے۔ لبرل ازم آزادی کا قائل ہے اور مذہب حدود و قیود کا پابند کیونکہ یہ ریاست کے اندر تنظیم اور نظم و ضبط پیدا کرتا ہے، انتظامی امور میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اپنے کالم "اسلام، ریاست اور سیکولرازم" میں کالم نگار اس نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہیں کہ عام طور پر مذہبی ریاست اور اسلامی ریاست کی اصطلاحیں باہم مترادف تصور کی جاتی ہیں لیکن دونوں مختلف ہیں۔ مذہبی ریاست انگریزی کے لفظ Theocracy کا ترجمہ ہے جس کا مطلب مذہبی طبقے کی حکومت ہے۔ اس اصطلاح نے مغرب میں جنم لیا اور اس سے مراد کلیسا کی حکومت ہے۔ اگر اس اصطلاح کو مسلم معاشرے کے پس منظر میں دیکھا جائے تو اس سے مراد علما یا مذہبی طبقے کی حکومت ہے۔ اس لیے کالم نگار اس کے حق میں نہیں ہے۔

کالم نگار کے نزدیک مذہبی ریاست اور اسلامی ریاست میں فرق ہے۔ مذہبی ریاست سے مراد ایسی ریاست ہے جس میں مذہبی گروہ کی حکومت ہے جبکہ اسلامی ریاست ایسی ریاست ہو گی جو اسلام اور شریعت کے مطابق چلے گی لیکن دونوں صورتوں میں بہر حال مذہب ایک اہم سماجی عمل کی حیثیت سے معاشرے کی سب سے بڑی اخلاقی قوت رہا ہے۔ اگر سماج مذہب سے آزاد نہیں تو پھر وہ کوئی اخلاقی نظام ترتیب نہیں دے سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مذہبی اخلاقی نظام بھی مذہب کے اثرات سے خالی نہیں ہوتا کیونکہ اخلاق کو مابعد الطبیعاتی بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان ہی خیالات کا اظہار مصنف نے اپنی کتاب میں بھی کیا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ سماج ایک فطری ادارہ ہے جبکہ ریاست تمدن کے ارتقا کی صورت ہے۔ جمہوریت چونکہ خود انقلاب کا بدل ہے اس لیے اس نے انقلابی جدوجہد کو ختم کر دیا ہے اور جمہوریت نہ صرف انقلاب آفریں ہے بلکہ رومان پرور بھی ہے۔ ایک ایسے آئیڈیل ملک کا تصور جہاں لوگوں کی حکومت ہو گی، ایک سیاسی یوٹوپیا ہے۔

> "اسلام جب سماج سے وابستہ ہوتا ہے تو پھر افراد اور اقدار مخاطب ہوتے ہیں۔ اب معاشی اور سیاسی اداروں کی جو شکل بھی ہو، اسلام کی تعلیمات کے نتائج سامنے آتے ہیں۔ میں جو عرض کر رہا ہوں اس میں مذہب سماج سے وابستہ ہوتا ہے کسی ادارے سے نہیں۔ اسی لیے میں

ریاست کو مخاطب بنانے کے حق میں نہیں۔ اس پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ سماج بھی تو ریاست کی طرح ایک ادارہ ہے۔ میرا جواب ہو گا کہ سماج فطری ادارہ جب کہ ریاست تمدنی ارتقا کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے جسے کسی فطری ادارے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔" (۳۵)

اپنے کالم "اسلام، ریاست اور سیکولرازم" میں مصنف مذہب اور سیاست کے تعلق کو زیرِ بحث لاتا ہے۔ مصنف کے نزدیک اسلام ایک ایسی جوڑنے والی قوت ہے جو سیاست کو ایک نظامِ اخلاق کا پابند کرتی ہے اور دنیا میں انسانوں کی غیر معمولی اکثریت آج بھی مذہب کو اخلاقیات کا ماخذ سمجھتی ہے۔ اخلاق کو مابعد الطبیعات کے بجائے طبعیات سے متعلق کرنے کی کوشش ایک جدید تجربہ ہے اور مغرب اس معاشرے کا انتظام چلاتا ہے جو طبعیاتی نظام اخلاق کی بنیاد پر تشکیل کردہ ہے۔ مصنف اس کالم میں سماج، ریاست اور مذہب کے تعلق کو زیرِ بحث لاتا ہے۔

"ہر اخلاقی نظام مصنف کے ہاں کہیں نہ کہیں بہر حال مابعد الطبیعاتی اساسات کا مطالبہ کرتا ہے۔ اخلاقی نظام صرف مادی تناظر میں قائم نہیں رہ سکتا۔ تاریخ میں یہ اساس صرف مذہب نے ہی کامیابی کے ساتھ فراہم کی ہے۔" (۳۶)

مصنف کا خیال ہے کہ تمام الہامی مذاہب نہ صرف عبادات کی تربیت کرتے ہیں بلکہ اخلاقیات کو بھی بہتر بناتے ہیں۔ کالم نگار کے نزدیک مسلم معاشروں میں اسلام اور ریاست کے باہمی تعلق کو از سر نو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ وہ اپنے یوٹوپیا کے لیے جو عملی تجاویز پیش کرتے ہیں، ان میں سر فہرست نصاب تعلیم ہے۔

"جمہوریت خود ایک انقلاب ہے۔ اس نے انقلابی جدوجہد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے۔ اب اگر کوئی اصلاح کا علم بردار ہے تو اس کے لیے صرف تدریج کا طریقہ باقی ہے۔ اس کے سوا صرف ہیجان اور رومان، رومان ایک ایسے معاشرے کا جس میں صرف ایک طبقہ ہے۔ کوئی حاکم ہے نہ کوئی محکوم۔ وہ خواب دیکھتے ہیں کہ: "اب راج کرے گی خلقِ خدا، جو میں بھی ہوں، جو تم بھی ہو۔" (۳۷)

جمہوریت مصنف کے لیے ایک مثالی طرزِ حکومت اور اس پر مشتمل ریاست ایک مثالی ریاست ہے۔ مذکورہ کالم میں کالم نگار اہلِ پاکستان کے اندر جذبہ حب الوطنی اجاگر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جذبہ قوم اور مذہب کی قید سے آزاد ہے۔ زندگی فطرت سے ہم آہنگ ہو کر ہی آگے بڑھ سکتی ہے۔ ایک پاکستانی بچہ مسلم ہو

یا مسیحی، اس ملک کے لیے ایک طرح کے جذبات رکھتا ہے اور اس جذبہ حب الوطنی کی بنیاد نہ مذہب ہے اور نہ مفاد۔ یہ وطن سے وابستگی کا وہ فطری جذبہ ہے جو شعور کے دائرے میں پہنچے تو اس کی پہچان بن سکتا ہے۔ اس فطری جذبے کی تکمیل کرنا اب اکثریت کی ذمہ داری ہے اور یہ ذمہ داری اب اکثریت رکھنے والے مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے کہ وہ مذہبی و نسلی اختلافات کو بھلا کر اہلِ پاکستان کو ایک لڑی میں پرو دیں۔ انھیں اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ پاکستان کے بعد ان کی ذمہ داری یکسر بدل چکی ہے۔

اس کالم میں کالم نگار کا نقطۂ نظر رجائیت پسندی کی طرف مائل ہے۔ وہ منفی پروپیگنڈا اور Pesimist یاسیت پسند تجزیہ کاروں کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ پاکستان کو اللہ نے ہر قسم کے وسائل اور بہترین جغرافیائی اہمیت دی ہے، اس کا ایک آئین ہے۔ ملک کے اندر نظام صحیح چل رہا ہے اور سب سے بڑی بات کہ ملک اب جمہوریت کی پٹڑی پر چل پڑا ہے، جو مصنف کے نزدیک ہے بہترین طرزِ حکومت ہے۔ البتہ وہ اس بات پر مغموم نظر آتے ہیں کہ اس سب کے باوجود پاکستان کو اب تک قومی ریاست نہیں بنایا جاسکا۔

> "ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ پاکستان کو نظریاتی ریاست تسلیم کرنے کے بعد ہم اسے بیسویں صدی میں فروغ پانے والے قومی ریاست کے تصور سے ہم آہنگ بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔" (۳۸)

مصنف اپنے کالموں میں ایک جانب ملک میں ہونے والے مثبت اقدامات کی جانب توجہ دلاتے ہیں تو وہیں ان کمیوں اور خامیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں جنھیں دور کرنے سے درپیش مسائل میں کمی ہو سکتی ہے۔ جن میں سرِ فہرست تعلیم اور نصابِ تعلیم ہے۔ کالم نگار کے مطابق نصابِ تعلیم کی تشکیلِ نو اشد ضروری ہے۔ اس کے ساتھ وہ ان نسلی، فروعی اور لسانی تعصبات کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں جن کے باعث ایک دین، ایک نصب العین اور ایک ملک ہونے کے باوجود ہم سب ایک قومی ریاست کی صورت میں کیوں کر نہ ابھر سکے۔ ان کے نزدیک اس کی وجہ وہ مذہبی مفادات ہیں جن میں شیعہ سنی، بریلوی وہابی فرقوں کے تعصبات شامل ہیں۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ اردو کو بحیثیت قومی زبان تسلیم کرنے کے باوجود بھی ہم لسانی تعصبات اور ان کی بنیاد پر ہونے والے تفرقات کو ختم نہ کر سکے اور ان سوالات کے وہی جواب زیادہ عقلی، منطقی اور شرفِ انسانیت کے مطابق ہیں جو جمہوریت دیتی ہے۔ الہامی ہدایت اس کی تائید کرتی ہے اور انسانی تجربہ بھی۔ جمہوریت کی بحث صرف اس وقت نتیجہ خیز ہوگی جب یہ ریاست کے دائرے میں ہوگی۔

آگے چل کر کالم نگار سماج اور ریاست کو بھی زیرِ بحث لاتے ہیں ۔ ان کے بقول، ریاست ایک جغرافیے کی پابند ہے مگر سماج نہیں۔ اس لیے ریاست کی بحث کے لیے لازم ہے کہ یہ خاص جغرافیے کی حد میں ہو۔ ریاست کے لیے ایک سیاسی نظم ضروری ہے جب کہ سماج، اقدار اور روایات سے بنتا ہے۔ اقدار کا تعلق جغرافیے سے نہیں اور سماج اور ریاست کے فرق کو مدِ نظر رکھے بغیر اصلاحِ معاشرہ اور اصلاحِ ریاست کے موضوع کو گڈ مڈ کر دیا جاتا ہے تو کئی غلط بحثیں پروان چڑھتی ہیں۔ اِن خیالات کا اظہار انہوں نے مقالہ نگار کو دیئے گئے انٹرویو میں کیا۔

کالم نگار ملک میں مذہبی فرقے کی بالادستی کے بھی خلاف ہیں لیکن وہ دوسرے مسلمان ممالک کی طرح ملک میں مذہبی سرگرمیوں کی سرپرستی حکومت کے ذمے لگاتے ہیں۔ ان کا یہ مقصد ہے کہ اس طرح مذہبی سرگرمیوں کو اپنے قابو میں کرنے سے ملک میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کو کسی حد تک قابو کیا جاسکتا ہے۔ یوں حکومت ملک میں امن وامان کی صورت حال کو بہتر بنا سکے گی اور ایک امن پسند فلاحی ریاست کا قیام عمل میں لانا ممکن ہو گا جبکہ دوسری صورت میں مذہبی ریاست ملک میں اکثریتی مذہبی فرقے کی بالادستی عمل میں لائے گی جس کے باعث اقلیتوں کے حقوق غصب ہونے کا خدشہ ہے۔ اس کے برعکس ایک اسلامی ریاست شریعتِ اسلامی کے نفاذ کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں کے حقوق کا بھی خیال رکھتی ہے۔ سعودی عرب، ایران، ترکی، ہر ملک میں مدرسہ اور مسجد کی تعمیر کے لیے ریاست کی اجازت ضروری ہے۔ آئمہ مساجد کا انتخاب بھی ریاست کی ذمہ داری ہے۔ مسلمانوں کی روایت میں نمازِ جمعہ ہمیشہ سے مسلمانوں کا سیاسی اجتماع رہا تھا۔

آگے چل کر کالم نگاراس ضمن میں مثالی ریاست کے متعلق اپنا نقطہء نظر بیان کرتے ہیں۔ ان کے مطابق مثالی ریاست یا ریاستِ مدینہ یا خلافتِ راشدہ ایک استثنا تھا۔ یہ مختصر دور اپنے کی حکومت خدا کی خاص منشا اور رسول ﷺ کی سنت کا ظہور تھا یا پھر اہلِ عالم کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ ایک مثالی ریاست اس طرح کی ہونی چاہیے۔ لیکن کالم نگار کے نقطۂ نظر میں یہ کوئی عملی تصور نہیں ہے۔ کیوں کہ سیاست اور تاریخ میں ابھی تک کوئی ایسی ریاست نہیں گزری جسے ہم مثالی ریاست کہہ سکیں۔ ان کے خیال میں اگر عوام معاصر اہلِ سیاست کو مثالی سمجھتے ہیں یا ان کو مثالی روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ بہ ذاتِ خود ایک رومان پرور خیال کو فروغ دے رہے ہیں۔ اس لیے یوٹوپیا کا تصور نا ممکن ہے۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے انٹرویو میں بھی کیا۔

اس حوالے سے آئیڈیل Ideal کی تعریف مصنف کچھ یوں کرتے ہیں کہ، "لوگ ذہن میں ایک آئیڈیل تراشتے ہیں اور پھر گوشت پوست کے کسی انسان میں اس آئیڈیل کو مجسم دیکھتے ہیں اور یہ نام نہاد سیاست دان اور ان کے ساتھی عوام کی اسی سادہ لوحی کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان پر یہ ثابت کرتے کہ یہی تمہارے خوابوں کی تعبیر ہے۔ سیاست کی دنیا میں یہ کھیل برسوں سے جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔ اس سادہ لوحی کے بھی مدارج ہیں۔ کچھ لوگ خوابوں کو بکھرتا دیکھتے ہیں تو خیالی دنیا سے نکل آتے ہیں اور کچھ نہیں نکل پاتے تو اپنے خیالی پیکر کے لیے عذر تراشتے رہتے ہیں۔"

مصنف کے نقطۂ نظر کے مطابق یہ مثالیت پسندی یا Idealism صرف عوام کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اخبار اور ٹی وی کے تجزیے کا بھی یہی معیار ہے اور یہ تجزیہ کار عوام کی طرح سادہ لوح تو نہیں ہوتے ہیں بلکہ وہ اس بات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں کہ جب سیاست اور مذہب کی دنیا مثالی نہیں ہو سکتی ہے تو فوبیا دنیا کیونکر مثالی ہو سکتی ہے؟ یہ لوگ صرف عوام کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ انھوں نے عوامی خوابوں کی سوداگری کو بطور پیشہ اپنا لیا ہے۔ یہ نام نہاد تجزیہ کار اپنے مفاد کے لیے تاریخ کے سچے جھوٹے قصے سناتے ہیں اور ایک یوٹوپیا پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ کچھ اسلاموٹوپیا کے پیروکار ہیں۔ حضرت عمرؓ کو مثالی حکمران سمجھتے ہیں جن کی راتیں گلیوں میں گشت کرتے گزرتیں یا پھر مصلے پر آنسو بہاتے گزرتیں اور دن مزدوری کرتے اور لوگوں کے گھروں میں راشن فراہم کرتے گزر جاتے تھے۔ سیکولر تجزیہ نگار نے مغرب کو اپنا معبد اور آئیڈیل مان لیا ہے اور وہ معاصر مغرب کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

کالم نگار کے مطابق کچھ سادہ لوح لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ سیاست مثالی ہوتی ہے اور اس کا جواب بھی انسانی نفسیات کے مطالعے سے مل سکتا ہے۔ انسان آئیڈیلزم کی پیروی کرتا ہے جبکہ زندگی کا معاملہ یہ ہے کہ اسے حقیقت کی دنیا میں اپنی بقا کی تلاش کرنا ہوتا ہے اور زندگی گزارنے کے لیے آپ کو حقیقت پسند ہونا پڑتا ہے۔

کالم نگار ذاتی طور پر نہ آئیڈیلزم پر یقین رکھتے ہیں اور نہ مثالی ریاست پر لیکن وہ اپنے کالموں اور کتابوں میں وہ تجاویز ضرور پیش کرتے ہیں جن کے ذریعے ایک بہتر زندگی کا تصور پیش کیا جا سکتا ہے۔ میڈیا جان بوجھ کر گوشت پوست کے انسان کو دیوتا اور مخالفین کو شیطان ثابت کرتا ہے جبکہ عوام سادہ لوحی میں ان کی باتوں میں آ جاتے ہیں۔ یہ تجزیہ کار یا تو تاریخ سے یا معاصر معاشروں کو مثالی بنا کر پیش کرتے ہیں لیکن کوئی بھی ریاست کبھی مثالی نہیں ہو سکتی۔ ہر ریاست میں کچھ نہ کچھ خامیاں ضرور ہوں گی۔ انسانی کوششوں سے

مسائل کا حل تلاش کر کے حالات کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ جب کہ ریاستِ مدینہ مصنف کے نزدیک ایک معجزہ اور غیر انسانی ماورائی ارفع و اعلیٰ صلاحیتوں کا مظہر تھی۔ ایک مثالی ریاست کی تشکیل کے لیے مثالی (Ideal) لیڈر کو اخلاقی قدروں کی قدر اہمیت دینا ہو گی اور اخلاقی تقاضوں، سیاسی مطالبات اور صلاحیت و مصلحت میں توازن قائم کرنا ہو گا۔ مصنف کے مطابق اہلِ صحافت کو یہ چاہیے کہ انسانوں کو دیوتا بنانے کے بجائے انھیں انسان ہی رہنے دیں اور عوام کی سادہ لوحی کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں۔

کالم نگار کے مطابق جمہوریت کی اس بحث میں جب مذہب کو شامل کیا جاتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ خلافت ایک دینی طرزِ حکومت ہے جو جمہوریت کے خلاف ہے۔ ان کے نزدیک خلافت ایک دینی نہیں بلکہ سیاسی اصطلاح ہے[1]۔ قرآن مجید میں سورۃ نور کی آیت نمبر ۵۶،۵۷ میں اہلِ ایمان سے اللہ کے اس وعدے کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ انہیں زمین پہ خلافت دے گا جو لغوی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مولانا مودودی نے سورۃ نور کی اس آیت کے حوالے سے لکھا ہے جس کا مفہوم اس طرح ہے کہ خلافت کو، کسی شخص یا طبقے کے تمام مومنین کے اختیارات سلب کر کے انھیں اپنے اندر مرکوز کر لینے کا حق نہیں نہ کوئی شخص یا طبقہ اپنے حق میں خدا کی خصوصی خلافت کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ یہ چیز اسلامی خلافت کو ملوکیت، طبقاتی حکومت اور مذہبی پیشواؤں کی حکومت سے الگ کر کے جمہوریت کے رُخ کی طرف موڑتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مولانا نے مغربی جمہوریت کے ساتھ یہ فرق واضح کیا ہے کہ وہ عوامی حاکمیت کو تسلیم کرتی ہے جبکہ اس کے مقابل اسلام اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کرتا ہے۔ جب پاکستانی ریاست نے ۱۹۷۳ء کے آئین میں قرآن و سنت کی بالادستی کو قبول کیا تو یہ فرق بھی باقی نہیں رہا اور یوں پاکستانی جمہوریت خلافت سے قریب تر ہے۔

کالم نگار نے اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے اپنا خیال مختلف کالموں میں تسلسل اور روایت کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس پر بحث بھی کی ہے۔ یوٹوپیا کا تصور اور اس کے خالق کے متعلق اگر دیکھا جائے تو یہ ایک تصوراتی دنیا یا آئیڈیلزم کی جانب اشارہ کرتا ہے لیکن خورشید ندیم کا یوٹوپیا ایک لحاظ سے ایک مثالی ریاست ہونے کے ساتھ ساتھ عملی ریاست کا بھی تصور پیش کرتا ہے۔ اس باب میں انھوں نے اس کے متعلق مختلف توجیہات کا ذکر نہایت تفصیل کے ساتھ اپنے کالموں میں کیا ہے۔ اگر بات یوٹوپیا کی کی جائے جو کہ حاصلِ مضمون بھی ہے تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ریاستِ مدینہ کا وجود مصنف کا یوٹوپیا تو ہے لیکن اس

---

[1] خورشید احمد نعیم، "مسلم سماج اور سیکولرازم، ادارہ تعلیم و تحقیق، اسلام آباد

کی تشکیل میں وہ جذبات کے بجائے عقلی توضیحات پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ریاستِ مدینہ کا قیام ایک معجزاتی عمل تھا جو آج کے دور میں ممکن نہیں ہے۔ اس کی توضیح وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ ریاستِ مدینہ ایک خدائی فیصلہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے پہلے سے طے کیا ہوا تھا۔ اللہ کا خاص قانون تھا جس کی تکمیل کے لیے فرشتے مدد کے لیے اترتے تھے۔ اب کوئی الہامی فیصلہ نہیں آنے والا لیکن ہم اس ماڈل پر اسلامی ریاست قائم کرنے کی کوشش ضرور کر سکتے ہیں۔

جمہوریت کالم نگار کا پسندیدہ طرزِ حکومت ہے کیونکہ اس میں اختیارات کی تقسیم مقامی حکومت تک ہوتی ہے جبکہ خلافت آمرانہ نظام اور اختیارات کا شخصی ارتکاز ہے۔ خلافت کو کالم نگار اس لیے بھی مثالی طرزِ ریاست یا یوٹوپیا قرار نہیں دیتے کیونکہ وہ اسے دینی نہیں، سیاسی اصطلاح سمجھتے ہیں اور اس کی توجیہہ وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ قرآن پاک میں اس کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ کالم نگار کے نزدیک مغربی ممالک کی جمہوریت کو کسی حد تک قبول کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں عوام کو بنیادی آزادی دی جاتی ہے یا پھر ماضی میں خلافتِ راشدہ اور اس سے قبل حضرت یوسفؑ کی ریاست کو کسی حد تک مثالی ریاست کہا جاسکتا ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ اس دور میں کوئی خرابی نہیں ہے تو غلط ہوگا لیکن وہ اس سلسلے میں مغرب کی کوششوں کو سراہتے ہیں کیونکہ جمہوریت اجتماعی دانش کی تلاش میں ہے اور بہر حال خوب سے خوب تر کی تلاش جاری ہے۔

یہی کالم نگار کا یوٹوپیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار مصنف نے محققہ کے ساتھ اپنے انٹرویو میں بھی کیا۔

وہ اس مثالی ریاست کو مذہبی ریاست نہیں بلکہ ایک سیاسی ریاست کا درجہ دیتے ہیں جس میں مشرکینِ مکہ، یہود و عیسائی سب مل کر اپنے مذہب کے مطابق آزادانہ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ ان پر کوئی جبر یا عذر نہیں ہے۔ اس بحث کے دوران دوسرا نکتہ جو مصنف زیرِ بحث لاتے ہیں وہ سیکولر اور پاپولر مذہب کا تصور ہے۔ پاپولر مذہب وہ ہے جو ریاست کے فیصلوں پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے جب کہ سیکولر مذہب کا تصور ان کے بقول مملکتِ پاکستان میں بری طرح سے رد کر دیا گیا ہے۔ ایک پاپولر مذہب ریاست کے انتظام و انصرام پر اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ اس کی جڑیں عوام میں نہیں ہوتی ہیں۔ یہ بات کالم نگار کے پسندیدہ طرزِ حکومت یعنی جمہوریت کے حق میں ہے۔ جمہوریت میں طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں جو حکومت کو تبدیل کر سکتے ہیں اور اپنی مرضی سے فیصلے کروا سکتے ہیں۔ جیسا کہ جمہوریت سے متعلق معروف مقولہ ہے کہ:

Democracy is th government of the people, for th people and by the people.

کالم نگار جمہوریت کا تقابل فسطائیت، بادشاہت اور خلافت سے کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جمہوریت ہی بہترین نظامِ حکومت اور نظامِ عدل ہے۔ فسطائیت میں طاقت کا منبع وہ حکمران ہوتے ہیں جو اس کے نشے میں عوام کو بھیڑ بکریوں کی طرح روند دیتے ہیں۔ اس کی مثال وہ انقلابِ فرانس سے دیتے ہیں جو فسطائیت کے خلاف لوگوں کا تاریخی ردِ عمل تھا۔

ساتھ ہی کالم نگار خلافت کو موجودہ حالات میں مناسب طرزِ حکومت میں قرار دیتے ہیں اور اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ خلافت میں طرزِ حکومت کے ساتھ ساتھ حکمران طبقہ بھی مثالی ہوتا ہے۔ کسی ایسے شخص کو مسلمانوں کا خلیفہ ہونے کا حق حاصل نہیں ہے جو کفر و کذب اور دوسری معصیت میں مبتلا ہو۔ اس کی مثال یزید کی حکومت کے خلاف نواسۂ رسول ﷺ کا اعلانِ جنگ تھا۔

یوٹوپیا کے بنیادی عناصر آئیڈیلزم اور perfectionism دونوں خورشید ندیم کے یوٹوپیا کے بھی بنیادی اجزا ہیں۔ اوریا مقبول جان اور خورشید ندیم دونوں ہی اسلامی طرزِ حکومت کو آئیڈیل قرار دیتے ہیں لیکن خورشید ندیم اس کی تشکیل کے لیے عقلی توضیحات اور عملی لائحہ عمل تجویز کرتے ہیں جب کہ اوریا مقبول جان کے ہاں تخیل کی حکمرانی اور جذبات حاوی ہیں، ماضی پرستی کا عنصر نمایاں ہے۔ اوریا مقبول جان کے مطابق جذبۂ ایمانی پیدا ہو تو آج بھی فضائے بدر پیدا ہو سکتی ہے۔ خورشید ندیم اسی بات کو عقلی توجیہہ کے ساتھ یوں بیان کرتے ہیں کہ آج نہ ایمان کی قوت ہے اور نہ وہ طاقت، اس لیے بدر کے مجاہدین کے مقابلے میں اب دس گنا زیادہ افرادی قوت کی ضرورت ہے اور یہ دور معجزوں کا نہیں ہے جبکہ اوریا معجزات کے منتظر ہیں۔

اوریا مقبول جان کا آئیڈیل طالبان کی حکومت ہے جس کو وہ خلافِ راشدہ کا تسلسل قرار دے چکے ہیں لیکن خورشید ندیم کے بقول اب ایسی ریاست کا عمل ناممکنات میں شامل ہے۔ وہ طالبان کی حکومت کو عملی قرار نہیں دیتے ہیں اور اس کی توجیہہ یہ پیش کرتے ہیں کہ اگر یہ عملی ریاست ہوتی تو اس کا وجود اتنی جلد صفحہ ہستی سے نہ مٹتا۔

نقطہ ٔ نظر کے حوالے سے اوریا مقبول جان خیال پرست اور بنیاد پسند ہیں جب کہ خورشید ندیم مدلل، منطقی اور عملی طرزِ عمل کے حامی نظر آتے ہیں۔ اوریا مقبول جان جماعت اخوان المسلمین کے منشور کی حمایت کرتے ہیں جو مسلم امہ کے اتحاد کی تجویز پیش کرتی ہے اور اسلام کی بنیادی تعلیمات کو تمام مسائل کا حل بتاتی ہے جبکہ اس کے برعکس خورشید احمد ندیم انڈونیشیا کی تنظیم بنضۃ العلما کے منشور کی حمایت کرتے ہیں۔ اس تنظیم کا بنیادی منشور یہ ہے کہ مذہب کو ریاست کے بجائے معاشرے سے متعلق ہونا چاہیے۔ مذہب

معاشرے کے افراد کی اخلاقیات کو مجموعی طور پر متاثر کرتا ہے جبکہ مثالی ریاست میں حکمران جمہوری طریقے سے منتخب ہوتے ہیں اور عوام کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس کشور ناہید اپنے کالموں میں ان دونوں معنوں کے بالمقابل عورتوں کی آزادی اور ان کے حقوق کی جنگ لڑتی ہیں۔ وہ تانیثی یوٹوپیا پر مبنی ملک یا ریاست کو اپنے خوابوں کا جزیرہ قرار دیتی ہیں۔

تانیثی یوٹوپیا

لٹریری انسائیکلوپیڈیا کے مطابق:

"A feminist Utopia can be defined as a narrative about a society that is free from the patriarchial subordination of women". (39)

تانیثی یوٹوپیا سے مراد ایک ایسا معاشرہ ہے جو عورت کو مرد کے روایتی تسلط سے آزادی دلاتا ہے۔ وہ تمام حقوق جو عورت کو کسی بھی مذہب اور قانون نے دیے ہوں، وہ اب اس تانیثی معاشرے میں اسے حاصل ہوں گے۔ یہ ایک ایسا مثالی معاشرہ ہوگا جو مرد اور عورت کے تعلقات کی از سر نو تشریح کرتا ہو۔ ایسے معاشرے کا تعلق زیادہ تر مستقبل سے ہوتا ہے۔ تانیثی ادیب مستقبل میں عورت کے حوالے سے ان تمام تبدیلیوں کا خواہاں نظر آتا ہے جو عورت کے آنے والے کل کو اس کے آج سے بہتر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا دوسرا نام اس کا تانیثی یوٹوپیا ہے۔

انگریزی لفظ Feminist لاطینی لفظ فیمنا سے مستعار ہے اور اب انگریزی میں ایک مخصوص معنی میں اصطلاح کے طور پر رائج ہے۔ فیمن ازم کے معنی لاطینی میں "عورت" فرانسیسی میں "عورت کے حقوق" اور انگریزی میں "صنفی برابری کی تحریک" کے ہیں۔ اگر بات تانیثی یوٹوپیا اور اس پر تحریر ہونے والے ادب کی کی جائے تو تھامس مور (۱۵۱٦ء) سے بھی بہت پہلے ۱۴۰۵ء میں Christine de Pizam نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "The City of Ladies" تھا۔ اس کتاب میں اس نے ایک ایسے شہر کا تصور پیش کیا جس میں صرف خواتین رہتی ہیں اور اس میں خواتین ہی کی حکومت ہوتی ہے۔ مصنفہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کو خواب میں اس شہر کے بارے میں آگہی ملی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ خدا چاہتا ہے کہ ایک ایسا ملک ہو جس میں خواتین کی حکومت ہو۔

۱۷٦۲ء میں Sarah Scott نے Millennium Hall کے نام سے تانیثی یوٹوپیا تشکیل دیا لیکن تانیثی ادب میں اس وقت زیادہ تحریک پیدا ہوئی جب خواتین کے معاشرتی اور سیاسی کردار میں تبدیلی آنا

شروع ہوئی۔ ۱۸۳۶ء میں امریکی مصنفہ میری گفتھ (Marry Giffith) نے Three Hundred Tears کے نام سے ایک ناول لکھا۔ یہ وہ وقت تھا جب خواتین کھیتوں سے نکل کر ملوں میں کام کرنا شروع ہو گئی تھیں۔ چیرلٹ پرکسن نے Loving Mountan اور Herland کے نام سے ناول بھی اسی دور میں تحریر کیے جب خواتین کے لیے تعلیم اور روزگار کے دروازے کھولے جارہے تھے۔ اس وقت نیوزی لینڈ میں بھی تانیثیت کی تحریک زیادہ متحرک تھی۔ ۱۸۹۳ء میں خواتین کو ووٹ کا حق دیا گیا۔ تانیثی ادب میں عورت کے حقوق، آزادی اور بچوں کی دیکھ بھال کے متعلق مسائل پر آواز اٹھائی گئی۔ وہ عورت کے لیے اس آزادی اور فضا کے طلب گار ہیں جو اب تک اس کو میسر نہ ہو سکی تھی۔ اس روایتی حیثیت اور امتیازی سلوک کا ذکر ان ناولوں میں نظر آتا ہے جو عورت کو آگے بڑھنے سے روکتے ہیں۔ تانیثی یوٹو پیا دراصل ایک ایسے یوٹوپیا کا خواہش مند ہے جو موجودہ دنیا کی بالکل نفی کرتا ہے اور معاشرے کی غیر منطقی معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ تانیثی یوٹوپیا موجودہ صورت حال کے تناظر میں ایک ردِ عمل کے طور پر سامنے آتا ہے جو دنیا کو ایک نیا اور قابلِ عمل دستور دینے کا دعویٰ کرتا ہے۔ تھامس مور کے یوٹوپیا کی مانند تانیثی یوٹوپیا کا ایک متعین حدود اربعہ ہوتا ہے جس طرح کرسٹائن ڈی پیزا نے عورتوں کے لیے ایک علیحدہ شہر کو یوٹوپیا قرار دیا ہے۔

تھامس مارکس جو، پا میگزین کی ڈپٹی ڈائریکٹر ہیں کے مطابق:

> "As Utopian vision is concened with the creation of power relations, so its architecture can only be under stood in terms of power and bounds".(40)

تھامس مارکس کے مطابق تانیثی یوٹوپیا کی تشکیل کے لیے طاقت کے محور کو تبدیل کرنا ہوگا۔ اب مرد کی بجائے عورت کو اس طاقت کا مرکز بنانا ہوگا۔ تانیثی یوٹوپیا سے مراد ایک ایسی تصوراتی دنیا کی تشکیل ہے جس میں رائج تمام قوانین کا اطلاق عورت کے حقوق پر ہوگا۔ The City of Ladies تانیثی یوٹوپیا کے موضوع پر تحریر کی گئی اولین و بہترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔ ۱۵ویں صدی کے آغاز تک بہت سے تانیثی ادیبوں کا یہ خیال تھا کہ یوٹوپیا کی تخلیق کے لیے تصوراتی حقائق سے زیادہ زمینی حقائق کا ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ City of Ladies میں ایک تصوراتی مثالی شہر کا ذکر ہے جس میں خواتین کو نسلی اور جنسی امتیاز کے بجائے ذاتی صلاحیتوں کی بنیاد پر جانا اور مانا جائے گا۔ مصنف کرسٹائن ڈی پزائن کے نزدیک حالات، جنگیں اور ماحولیاتی تباہ کاریاں یہ سب وہ عوامل ہیں جو ایک اور تصوراتی دنیا کی تخلیق کی خواہش کے جنم کا باعث بنتے

ہیں جن کے نتیجے میں مصنف ایک ایسی مثالی تصوراتی دنیا کی تخلیق کرتا ہے جو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔

۱۹۱۵ء میں چارلیس گلیمر کی کہانی میں عورت کو اعلیٰ مقام پر دکھایا گیا ہے جس کا نام Her Land تھا۔ وہ ایک ایسے معاشرے کی تصویر پیش کرتا ہے جس میں مردوں کو تمام برائیوں کا ذمہ دار جانا جاتا تھا۔ ۱۹۸۸ء میں Sheri Stapper نے Gate to Women Country کے نام سے تانیثی یوٹوپیا تحریر کیا جس میں عورت ملک کے سیاسی امور دیکھتی ہے جبکہ مرد دفاعی امور سنبھالتے ہیں۔ "شور آف ویمن" کے برعکس اس یوٹوپیا میں مرد اور عورت کے کردار میں ایک وزن اور تناسب کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ مردوں کو مکمل طور پر تانیثی یوٹوپیا سے بے دخل کرنے کے بجائے ان کو دفاع کی ذمہ داری دی گئی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تمام یوٹوپیا کا انجام ڈسٹوپیا پر ہوتا ہے۔ مصنف کو اس حقیقت کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ فطرت سے جنگ اور مخالفت تباہی اور ہلاکت کا باعث بنتی ہے۔ حقیقت سے فرار ممکن نہیں ہے۔ گو کہ نفسیات کا نظریہء فراریت، فرار کے رجحان کو فرد کے اطمینان کا باعث قرار دیتا ہے۔ انسان زیادہ دیر تک حقیقت سے منہ موڑ نہیں سکتا۔ یہ ضروری ہے کہ جن حقوق کا وعدہ خواتین سے مذہب اور قانون نے کیا ہے، وہ ضرور انھیں ملنے چاہئیں۔ کم از کم اس کے وجود کو تسلیم کیا جانا چاہیے جس کا تقاضا تمام Feminists کی بنیادی مانگ ہے۔ Erin Mckenna کے نزدیک:

> "Forfeiting Utopian thinking is a kin forfeiting one's future. Utopia allow social change and in doing so, connects to their construction". (41)

ایرن مکینا کے نزدیک یوٹوپیائی تصورات کو ضبط کرنا یا ان کو تسخیر کرنا دراصل مستقبل کے بارے میں اپنے خیالات اور خدشات کو تسخیر کرنے کے برابر ہے یا پھر مستقبل پر حکومت کرنا ہے۔ یوٹوپیا معاشرے کو مثالی خطوط پر استوار کرنے کے لیے وہ تمام قابلِ عمل تجاویز پیش کرتا ہے جن پر عمل کر کے خواتین کو بالخصوص اور عوام کو بالعموم یکساں حقوق حاصل ہوں گے۔ تانیثی ادب پر تحریر کی گئی سب سے مستند کتاب ۱۹۸۶ء میں تحریر کی گئی Chaniele Sargent کی The Shore of Women ہے۔ اس کہانی میں مردوں کو نیوکلر ہتھیاروں کی ایجاد اور اس کے نتیجے میں ہونے والی تباہ کاری کا ذمہ قرار دیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے طاقت اور اختیار ان سے چھین لیا جاتا ہے اور انھیں شہر سے نکال دیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں خواتین طاقت اور اختیار کے ایوانوں میں داخل ہو جاتی ہیں۔ وہ تعلم یافتہ ہیں اس لیے سائنس دان، انجینئر اور ڈاکٹر کے

فرائض انجام دیتی ہیں۔ عورتیں ایک دیواروں والے شہر میں رہتی ہیں جہاں مردوں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ مرد خانہ بدوشانہ زندگی گزارتے ہیں جبکہ خواتین ان کی غیر موجودگی میں محفوظ، صحت مند اور تعلیم یافتہ زندگی گزار رہی ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس مرد غیر تعلیم یافتہ اور بے روزگار ہیں۔ Shore of Women میں نہ صرف مرد اور عورت کے رشتے کی وضاحت کی گئی ہے بلکہ جنس سے متعلق بھی بحث کی گئی ہے۔ اس کہانی میں عورت، ثقافت اور فطرت کے تعلق پر بحث کی گئی ہے۔ خواتین طاقت ور ہیں اور تمام سیاسی و جنسی معاملات پر ان کا اختیار ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ Shore of Women ایک مکمل تانیثی یوٹوپیا ہے۔ یہ تحریک پندرہویں صدی سے شروع ہو کر جدید عہد تک آتی ہے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر، تانیثیت کی پہلی لہر کا آغاز ۱۸۴۰ء میں ہوا جبکہ تانیثی یوٹوپیائی خیالات پر مشتمل ادب کا آغاز ۱۹۶۰ء کے بعد ہوا جب تانیثیت کے حوالے سے دوسری لہر کا آغاز ہوا۔ تانیثیت کی دوسری لہر کا دورانیہ ۱۹۶۰ء تا ۱۹۹۰ء تک ہے۔ تانیثی یوٹوپیا پر مبنی ادب معاشرے کے اصول وضوابط میں ایک ایسی تبدیلی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو عورت کو ایک طاقتور منصب عطا کرتا ہے۔

کشور ناہید کے حالاتِ زندگی

۳فروری ۱۹۴۰ء کو بلند شہر (ہندوستان) میں سید مولوی کے گھر میں ایک قدامت پسند گھٹے ہوئے ماحول میں پرورش پانے والی کشور ناہید نے اپنی زندگی کے تمام فیصلے روایت سے ہٹ کر کیے۔ نویں جماعت کے بعد سے ہی اخبار میں لکھنے کا آغاز کیا۔ میٹرک کرنے کے بعد خاندان کی دوسری لڑکیوں کے برعکس ضد کر کے کالج میں داخلہ لیا۔ فرسٹ ایئر سے شعر وشاعری کا سلسلہ شروع کیا اور گھر والوں کی شدید مخالفت کے باوجود علم کا سفر جاری رکھا۔ زمانہ طالب علمی سے ہی تقریری مقابلوں اور مشاعروں میں حصہ لیتی رہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے کیا۔ اسی دوران اپنے ہم جماعت یوسف کامران سے دوستی اور بعدازاں گھر والوں کی مخالفت کے باوجود نکاح کیا۔ اس شادی سے ان کے دو صاحب زادے ہیں۔ ان کے شوہر کا انتقال ۱۹۸۴ء میں ہوا۔

تصانیف

کشور ناہید کے کلام کا انگریزی اور ہسپانوی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ کشور نے خود بھی کئی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کے لیے بھی کام کیا ہے۔

کلیات: دشتِ قیس میں لیلیٰ، بری عورت کتھا (خود نوشت)، بری عورت کے خطوط، شناسائیاں رسوائیاں (یادداشتیں)، ورق ورق آئینہ (کالم)، باقی ماندہ خواب، لیلیٰ خالد (خود نوشت)، زیتون (ناول ترجمہ)، آجاؤ افریقا (سفر نامہ)، خواتین افسانہ نگار (انتخاب ۱۹۳۰ تا ۱۹۹۰ء)، عورت زبانِ خلق سے زبانِ حال تک (مرتب مضامین)، عورت خواب اور خاک کے درمیاں، لبِ گویا (غزلیں)، بے نام مسافت (نظمیں)، گلیاں، دھوپ دروازے (شاعری)، نظمیں (تراجم)، فتنہ سامانیِ دل (شاعری)، سیاہ حاشیے میں گلابی رنگ، خیالی شخص سے مقابلہ (نثری نظمیں)، میں پہلے جنم میں رات تھی (شاعری)، سوختہ سامانیِ دل (شاعری)، The Screams of an illegi timate voice.، Women myth and realitiy، وحشت اور بارود میں لپٹی شاعری۔

ادارت

انتخاب برائے مزاحمتی ادب ۱۹۷۷ء، چیف ایڈیٹر برائے فیملی پلاننگ میگزین ۱۹۷۷، ترجمہ اور رپورٹ برائے انسانی حقوق، ہم عصر اہلِ قلم پر کتاب ۱۹۷۸ء، ۸۷ء، ۸۵ء، سال کا نتیجہ پاکستانی ادب، چالیس سال کا نتیجہ پاکستانی ادب ۱۹۸۷ء، نتیجہ ادب برائے سارک ممالک، اداکاری و صداکاری پر بارہ کتابیں، اٹھارہ منتخب مصوروں کے تذکرے ۱۹۸۵ء، ۷ ۹۷ - ۱۹۹۴ء، تدوین برائے اساتذہ موسیقی آف پاکستان ۹۷ - ۱۹۹۴ء

کشور ناہید پر کیا گیا تحقیقی کام:

۱۔ برکلے یونیورسٹی میں مس انیسا نے کشور ناہید کے شعری اور نسوانی تناظر میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

۲۔ آمنہ بلقیس نے لندن یونیورسٹی سے کشور ناہید کی شخصیت و فن پر تحقیق کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔

۳۔ کشور ناہید کی فیمنسٹ تھیوری پر مقالہ تحریر کر کے محترمہ مہوش نے نیویارک یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔

۴۔ پاکستان کی بیش تر یونیورسٹیوں میں ایم اے کی سطح پر کشور کی شخصیت و فن پر بے شمار مقالے تحریر کیے گئے۔

تراجم

کشور ناہید کی شاعری کو انگلش میں ترجمہ کیا گیا۔ ان کے دو انگریزی تراجم شائع ہو چکے ہیں۔

The Distance of Shoot 1990

The Scream of an illegitimate Voice 2008

وہ طویل عرصے سے روزنامہ جنگ میں کالم لکھ رہی ہیں۔

کشور ناہید بحیثیت تانیثیت پسند کالم نگار:

کشور ناہید کے مطابق اپنی ذات کا وہ شعور اور آگاہی جو انھوں نے وقت اور تعلیم کے ساتھ حاصل کیا ہے، انھیں اس خود آگہی کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ تانیثیت پسندوں کے نزدیک عورت کو ہمیشہ پدری نظام اور مردانہ تصورات کو مستحکم کرنے کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشور ناہید کے نزدیک اگر عورت کو سمجھنے کی کوشش کی بھی گئی ہے تو مرد کے نقطۂ نظر سے، اسی لیے وہ خود کو مرد کے نقطۂ نظر سے دیکھتی اور پرکھتی ہے۔ اسی بات کی جانب میری این فرگساں نے اپنی کتاب میں یوں اشارہ دیا تھا۔

> "Man has been defined by his relationship to the outside world… whereas woman has been defined in relationship to man". (42)

جس کی مثال ہمارے معاشرے میں "بہشتی زیور" اور "مراۃ العروس" سے دی جا سکتی ہے جس میں عورت کی تربیت اس انداز سے کی جاتی ہے کہ وہ ہمیشہ مرد اور پدری نظام کا کردار بن کر رہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کتابوں کے خالق مرد حضرات ہیں۔ اس لیے معاشرہ بھی عورت کو مرد کی نظر سے دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ اگر ہمارے ملک میں تانیثیت کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس نسوانی تحریک میں زہرہ نگاہ، ادا جعفری، زاہدہ حنا اور کشور ناہید کے نام سامنے آتے ہیں لیکن اگر مغرب میں پروان چڑھنے والی تحریکِ نسواں کی اردو میں کہیں مثال دی جا سکتی ہے تو وہ کشور ناہید کی ہی تحریر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مغرب کے معاشرے میں عورت کے مقام کو کسی حد تک مثالی قرار دیتی ہیں۔ مقالہ نگار کو دیے گئے انٹرویو میں اضھوں نے کہا کہ اگر آج عورت کو تعلیم حاصل کرنے اور نوکری کرنے کا حق ملا ہے تو یہ کل کا وہ تانیثی یوٹوپیا ہے جس کی تکمیل آج نظر آتی ہے۔

تانیثی یوٹوپیا سے مراد ایک ایسی تصوراتی دنیا کا وجود ہے جس میں معاشرے کے اندر عورت کے ساتھ صنفی امتیاز نہ برتا جائے گا۔ ایک ایسی آئیڈیل یا مثالی زندگی کا تصور جہاں عورتوں کے ساتھ روایتی ناانصافی کا سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔ تانیثی یوٹوپیا پر مبنی ادب میں اکثر مردوں کا وجود ہی نہیں ہوتا ہے، جو غیر منطقی اور ناممکن نظر آتا ہے۔

عہدِ حاضر کی نمائندہ لکھاری کشور ناہید اکیسویں صدی کی ترجمان ادیبہ، شاعرہ اور کالم نویس کے طور پر ابھرتی ہیں۔ انھوں نے وقت کے بدلتے تقاضوں میں خود کو ڈھالا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وقت کو خود کے مطابق بدلا تو بے جا نہ ہوگا۔ کشور ناہید نے ادب کی تقریباً تمام اصناف میں قسمت آزمائی کی جن میں شاعری، نثر، تراجم اور کالم نویسی شامل ہے۔ خود کو ہر صنفِ ادب میں منوانے کے بعد وہ اکیسویں صدی کی ممتاز ادبی کالم نگار کی حیثیت سے ابھری ہیں۔ وہ عہدِ جدید کے تقاضوں اور ترجیحات سے بہ خوبی واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کالم عصری شعور کے عکاس ہیں۔ اس کے ساتھ اردو زبان کی وسیع دامنی کے باعث انھوں نے اپنا ایک منفرد اور اچھوتا اسلوب بھی قائم کیا جو اُن کی پہچان ہے۔ اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو کشور ناہید کی ہمہ جہت شخصیت میدانِ صحافت میں پوری طرح سے جلوہ گر نظر آتی ہے۔ کشور ناہید نے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں کالم لکھے۔ فنِ صحافت میں اپنے کیریئر کا آغاز انھوں نے رسالہ "پاک جمہوریت" کی ادارت سنبھالنے کے ساتھ کیا۔ کچھ عرصہ کے لیے وہ محکمہ اطلاعات و نشریات کے ادبی مجلہ "ماہِ نو" کی چیف ایڈیٹر کے منصب پر بھی فائز رہیں۔

اس کے بعد کالم نویسی کا آغاز کیا۔ ابتدا میں انگریزی اخبار "فرنٹیئر پوسٹ" سے انگریزی کالم نگاری کا شروع کی۔ انگریزی کالم نویسی کا یہ دور ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۹ء تک محیط تھا۔ ۱۹۹۹ء میں انھوں نے روزنامہ جنگ سے وابستگی اختیار کرلی۔ ان کا یہ سفر اب تک جاری و ساری ہے۔ ان کے کالموں کے تین مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ۱۔ "دکانِ ہنر"، ۲۔ "ورق ورق آئینہ"، ۳۔ گمشدہ یادوں کی واپسی"۔ دکانِ ہنر "۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں موجود کالم نہ صرف اردو ادب بلکہ ملکی و غیر ملکی حالات و واقعات کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ "ورق ورق آئینہ "کالموں کا دوسرا مجموعہ ہے جو ۲۰۰۶ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کتاب میں موجود کالم ملکی و غیر ملکی ادب، ثقافت، سیاست اور دیگر حالات و واقعات اور عورت کے مقام و مرتبہ جیسے موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ کالموں کا تیسرا مجموعہ "گمشدہ یادوں کی واپسی" ہے جو ۲۰۱۶ء میں شائع کیا گیا۔ ان کالموں

میں کشور ناہید نے نہ صرف پاکستان کے داخلی حالات پر سیر حاصل بحث کی ہے بلکہ عالمی مسائل پر بھی اپنا نقطۂ نظر بلاخوف وخطر پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں،

> "غزلوں کے مجموعے "لبِ گویا" پر آدم جی ادبی انعام ملا۔ حکومتِ پاکستان نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں حسنِ کارکردگی کے تمغے سے بھی نوازا۔" (۴۳)

کشور ناہید کے کالموں کے تجزیاتی مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کو کالموں کو بلحاظِ موضوع مختلف اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ نثر اور شاعری سے ان کی گہری وابستگی ہے اور شعر و ادب کے حوالے سے وہ نہ صرف ملکی بلکہ عالمی ادب کا بھی وسیع مطالعہ رکھتی ہیں۔ اپنے اس علم کی بنیاد پر عالمی ادب کے موضوعات کو اردو ادب میں بیان کرنے کی بھی ماہرانہ قدرت رکھتی ہیں۔ انھوں نے نہ صرف ادبی موضوعات پر کالم تحریر کیے بلکہ مختلف ادبی شخصیات کے نظریات کا بھی اپنے کالموں میں خوب صورتی کے ساتھ احاطہ کیا ہے۔ ادبی کالم نگاری کی، وحید الرحمٰن خان نے نہایت جامع تعریف کی ہے۔

> "ادبی کالم سے مرادی اخبار میں شائع ہونے والی وہ بے ساختہ تحریر ہے جس کا موضوع سراسر ادبی ہو۔ ظاہر ہے کہ موضوع کے ساتھ ساتھ اس کا اسلوب بھی ادیبانہ ہونا چاہیے۔" (۴۴)

اس تناظر میں کشور ناہید کے کالموں کا جائزہ لیا جائے تو یقیناً وہ اس معیار پر پورا اترتے ہیں۔ اپنے کالموں میں وہ اپنے سفری تجربے بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ادب اور ادیبوں کے رویوں کو بھی زیرِ بحث لاتی ہیں اور یہ سب کچھ وہ ایک نقاد کی عینک سے کرتی ہیں۔ کشور ناہید شاعروں کے ذہنی رویوں، ان کی شاعرانہ قدرت اور دوراندیشی سے متاثر نظر آتی ہیں۔ "چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے" کے عنوان سے کشور ناہید کے کالم ان ادبی شخصیات کے متعلق مشہور ہیں جنھوں نے نظم و نثر کے میدان میں خود کو منوانے کے بعد صحافتی میدان میں قدم رکھا اور بطور کالم نگار اپنی الگ پہچان بنائی۔ ان میں سے چند ایک مشہور ادبی شخصیات انتظار حسین، سلمٰی جبین، مسرت جبین، عطاء الحق قاسمی، اصغر ندیم سیّد اور منو بھائی ہیں۔ ماضی کے معروف ادیبوں میں وہ چراغ حسن حسرت، شبلی محمد اے اور احمد ندیم قاسمی کا ذکر بھی نہایت محبت سے کرتی ہیں جنھوں نے فنِ کالم نگاری میں قدم رکھا تو یہاں بھی ان کی قابلیت کے ڈنکے بجنے لگے۔ کشور ناہید ان ادیبوں کی تحریروں کے رنگوں اور اہمیت کے حوالے سے لکھتی ہیں، "نظم و نثر لکھنے والا اپنی ادبی تحریروں کے علاوہ چاہے وہ کسی اخبار یا رسالے کا اداریہ ہو کہ کالم، اس کی دائمی حیثیت اور ان کو پڑھ کر اس زمانے کی سیاست، سیاست دانوں،

سماجیات، سماجی کارکنوں، ادبی تحریکوں، ادبی زعما اور پھر اس زمانے کے کھانوں، لوازمات اور تحریکوں کا علم ہوتا ہے۔ کیا کیا پرانے لوگ یاد آتے ہیں بلکہ اس زمانے کے اطوار اور سلیقے سمجھ میں آتے ہیں۔"

کشور ناہید عہدِ جدید کے تقاضوں سے بھی واقف ہیں۔ انھوں نے اس موضوع پر بھی کئی کالم تحریر کیے جس میں شاعروں اور ادیبوں کو نئے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ ادب کے ساتھ ساتھ انھوں نے سیاست کے موضوع پر بھی کالم تحریر کیے جن میں ملکی سیاست کے ساتھ ساتھ عالمی سیاست اور اس کے اثرات پر بھی کالم شامل ہیں۔ وہ ایک منجھی ہوئی کالم نویس ہیں اس لیے ملکی سیاست پر ان کی گہری اور ناقدانہ نظر ہے۔ ان کے سیاسی کالموں کی تعداد بھی کافی زیادہ ہے۔ سیاسی رویوں اور ضابطوں کے حوالے سے بھی وہ بڑی باریک بین ہیں۔ وہ پارلیمنٹ میں غیر سنجیدہ اور غیر سیاسی رویے کو ناپسند کرتی ہیں اور اسے غیر جمہوری اور ناشائستہ قرار دیتی ہیں۔ وہ یہ تجویز پیش کرتی ہیں کہ ارکانِ پارلیمنٹ کو اپنے ذاتی جھگڑوں کی بجائے ملک کے عام افراد کے مسائل کے حل کے لیے اقدامات کرنے چاہئیں۔

خواتین کے متعلق کشور ناہید کا کالم "ادب میں تانیثیت کیا ہے؟" میں تمام تر بحث ادب میں خواتین کی شمولیت اور ان کے سراہے جانے کے حوالے سے ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ آج کی عورت بدلتے ہوئے معاشرے پر بے لاگ انداز میں لکھ رہی ہے۔ اس کے سامنے موضوعات کا وسیع میدان ہے۔ ہر شعبہء زندگی چاہے وہ سیاست ہو، معاشرت ہو یا مذہب، انسانی ذہن ہر حوالے سے کشادہ ہے۔ کشور ناہید اس بات پر زور دیتی ہے کہ عورت کی تانیثیت کو منفی نہیں بلکہ مثبت انداز سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح معاشرے کی ناہمواری اور عورتوں سے امتیازی سلوک کی نشان دہی ان کے کالموں میں جابجا نظر آتی ہے۔ کشور ناہید اپنے جذبات و احساسات میں ڈوب کر اس طرح ادب تخلیق کرتی ہیں کہ ایک عورت کی جذباتیت بر ملا سامنے آجاتی ہے جو اُن کے تانیثی رویے کی واضح دلیل ہے۔ کشور ناہید کی تحریروں میں نسائی جذبات و احساسات کی دلکشی کے متوازی سیاسی عمل اور سیاسی نقطۂ نظر بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پروان چڑھا ہے۔

بھارت کی ریاست اتر پردیش کے بلند شہر میں سیّد مولوی گھرانے میں پیدا ہونے والی کشور ناہید نے مشکل حالات کے باوجود اپنی ذات کو وقت کی لہروں کے سپرد نہیں کیا بلکہ وقت کے تیز دھارے کے سامنے بند باندھ کر اسے اپنی خواہش کے موافق چلایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نسائیت اور انسانیت کے محاذوں پر چومکھی لڑائی لڑتی رہیں۔ یہ محسوس کرنے کے لیے کہ یہ ایک عورت کی شاعری ہے، کشور ناہید ایک نئی عورت کا روشن پیکر بن کر سامنے آتی ہیں۔ جسے اپنی طاقت کا احساس ہے اور وہ اس شبِ ظلمت میں اپنے جینے اور جیتے

رہنے کا حق مانگتی ہے۔ ان کی تخلیقات میں ایک ایسی عورت سانس لیتی نظر آتی ہے جس کے اندر معاشرے کے خلاف غصہ کھول رہا ہے۔ یہ ساری نفرت اور غصہ مرد سماج کی بالا دستی کے خلاف ہے لیکن ان کی تخلیقات کا دائرہ نسوانی سرکشی تک محدود نہیں بلکہ وہ پورے معاشرے کو تبدیل کرنے کی حامی ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد نے اپنے مضمون "کشور ناہید، ایک چیلنج" میں اس بات کی تائید ان الفاظ میں کی ہے:

> "جدید سامراج اس وقت تک آرٹ اور لٹریچر کو کچھ نہیں کہتا جب تک وہ اس کی جڑوں پر حملہ آور نہ ہو اور چونکہ کشور کی شاعری براہِ راست ان جڑوں پر حملہ کرتی ہے اس لیے دائیں اور بائیں بازو کے وہ تمام دانشور جو طبقاتی نظام کے خلاف بھی ہیں اور آزادی نسواں کی باتیں بھی کرتے ہیں، اس کے خلاف ہیں۔"(۴۵)

مرد نے عورت کو اپنے زیرِ سایہ رکھ کر اس کی اخلاقی تربیت کو اپنے احساسات و جذبات کے تابع کرنے کی کوشش کی ہے۔ خواتین اردو ادیبوں میں اس "نسوانی تحریک" یا فیمنزم کے منظر نامے پر زہرہ نگاہ، ادا جعفری اور زاہدہ حنا سے لے کر فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید تک کئی اہم نام موجود ہیں لیکن مغرب میں پروان چڑھنے والی آزادی نسواں کی تحریک کی اگر کہیں مثال دی جاسکتی ہے تو وہ کشور ناہید ہے۔ کیونکہ کشور ناہید مغربی تانیثیت پسند ادیبوں میری این فرگساں اور ورجینا وولف سے متاثر نظر آتی ہیں۔ اس بات کا ذکر انہوں نے مقالہ نگار کو دیے گئے انٹرویو میں بھی کیا۔ کشور ناہید کے مطابق جس ماحول میں پاکستانی عورت سانس لے رہی ہے، وہ اس کو جانِ غزل تو بناتا ہے لیکن عورت کو غزل گو کی حیثیت سے قبول نہیں کرتا یعنی اس کی صلاحیتوں کو ماننا مرد اپنی انا کے خلاف سمجھتا ہے۔ کشور ناہید آج کے اس صنعتی عہد سے سخت نالاں ہیں جس میں عورت کی نسوانیت کو خوب استعمال کیا گیا ہے۔ اس صنعتی اور سرمایہ دار معاشرے میں تکنیکی، عمرانی، ذہنی اور جذباتی منقولات کو مشتہر کر کے عورتوں کو اشتہار بازی کا لازمی جزو بنا دیا گیا ہے اور اس کی صلاحیتوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ کشور ناہید جوتے، کپڑے اور شیونگ بلیڈ بیچتی اشتہاری عورت کے خلاف احتجاج بلند کرتی ہیں۔ اس معاشرتی مزاحمت کی وجہ ان کا ماحول، اپنی ذات سے آگاہی اور غیر معمولی ذہانت ہے۔ وہ ایک ایسی عورت ہے جو روایت اور جدت دونوں کی پُرزور حامی ہے۔

۲۸ فروری ۲۰۲۰ء کو روزنامہ جنگ کے کالم "کوا چلا ہنس کی چال، اپنی بھی بھول گیا" میں کالم نگار نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ عورت نے اپنی محنت سے تمام حقوق حاصل کیے ہیں۔

"پاکستان کی عورت نے جو حقوق حاصل کیے ہیں وہ حکومت کی رعایت سے نہیں بلکہ اپنی مجموعی جدوجہد سے اسے یہ حیثیت حاصل ہوئی کہ آج عالمی ادارے بھی زراعت میں عورتوں کی شرکت کو مانتے ہیں۔"(۴۶)

کالم نگار کے نزدیک اپنی ذات اور شعور کی آگہی کی عورت کو بھاری قیمت ادا کرنا پڑی ہے۔ کالم نگار نے ان عورتوں کے حقوق کے لیے اپنی آواز بلند کی ہے جو کھیتوں اور کارخانوں میں مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں۔ اسی کالم میں آگے چل کر کالم نگار لکھتی ہیں:

"سبزیاں توڑنا، کپاس چننا، مرچ بھنڈی وغیرہ بھر کر لے جانا، اس کی دیہاڑی ملنی ضروری ہے۔ آج گھروں میں کام کرنے والوں کے لیے قانون بنائے جا رہے ہیں۔"(۴۷)

کالم نگار مزدور خواتین کے لیے قانون بنانے کا مطالبہ کرتی ہیں۔ وہ ہر فورم پر خواتین کے لیے آواز اٹھاتے ہوئے خود کو ایک سچا تانیثیت پسند ثابت کرتی ہیں۔ عورت کے استحصال کی بات کرتی ہیں، اسے جائز حقوق دلوانے کی بات کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک اس معاشرے نے اگر عورت کو سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کی بھی ہے تو مرد کے نقطۂ نظر سے۔ ۱۲۶گست ۲۰۲۰ء کو لکھے گئے کالم "بہ باطن نیکوکار، بہ ظاہر گنہگار" میں وہ مشہورFeminist مصنفہ میری این فرگساں کی بات کی تائید کرتی ہیں جس کے مطابق،

"Woman has been defined in relationship to man"

اور یوں وہ خود کو راسخ العقیدہ تانیثیت پسند ثابت کرتی ہیں:

"عورتوں کی نفسیات پر تو ہزاروں کتابیں موجود ہیں البتہ مرد کی نفسیات پر یا تو لکھا ہی نہیں گیا اور اگر عورت پر لکھا بھی گیا ہے تو وہ بھی عورت کو مرد کو سمجھنے کے طریقے اور گھر میں سکون رکھنے کے رویے پر زور دیا گیا ہے۔"(۴۸)

کشور ناہید کو معاشرے سے یہی گلہ رہا ہے کہ معاشرے نے ہمیشہ عورت کو مرد کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اگر مرد نے عورت کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے تو اس کے ساتھ اس کے تعلق کے زیر اثر مرد نے اب تک بطور عورت نہ سمجھا ہے اور نہ لیا ہے۔ اس لیے عورت کے سامنے دو راہیں ہیں۔ اسے سب سے پہلے خود کو ایک زندہ وجود کے طور پر منوانا ہے، حقوق کی بات تو بعد کی ہے اور یہی اصول تانیثی یوٹوپیا کی جانب پہلا قدم ہے۔ اپنی ذات کے تشخص کے بعد حقوق اور کامیابی کی جنگ کا آغاز ہو گا۔ کشور ناہید کے نزدیک عورت نے یہ پہلا قدم طے کر لیا ہے اور اس کا آغاز تانیثیت کی پہلی لہر سے ہو گیا تھا۔

انھوں نے "بری عورت کی کتھا" میں ایک جگہ خود کو بااثر اور توانا عورت کے طور پر متعارف کرواتے ہوئے اپنے لیے "ہنٹر والی" کی ترکیب استعمال کی ہے۔ یہ ہنٹر والی، کاسم پولیٹن نظریات والے مرد حضرات کے لیے ایک مستقل خطرہ اور رکاوٹ بنتی رہی ہے۔ ایسے مرد عورت کی نسوانیت کو فیمنزم اور ویمن ہڈ کے معانی میں محدود کر کے ایک انجانی خوشی کا لطف محسوس کرتے ہیں۔ اس سماج میں مذہب ہمیشہ ایک طاقتور ادارے کے طور پر اپنا کردار ادا کرتا آیا ہے۔ لیکن کشور ناہید نے خود کو نہ صرف اس شرمندگی سے آزادی دلائی ہے بلکہ مرد کے بے معنی سہاروں سے بھی خود کو آزاد کیا ہے۔ وہ خود کو ایک ڈرپوک عورت سمجھتی ہیں لیکن اس کے برعکس یہ بھی کہتی ہیں کہ وہ اپنے اعتماد کے سہارے چلتی ہیں۔ کشور ناہید نے عورت کی جنگ کو دو محاذوں پر لڑا ہے: ایک عورت کا مرد سے برابری کا تصور اور دوسرا معاشرے میں اس کے استحصال کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا۔ ان کے خیال میں معاشرہ استحصال سے اس وقت پاک ہو سکتا ہے جب عورت کو اس کا درست مقام میسر آئے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہب کی غلط تشریح و تفسیر کرنے والوں کے خلاف بھی کشور نے اپنا احتجاج ریکارڈ کروایا ہے۔ آج جب عورت کی آواز کو سنا اور سمجھا جا رہا ہے تو مرد اسے مذہبی، سیاسی، سماجی اور معاشی ہتھکنڈوں سے روکنے کی کوشش میں مگن ہے۔

کشور ناہید عورت کا استحصال کسی صورت قبول نہیں کرتیں، چاہے وہ ایک بے اختیار بیوی ہو جو محلات میں رہتی ہے لیکن اپنی ذات کو منوا نہیں پاتی ہے۔ انھیں عورت بحیثیت محلات کی لونڈی اور بازارِ حسن کی زینت دونوں صورتوں میں قبول نہیں ہے۔ کشور ناہید نے اپنی شاعری کو آج کی آزادی طلب عورت، اپنے وجود کا اثبات چاہنے والی عورت، اپنی شخصیت کا اظہار چاہنے والی عورت اور اپنی نسوانیت سے نہ شرمانے والی عورت کا منشور بھی بنا دیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار کشور ناہید اپنے کالموں میں بھی بارہا کرتی ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے سماج سدھار اور خاتون سدھار کالم لکھنے کا شوق بھی پال رکھا ہے اور وہ یہ کام تسلسل سے کر رہی ہیں تو بے جا نہ ہو گا۔ انھوں نے فلسطینی مجاہد لیلیٰ خالد کی زندگی پر کتاب ترجمہ کی۔ "عورت زبانِ خلق سے زبانِ حال تک" جیسی کتاب میں فیمن ازم کے موضوعات پر تراجم جمع کر کے جدید نسوانی بوطیقا(Poctics) تشکیل دینے کی کوشش کی اور یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ ان کے مطابق عورت کے حقوق کے حصول کے لیے مضبوط علمی صورتِ حال نہایت ناگزیر ہے۔

نسائیت کے موضوع پر کشور ناہید کی جنگ ان کی چالیس سے زیادہ کتابوں میں نظر آتی ہے۔ انھوں نے خود کو ملک کے سیاسی اور معاشرتی ارتقا سے منسلک رکھا۔ اس نقطۂ نظر سے اگر جائزہ لیا جائے تو کشور ناہید

نے عورت کے نقطۂ نظر سے معاشرے کو دیکھا اور پرکھا ہے۔ جب کہ اس سے قبل اگر عورت کے مسائل عورت کے حق کی بات کی بھی جاتی تھی تو وہ اکثر مرد کے نقطۂ نظر سے ہوتی تھی۔

کشور ناہید تانیثی شعور رکھنے والی خواتین کالم نگاروں میں ایک نمایاں مقام کی حامل ہیں۔ ان کے کالموں میں جہاں حالاتِ حاضرہ پر تنقید و تبصرہ نظر آتا ہے، وہاں وہ ملک کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے دوسرے ممالک کی مثالیں بھی گاہے بگاہے دیتی نظر آتی ہیں۔ ایک کالم میں انھوں نے جاپان کی مثال دی ہے کہ جاپان ایک ترقی یافتہ ملک ہے جس کی ترقی کی وجہ علم سے لگاؤ اور اس کے لوگوں کی اَن تھک محنت اور جانفشانی ہے۔ کالم نگار اس کی مثال دیتے ہوئے ہم وطنوں میں بھی یہی رجحان پروان چڑھتا دیکھنا چاہتی ہیں۔

> "مغرب میں ہر علاقے میں رضاکارانہ گروپ ہیں جو اپنے علاقے میں تنہا ہیں اور بیمار لوگوں کو سیر کے لیے بھی لے کر جاتے ہیں اور ان کے گھر میں ضرورت کے مطابق کام کر لیتے ہیں۔ بوڑھے عورت اور مرد اکٹھے کر کے لائے جاتے ہیں۔ ان کو ذہنی اور جسمانی مشقیں کروائیں جاتی ہیں۔ بیڈمنٹن، شطرنج، دوسرے کھیلوں کے مشاغل کے علاوہ اکٹھے کھانا کھانے کے مواقع، حکومت کی طرف سے ہر ہفتے کروائے جاتے ہیں۔"(۴۹)

کالم نگار ماضی کے کچھ دردناک موضوعات کو بھی زیرِ بحث لاتی ہیں۔ جس میں سقوطِ ڈھاکا سرِ فہرست ہے۔ سقوطِ ڈھاکا نہ صرف حساس اور درد رکھنے والے ادیبوں بلکہ تمام پاکستانیوں کے لیے ایک سیاہ رات ہے جس کا غم بھلائے نہیں بھولتا ہے۔ کشور ناہید کے مطابق ہمیں بنگالیوں سے ترقی کے اصول اور راز سیکھنے چاہئیں جو سب کچھ بھلا کر ایک نئے سفر پر اس طرح گامزن ہوئے کہ خطے کے بیش تر ممالک کو پیچھے چھوڑ دیا۔ جس مشرقی پاکستان کے لوگوں کو چھوٹے، کمزور اور ناکارہ کہا گیا، وہ علیٰحدگی کے بعد اپنے ملک کو اتنا آگے لے گئے کہ دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں شمار ہونے لگے۔ ہماری کپاس مصر کی کپاس کے مقابل اور سب سے زیادہ اہم تھی۔ ہمارے چاول، باسمتی کی نقل انڈیا اور دوسرے ملک چراتے رہے۔

کشور ناہید جہاں ایک طرف بنگلہ دیش کی مثال دیتی ہیں، ان کے خیال میں بنگلہ دیش میں مرد و زن کو ترقی کرنے کے یکساں مواقع فراہم ہیں اس لیے بنگلہ دیش معاشی اور معاشرتی لحاظ سے ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے تو دوسری جانب وہ افغانستان میں خواتین کے حقوق کی خلاف ورزی اور ان کے استحصال کے خلاف اپنے کالم میں آواز اٹھا کر اپنے تانیثی شعور کا اظہار کرتی ہیں:

"طالبان کو افغانستان پر قبضہ کیے سوا سال ہو رہا ہے، وہ سب سے زیادہ لڑکیوں اور عورتوں پر ظلم، لڑکیوں کے تعلیمی اداروں کو بند اور دو چار روشن خیال خواتین و حضرات اگر رہ گئے ہیں تو ان کو کہیں بھی گھروں میں گھس کر اور کہیں اور مارڈالتے ہیں۔ ساری دنیا کے ممالک خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہے ہیں۔"(۵۰)

یہاں کالم نگار کا تانیثی شعور واضح ہے۔ عورتوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کرتے ہوئے وہ انھیں ملک کی ترقی کی کلید بھی قرار دیتی ہیں بشرطیکہ انھیں ملک کی تعمیر میں مثبت کردار ادا کرنے کا موقع دیا جائے۔

"طالبان اگر خواتین کو معاشرت اور زندگی میں باقاعدہ علمی طور پر شامل کر لیں تو ساری قومیں ان کو تسلیم بھی کریں گی۔ کمال یہ ہے کہ روس اور چین کے علاوہ کئی ایک غیر اسلامی بھی ہو آئے، ہر جگہ پر زور دیا گیا ہے کہ خواتین کو دفتروں، کالجوں اور سکولوں میں کام کرنے دو۔"(۵۱)

وہ خطے میں امن کی خواہاں ہیں اور تمام لڑائی جھگڑے اور پرانی باتوں کو فراموش کرنا چاہتی ہیں۔ کشور ناہید اور ان جیسا نقطۂ نظر رکھنے والے دوسرے ادیب جو امن کی آشا گاتے ہیں، یہ ان کا دیرینہ خواب ہے کہ پاکستان میں امن بحال ہو۔ دہشت گردی کے ناسور کے باعث پاکستان کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ اپنے ایک کالم میں وہ آنے والے اچھے دنوں کی نوید دے رہی ہیں جو ان کی رجائیت پسندی اور یوٹوپیا کی خیالات کی تائید کرتا ہے۔

"کاش اس ۱۲ فروی کو ایسی خوش خیال باتیں اور خواتین کے حوالے سے وزیرِ اطلاعات اور وزیرِ اعظم اپنے گھر کی عزت کو سلامت رکھتے ہوئے کچھ ایسے اقدامات کا حوالہ دیں اور عمل درآمد بھی کروائیں کہ دنیا میں پاکستان کا نام عزت سے لیا جانے لگے۔ کاش جہیز کے نام پر لڑکیوں کو زدو کوب نہ کیا جائے۔ کاش عورت جس نے صرف لڑکیوں کو جنم دیا ہو یہ جنم الزام نہ بنے، مرد دوسری شادی نہ کریں، جیسا کہ مغرب کی عورتوں نے مطالبہ کیا ہے۔ بے چاری عورتیں بھی کہیں کہ ہم کو گھر کے کام کا معاوضہ دیا جائے ورنہ یہ ذمہ داریاں اٹھاتے اٹھاتے خواتین تھک گئی ہیں۔"(۵۲)

کالم نگار کے مطابق آج خواتین آرمی سے لے کر بارودی سرنگیں اڑانے کا کام کرتی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں کہ مجھے فیصل آباد کے ایک باپ کو یہ پڑھ کر اور دیکھ کر فخر ہوا کہ اس کی آٹھ بیٹیاں ہیں جن کو وہ خود ہی

الیکٹریشن کا کورس کروا رہا ہے۔ اب فلموں میں بجلی سے ڈر کر مرد کے پہلو میں دبک جانے والی عورت دفن ہو چکی ہے۔ ۸۷ سالہ امریکن سپریم کورٹ کی جج کو وفات کے بعد بھی اس لیے عزت مل رہی ہے کہ وہ ساری عمر وکالت میں خواتین کے حقوق کے لیے لڑتی رہی۔

ان سطروں میں کالم نگار کا تانیثی یوٹوپیا واضح نظر آتا ہے۔ ان کا آئیڈیل یا Icon ایک مضبوط عورت ہے۔ ان کے نزدیک وہ عورت قابلِ تقلید ہے جو حسن کی دیوی نہیں بلکہ کردار اور گفتار کی غازی ہو اور ایسی عورتیں ہی ہیں جو مستقبل میں ملک کا نقشہ بدل سکیں گی۔ این میری شمل اور ورجینا وولف کی طرح کالم نگار ایک ایسے تانیثی یوٹوپیا کی بات کرتی ہیں جہاں عورت کی حکمرانی ہے اور وہ اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہی ہے۔

کالم نگار نے ایک روشن خیال اور ترقی پسند ملک کا نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ خواتین ملک کی آبادی کا نصف حصہ ہیں اور اگر یہ نصف آبادی منجمد اور غیر فعال ہو گی تو ملک کیسے ترقی کر سکے گا۔ کشور ناہید کل کی ڈری اور سہمی ہوئی عورت کو آج کی ایک مکمل، مضبوط اور اپنے حقوق کا شعور رکھنے والی خاتون کی صورت میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ ایک ایسی عورت جو اپنے باپ، بھائی اور بیٹے پر بوجھ نہ بنے بلکہ خود اپنی تقدیر بھی بدلے اور ملک کی تعمیر و ترقی میں بھی نمایاں کردار ادا کر سکے۔ ایک ایسی عورت جو زندگی کے ہر میدان اور شعبے میں حصہ لے۔

بعض کالموں میں کشور ناہید تانیثی شعور کے ساتھ ماضی پرستی کا بھی ذکر کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہ اس ماضی کو مثالی اور سنہرا اقرار دیتی ہیں جب تعلیم سادہ لیکن ٹھوس اور اچھی بنیادوں پر قائم تھی۔ آج کے دور کی طرح مصنوعی اور دولت پر منحصر نہیں تھی۔ ان کے نزدیک اس مسئلے کا حل یکساں نصابِ تعلیم ہے جو امیر و غریب کا فرق ختم کر دے۔ وہ کہتی ہیں کہ بہت سے کام مثلاً سبزیاں توڑنا، کپاس چننا، مرچ بھنڈی وغیرہ بوری بھر کر لے جانا، اس کی دیہاڑی ملنی ضروری ہے، گھروں میں کام کروانے والوں کے لیے قانون بنائے جا رہے ہیں مگر بڑی بیگمات کے ساتھ بچے اٹھائے، ان کا سامان اٹھانے کے لیے جب چھ چھ سال کی بچی کو دیکھتی ہوں، غصے سے کانپ اٹھتی ہوں۔ ہمارے ملک کے شہریاروں کو کم از کم سبزی اور مکھن کے ان الفاظ سے ہی سبق سیکھنا چاہیے کہ "ہم عوام کے پیسے پر زندگی گزارنا نہیں چاہتے"، حالانکہ برطانوی عوام اب تک ملک میں ملکہ برطانیہ اور ان کے خاندان کے چونچلے اٹھاتے ہوئے تھکتے نہیں اور اس بات پر فخر بھی کرتے ہیں کہ ہمارے یہاں اب تک بادشاہوں کو پریوں کے دیس کا مرقع سمجھا جاتا ہے۔

کشور ناہید ایک تانیثی(Feminist) نقطۂ نظر رکھنے والی ادیب اور شاعرہ ہیں۔ وہ عورت کی آزادی اور اس کی ترقی کو ملک کے بیش تر مسائل کا حل سمجھتی ہیں اور اس کے لیے وہ ہوائی قلعے تعمیر نہیں کرتی بلکہ اپنے کالموں کے ذریعے حکومتِ وقت کو مفید اور عملی مشورے بھی دیتی ہیں۔ اس کے ساتھ کالم نگار کے کالموں میں تخیل اور جذبہ حب الوطنی بھی واضح نظر آتا ہے۔

کشور ناہید کا یوٹوپیا، ان کی مثالی جنت مغرب کے ترقی یافتہ ممالک ہیں۔ وہ بارہا اپنے کالموں میں ان ممالک کے طرزِ حکومت، لوگوں کے اندازِ زندگی اور مروجہ طریقوں کو مثالی قرار دیتی ہیں۔ وہ گاہے بگاہے ان کی مثالیں دیتی ہیں کہ ان لوگوں کی حب الوطنی اور فرض شناسی کا جذبہ مثالی ہے۔ اسی جذبے کے باعث وہ قومیں آج ترقی کی منازل طے کر چکی ہیں۔

کشور ناہید پاکستان کو ایک اعتدال پسند ماڈرن اور لبرل ملک کی صورت میں دیکھنا چاہتی ہیں، جہاں مرد وزن آزاد اور برابر ہوں۔ یہی ان کا یوٹوپیا ہے۔ اس کی تشکیل میں وہ کبھی مغربی آزاد خیال معاشرے کی مثالیں دیتی ہیں تو کبھی وسط ایشیائی ممالک کی۔ اسی لیے وہ ایک جگہ لکھتی ہیں کہ، لبنان کی حکومت اور سوشل ورکرز نے مذہبی علما کو عورت کی عزت، مساوات اور معاشرے کے بارے میں تلقین کرنے اور مساجد کے علاوہ دیگر تقریبات میں لوگوں کو سمجھانے کی ذمہ داری سپرد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کاش ہمارے ہاں بھی علما ماؤں، بہنوں کی عزت کرنے اور عورتوں کو بھی مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے مائل کریں تو اس طرح ذہنی پراگندگی ختم ہو۔

کالم نگار کے نزدیک ہمارے ملک کی تنزلی اور مسائل میں بنیادی مسئلہ بنیاد پرست مولوی اور شدت پسندی کا رجحان ہے۔ ایسے رجحانات نے ملک میں دہشت گردی کو فروغ دیا ہے۔ اس لیے ایک اعتدال پسند سوچ ہی محفوظ پاکستان کی ضمانت ہے۔

کشور ناہید کا تانیثی یوٹوپیا ایک ایسی مثالی ریاست ہے جہاں صنفی نابرابری نہ ہو۔ جس کے خدوخال وہ گاہے بگاہے اپنے کالموں میں بیان کرتی آئی ہیں۔ اس کی مدد سے وہ ملک کے موجودہ بدتر حالات یا ڈسٹوپیا سے راہِ فرار بھی بتاتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ملک کے موجودہ مسائل کا حل بتاتی ہیں اور اس کے لیے وہ ان ممالک کی مثالیں دیتی ہیں جنھوں نے ہمارے جیسے حالات کا مقابلہ کیا اور ان پر قابو پاتے ہوئے ترقی کی۔ ان کے نزدیک یہ ترقی ملک کی تعمیر میں عورتوں کی مثبت شراکت سے ممکن ہو سکی۔ اس بابت اپنے ایک کالم میں وہ Scanda Navia کی مثال دیتی ہیں۔

اپنے کالم "چند مفید مشورے" میں کالم نگار نے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

> "تبدیلی کا مطلب خواتین کو آگے بڑھانا ہے۔ ایسی کون سی قیامت آجاتی اگر عمران خان ۱۱ اگست کو بھی ایک تقریر کر لیتے۔ یہ وہ تاریخ ہے جب قائدِ اعظم نے کہا تھا کہ "پاکستان میں نہ کوئی مسلم ہے، نہ ہندو نہ سکھ نہ پارسی یا عیسائی، مذہبی حوالے سے نہیں بلکہ سیاسی حوالے سے پاکستانی ہیں۔"(۵۳)

کشور ناہید اپنے یوٹوپیا کو عملی شکل دینے کے لیے اصول و ضوابط بتاتی ہیں جو اکثر ان کے کالموں کا حصہ ہوتے ہیں۔ وہ اس کالم میں بھی وہ وزیرِ اعظم صاحب کو مشورہ دے رہی ہیں کہ اگر ملک کو پُر امن اور پُر سکون بنانا ہے تو پھر ہمیں ہر قسم کے مذہبی اور لسانی تفاخر اور تقسیم کو فروگزاشت کرنا ہوگا۔ کیوں کہ یہ تقسیم ہمارے دشمنوں کی ایک سازش ہے جس میں وہ ہمارے مذہبی رجحانات اور لسانی تشکیلات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مذہب، نسل اور زبان کے قانون میں بانٹتے ہوئے عربی اور عجمی، کالے اور گورے، مسلم اور ہندو، سکھ اور عیسائی کی بنیاد پر تفریق پیدا کرتا ہے تاکہ ان لسانی، علاقائی اور مذہبی تفرقات میں پڑ کر ہم پاکستانی اس عظیم تر مقصد کو فراموش کر دیں جس کے لیے ہمارے قائدِ اعظم نے یہ ملک بنایا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے اتنے جان و مال کی قربانی دی ہے۔

کشور ناہید کے کالموں میں بالعموم اور ان کی ادبی تحریروں نثر اور شاعری میں بالخصوص ان کا اندازِ فکر اور مخصوص نسائی نقطہ نظر نمایاں نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے وہ ان تمام ممالک کی مثالیں دیتی ہیں جہاں بظاہر عورت کو شخصی اور فکری آزادی حاصل ہے اور یہی ان کی ترقی کا باعث ہے۔ کشور ناہید تعلیم نسواں کو ناگزیر قرار دیتی ہیں کیونکہ ایک مطمئن اور آسودہ حال ماں ہی اپنی بچوں کی پرورش کر سکتی ہے۔ اسے ایک پر اعتماد اور باکردار شخصیت میں بدل سکتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہم لوگ جب تک انفرادی طور پر اپنی اصلاح نہیں کریں گے، اجتماعی طور پر ترقی نہیں کر سکیں گے۔ کشور ناہید نے واضح طور پر نسائی شعور کی نشاندہی کی اور اسے متعارف کرانے میں مؤثر کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے براہِ راست عورت کے جذبات اور مسائل کو موضوع بنایا اور پورے شعور و ادراک کے ساتھ اپنی شاعری میں ان سماجی رویوں پر احتجاج کیا جن کا شکار خواتین رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کشور ناہید کا تانیثی یوٹوپیا ایک نئی عمارت کا وجود اور اس کا تشخص سامنے لاتا ہے، یا یوں کہیئے کہ وہ ایک ایسی عورت کو دیکھنا چاہتی ہیں جو اپنی صلاحیتوں کا لوہا معاشرے میں منوائے۔ جو خود اپنی پہچان ہو۔ کیوں کہ

آج کے اس پدری معاشرے نے جس میں مرد کی بالادستی کا قانون لاگو ہے، اس نے عورت سے اس کا وجود چھین لیا ہے۔ کشور ناہید کی شخصیت اس پدری معاشرے میں ایک حرفِ انکار بن کر ابھرتی ہے۔ وہ مغربی تانیثیت پسند مفکرین این فرگساں اور سیمون دی بوا کی طرح عورت کی ذات اور اس کی شناخت کی بات کرتی ہیں۔ ایک ایسی عورت جو معاشرے کی بہتری کے لیے کام کرے گی نہ کہ عضوئے معطل(Paralized) بن کر رہ جائے۔ وہ اس ظلمت اور فنا کی وادی میں جینے اور جیتے رہنے کا حق مانگتی ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ ایک ایسی عورت کی تصویر کشی کی ہے جس کے اندر نفرت اور غصے کا لاوا کھول رہا ہے اور یہ سارا غصہ مرد سماج کی بالادستی کے خلاف ہے لیکن ان کی تخلیقات کا دائرہ نسوانی سرکس نہیں بلکہ وہ استحصال پر مبنی پورے معاشرے کو تبدیل کرنے کی بات کرتی ہیں اور اس کے Her Land کی طرح ایک ایسا تانیثی یوٹوپیا تشکیل دیتی ہیں جس میں عورتوں کی حکومت ہو۔ ڈاکٹر رشید امجد نے بھی اپنے مضمون میں اس بات کی تائید ان الفاظ میں کی ہے:

> "عورت اس کے ہاں استحصال زدگی کا ایک علامتی پیکر ہے جس کے ذریعے وہ بیک وقت مرد کی روایتی بالادستی اور پورے طبقاتی نظام کی جڑوں پر حملہ آور ہوتی ہے۔" (۵۴)

کیونکہ درحقیقت وہ مغربی مفکرین کی پیروی میں پدری (Patriarchian) نظام کو بدل کر ایک تانیثی یوٹوپیا تخلیق کرنے کی خواہش مند ہیں۔

اوریا مقبول جان کے کالموں کے تجزیاتی مطالعے سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ وہ تحریک اخوان المسلمین کے سیاسی و مذہبی کردار کی مکمل حمایت کرتے ہیں وہ اس تحریک کے نصب العین "اسلامو ٹوپیا" یعنی شریعت اسلام کے نفاذ کو تمام موجودہ مسائل کا حل قرار دیتے ہیں۔

ریاست مدینہ اور موجودہ دور میں طالبان کی ریاست ان کی آئیڈیل ریاست اور یوٹوپیا کا اہم ستون ہے۔ مغربی طرزِ حکومت کے مخالفت اور اس کے مقابل خلافت کو ترجیح دیتے ہیں۔

خورشید ندیم کے کالموں کے تجزیاتی مطالعے سے یہ واضح ہے کہ ان کے اکثر کالموں کا بنیادی موضوع مذہب اور ریاست سے جڑا ہے۔ لیکن اسلامی ریاست کی تشکیل کے بارے میں اُن کا نقطہ نظر اوریا مقبول جان سے یکسر مختلف ہے۔ اُن کی سوچ میں عام مولویوں کی طرح روایت پسندی اور شدت پسندی نہیں ہے۔ اس کے برعکس وہ دنیا کے سامنے اسلام کی معتدل اور عملی صورت پیش کرتے ہیں۔

حوالہ جات

1. Mikhael Muhammad Knight” Islam after liberalism” Edited by Faisal Devjiand Zaheer Kazmi, Oxford University Press, 2017, London, P.220
2. https//www.university of oslo, faculty of social science
3. Ibid, P. 235

۴. مفتی تنظیم عالم قاسمی، مضمون، "موجودہ عالمی حالات اور غزوہ خندق کا پیغام"، حدیث دارالعلوم، سبیل السلام حیدر آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۱۰

۵. اوریا مقبول جان، "روبیضہ "روزنامہ ایکسپریس، اردو، ادارتی صفحہ، ۲۸ ستمبر ۲۰۱۵ء

۶. اسلم شیخوپوری، "مجھے ہے حکم اذاں"، دیباچہ، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، اگست ۲۰۱۲ء، ص ۱۴

۷. "مجھ ہے حکم اذاں"، ۱۸ اگست ۲۰۰۳ء، ص ۱۵

۸. ایضاً، کالم "محب وطن لوگوں سے ایک سوال"، ۲۳ اگست ۲۰۰۳ء، ص ۲۱

۹. ایضاً، کالم "لو وہ بھی کہہ رہے ہیں"، ۷ نومبر ۲۰۰۳ء، ص ۳۱

۱۰. ایضاً، کالم "کوا چلا ہنس کی چال"، ۲۳ جنوری ۲۰۰۴ء، ص ۳۹

۱۱. ایضاً، کالم "حمیت نام تھا جس کا۔۔۔"، ص ۴۰

۱۲. ایضاً، کالم "خوفزدہ یورپ"، ۲۰ اگست ۲۰۰۴ء، ص ۹۱

۱۳. ایضاً، کالم "ریت کی بوریاں"، ۴ دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۱۲۲

۱۴. اوریا مقبول جان، "حرفِ راز"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، کالم ۱۶ جنوری ۲۰۱۰ء، ص ۷۱

۱۵. اوریا مقبول جان، "حرفِ راز"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، کالم "گنگ زبانیں خاموش ضمیر"، ۱۳ فروری ۲۰۱۰ء، ص ۱۹۳

۱۶. مہاتما گاندھی، ہر بجن ہفت روزہ اخبار، لکھنؤ ۲۷ اگست ۱۹۴۷ء ص ۱

۱۷. اوریا مقبول جان، حرفِ راز ۲، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، کالم "ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس"، ۱۴ دسمبر ۲۰۱۱ء، ص ۱۹۸

۱۸. اوریا مقبول جان، حرفِ راز، کالم "خوف خدا رکھنے سے خوفزدہ عرب"، ۲۵ جنوری ۲۰۱۳ء، ص ۲۰۰

۱۹. اوریا مقبول جان، حرفِ راز ۳، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، کالم "آتش فشاں" ص ۶۲

۲۰. اوریا مقبول جان، حرفِ راز، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، کالم "سیکولر، لبرل آمروں کا یوم حساب"، ۲ فروری ۲۰۱۱ء، ص ۱۲۲
۲۱. خورشید احمد ندیم، تکبیر مسلسل، روزنامہ دنیا، کالم "اجتہاد۔۔۔ ایک مجتہدانہ کتاب"، ادارتی صفحہ ۱۸ نومبر ۲۰۱۹ء
۲۲. ایضاً، کالم "پاپولر اسلام اور سیکولر اسلام"، ادارتی صفحہ، ۲۱ اکتوبر ۲۰۲۰ء
۲۳. ایضاً، کالم "پاپولر اور سیکولر اسلام"، ۵ اگست ۲۰۲۰ء
۲۴. ایضاً، کالم، ۸ جولائی ۲۰۲۰ء
۲۵. ایضاً، کالم "ووٹ کو عزت دو" ۶ مئی ۲۰۲۱ء
۲۶. ایضاً، کالم "قائداعظم کا اسلام"، یکم اپریل ۲۰۲۱ء
۲۷. ایضاً، کالم، ۱۸ فروری ۲۰۲۱ء
۲۸. خورشید احمد ندیم، "سیکولرازم اور مذہب"، ادارہ تعلیم و تحقیق، اسلام آباد، ۲۰۲۰ء، ص ۹
۲۹. خورشید احمد ندیم، روزنامہ دنیا، ادارتی صفحہ، کالم "جمہوریت یا فسطائیت"، ۹ ئی ۲۰۲۰ء
۳۰. خورشید احمد ندیم، روزنامہ دنیا، ادارتی صفحہ، کالم تکبیر مسلسل، ۱۵ فروری ۲۰۲۰ء
۳۱. روزنامہ دنیا، ادارتی صفحہ، تکبیر مسلسل، مصنف کا تصورِ تاریخ، ۱۲ مئی ۲۰۱۹ء
۳۲. ایضاً، "ریاستِ مدینہ"، ۳۱ دسمبر ۲۰۱۸ء
۳۳. ایضاً، "مذہبی اور اسلامی ریاست"، ۲۴ مئی ۲۰۱۸ء
۳۴. ایضاً، "لبرل اسلام"، ۲۱ جنوری ۲۰۱۷ء
۳۵. ایضاً، "اسلام، ریاست اور سیکولرازم"، ۲۴ اگست ۲۰۱۶ء
۳۶. ایضاً، "سماج، ریاست اور مذہب"، ۶ مئی ۲۰۱۶ء
۳۷. ایضاً، "تکبیر مسلسل"، ۲۵ اگست، ۲۰۱۴ء
۳۸. ایضاً، "تکبیر مسلسل"، ریاست اور یوٹوپیا، ۱۱ مارچ ۲۰۱۴ء
39. Waggren Lena," Feminist Utopia", The Literary Encyclopedia: First Published in 14th Nov 2018.

40. Thomas A. Markus, "Is there a built form for Non-Patriarchool Utopias? In emboded utopias: Gender, social change and the Modern Metropolis, ed: Amy Bigaman, Lisesanders and Rebecca Zorarch (Psychology-press 2002), P.17

41. Erin-Mckenna, "The Task of Utopia", A Pragmatism and Feminist Perspective (New York: Rowman & Little field Publishers, 2001, P. 250.

42. Ann. Fergusan, "Images of women in Literature" Boston, Miffin Company, 1981, P.5

۴۳. محمد شمس الحق، "پیمانہ ءغزل"، (جلد دوم) نیشنل بک فاؤنڈیشن، کراچی، ۲۰۰۸ء، ص ۳۴۴

۴۴. وحید الرحمٰن خان، "خامہ بگوش: ایک مطالعہ"، اکادمی بازیافت لاہور، فیروز سنز، ۲۰۰۴ء، ص ۵

۴۵. رشید امجد، کشور ناہید ایک چیلنج، مشمولہ، "نئے زمانے کی برہمن"، مرتب، اصغر ندیم سید، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء۔ ص ۲۰۶

۴۶. کشور ناہید، ، کالم " کوا چلا ہنس کی چال، اپنی بھی بھول گیا"، روزنامہ جنگ، ادارتی صفحہ، ۲۸ فروری ۲۰۲۰ء

۴۷. کشور ناہید، کالم "کوا چلا ہنس کی چال، اپنی بھی بھول گیا"، ایضاً

۴۸. کشور ناہید، کالم "باطن نکوکار، ظاہر گناہ گار"، روزنامہ جنگ، ادارتی صفحہ، ۲۶ اگست ۲۰۱۹ء

۴۹. کشور ناہید، کالم "معاشی عورتیں بولتی ہیں"، مہمان صفحہ، روزنامہ جنگ، ۳۰ جنوری ۲۰۲۱ء

۵۰. کشور ناہید، کالم "معاشی بدحالی اور روپے کی بے قدری"، مہمان صفحہ روزنامہ جنگ، ۳۰ ستمبر ۲۰۲۰ء

۵۱. کشور ناہید، کالم "معاشی بدحالی اور روپے کی بے قدری"، مہمان صفحہ، روزنامہ جنگ، ۳۰ ستمبر ۲۰۲۰ء

۵۲. کشور ناہید، کالم "غم کا فسانہ کس کو سنائیں، مہمان صفحہ روزنامہ جنگ، ۱۸ جنوری ۲۰۱۸ء

۵۳. کشور ناہید، کالم ""چند مفید مشورے" ، مہمان صفحہ، روزنامہ جنگ، ۱۴ دسمبر ۲۰۱۹ء

۵۴. رشید امجد، کشور ناہید، ایک چیلنج، مشمولہ "نئے زمانے کی برہمن" ، مرتب اصغر ندیم سید، ایضاً، ص ۲۱۰

باب سوم
منتخب سیاسی و سماجی کالموں میں یوٹوپیا کے رجحان کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

سیاسی و سماجی یوٹوپیا کو دنیائے ادب میں روشناس کرانے کا سہرا اول الذکر افلاطون اور پھر تھامس مور کے سر ہے سیاسی و سماجی یوٹوپیا کے تناظر میں جاوید چوہدری، ہارون رشید اور ارشاد بھٹی کے سیاسی کالموں کا اس تناظر میں جائزہ لیا جائے گا۔

یوٹوپیا کی سماجی تعبیر:

سماجی یوٹوپیا سے مراد یوٹوپیا کی طبعی یا مادی شکل لی جاتی ہے جس میں ایک مکمل مثالی معاشرہ دکھایا جاتا ہے۔ عام طور پر یوٹوپیا سے مراد ایک ناممکن منصوبہ لیا جاتا ہے لیکن افسانوی ادب نے اسے ممکن کر دکھایا ہے۔

ایک مثالی ریاست کا تصور تقریباً ۵۰۰ قبل مسیح سے فلسفیوں اور مفکرین کے ذہنوں میں موجود رہا ہے جس کی اولین مثال فلسفے کے بانی افلاطون کی کتاب Republic میں نظر آتی ہے۔

جبکہ لائن میکڈونلڈ نے سماجیات کی تاریخ کے بارے میں ان خیالات کا اظہار اپنی کتاب Most of The History of The Social Sciences میں کیا تھا۔

۵ اور ٦ قبل مسیح میں سماجی سائنس میں بہت تبدیلیاں آچکی تھیں۔ یوٹوپیا کے بارے میں میکڈونلڈ نے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا:

> "The formation of utopia has always started with an idea and the idea is an outcome of thoughts arising in mind, based on socio-political structure of society." (1)

میکڈونلڈ کے نزدیک معاشرے کی تشکیلِ نو ہمیشہ سے سماجی یوٹوپیا کا ناگزیر حصہ رہا ہے۔ یوٹوپیا کا نقطۂ آغاز انسانی ذہن کی سوچ سے ہوتا ہے اور اس سوچ کی بنیاد معاشرے کا وہ مثالی سیاسی و سماجی ڈھانچہ ہوتا ہے جو مفکر کو تبدیلی لانے پر مجبور کرتا ہے۔ نظریات اور فلسفہ نہ صرف انسانی ذہن کی اختراع ہیں بلکہ افراد کے طرزِ زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ افلاطون کو نہ صرف فلسفے کا بانی کہا جاتا ہے بلکہ یوٹوپیائی ادب کا بانی بھی کہا جا سکتا ہے۔ افلاطون کے بعد اس فہرست میں دوسرا نام تھامس مور کا ہے جس نے ۱۵۱٦ء میں

یوٹوپیا (Utopia) کے نام سے تحریر کردہ کتاب میں ایک مثالی ریاست کا نقشہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد ۱۹۲۲ء میں Mumford نے The story of utopias ، اور ۱۸۴۷ء میں کارل مارکس اوراینگلز نے Comunist Monifesto کے نام سے ایک مثالی ریاست کی مثال دی جس کی بنیاد مارکسزم کے نظریات پر رکھی گئی۔ ٹھیپا چارا نے ۲۰۰۰ء میں (The Utopia of ancient India) کے نام سے ایک مثالی ریاست کی تجویز دی۔

سماجی یوٹوپیا کی بابت بات کی جائے تو ۴ قبل مسیح میں افلاطون نے ایک سماجی اور سیاسی یوٹوپیا کا تصور ریاست کے نام سے اپنی کتاب میں تحریر کیا۔ افلاطون نے اپنی اس کتاب میں سماج کو معاشی و معاشرتی صورتِ حال کی بنیاد پر تین حصوں میں تقسیم کیا ہے جس کو اس نے 'سونا'، 'چاندی' اور 'کانسی' کا نام دیا ہے۔ افلاطون کا یہ ماننا ہے کہ فلسفیوں کو حکومت یا ملک کی باگ ڈور سنبھالنی چاہیے تا کہ وہ غربت اور افلاس کا خاتمہ کرنے کے لیے کوئی حل سوچ سکیں۔ بابر جاوید نے اپنے آرٹیکل میں مختلف یوٹوپیا کے بارے میں تفصیلی ذکر کیا ہے جس کے مطابق، افلاطون نے اپنی کتاب میں تجاویز تو پیش کر دیں لیکن سماج کی بہتری کے لیے عملی اقدامات نہیں اٹھائے گئے۔ افلاطون کے بعد ۱۱ویں صدی میں منو (Manno) نے اپنی کتاب The laws of Manno کے نام سے ایک یوٹوپیائی ریاست کی تشکیل کے لیے کچھ تجاویز دیں جو اس کے خیال میں سماج کی اخلاقی اقدار کو بہتر بنا سکیں گی۔ اس نے یوٹوپیا کا ایک بنیادی ڈھانچہ تشکیل دیا جس میں لوگوں کو پیشوں کے حساب سے چار حصوں میں تقسیم کیا گیا جس کو برہمن، کھشتری، ویش اور شودر کا نام دیا گیا۔ اس کے علاوہ حکومت اور سیاست کے سلسلے میں بھی اس نے راہنمارائے دی۔ منو کا یہ سماجی ڈھانچہ آج بھی ہندوستان میں عملی شکل میں نظر آتا ہے۔

تھامس مور نے ۱۵۱۶ء میں یوٹوپیا کے نام سے ایک تصوراتی جزیرہ آباد کیا جس میں حکومت ملک کا تمام انتظام دیکھتی ہے۔ عوام کی خوراک اور لباس تک اس حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس کتاب کی آمد کے بعد ایک مثالی اور فلاحی ریاست کا انتظام ممکن نظر آ رہا تھا۔

پروفیسر بابر جاوید نے انٹرنیشنل جرنل آف ریسرچ میں اپنے آرٹیکل میں اظہار خیال کیا ہے:

> “A study of perfect social trie political set-up The Utopia of Moor and Munnu tried to exsclaim how the society would be in a Utopia, how will be the citizens work and live , and how will be the social-economic aspects of an ideal-society.” (2)

مصنف کے نزدیک ان دونوں کتابوں کے بعد یوٹوپیائی ریاست کے خدوخال کافی حد تک واضح ہو چکے تھے اور اب وہ مقام آ گیا تھا جب یوٹوپیا مفکرین کے ذہنوں سے نکل کر صفحہ ء قرطاس پر آنے اور پھر مادی صورت اختیار کرنے والا تھا۔

۱۸۴۷ء میں کمیونسٹ مینی فیسٹوCommunist Mamifesto کے نام سے ایک مثالی ریاست کا تصور مارکس اور اینگلز نے دیا تھا۔ یہ کتاب مارکسسٹ نظریات کی ترویج کے لیے تحریر کی گئی جس میں مصنف نے کمیونزم کے فلسفہ کی بنیاد پر ایک منصفانہ معاشرے کا تصور پیش کیا لیکن یہ تصور خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ہر انسان کی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں اور اس کو اس کے کام اور کوشش کی بنیاد پر سہولتیں اور معاوضہ دینا چاہیے۔ ناقدین کے بقول یہ نظریہ غیر منصفانہ اور غیر منطقی تھا اس لیے عوام و خواص میں کچھ زیادہ پذیرائی حاصل نہ کر سکا۔

یوٹوپیا کی مختصر تاریخ پر ایک اجمالی نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سماجی یوٹوپیا کے متعلق مفکرین کا نقطہء نظر وقت کے ساتھ ارتقا پذیر رہا ہے۔ افلاطون اور منو کے نزدیک حکومت کی بہترین شکل بادشاہت (Monarchy) ہے۔ مارکس نے کمیونزم کو اپنا مثالی طرزِ حکومت قرار دیا۔ افلاطون نے معاشرے کو اقتصادی صلاحیتوں کے لحاظ سے مختلف گروہوں میں تقسیم کیا اور مارکس نے معاشرے میں انصاف اور توازن کا قانون لاگو کر کے اس کو مثالی بنانے کی کوشش کی۔

سماج نے ان تمام مفکرین کے اثرات کو قبول کیا اور یوٹوپیا کے حصول کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سماجی یوٹوپیا کی کوئی ایک مخصوص تعریف ممکن نہیں ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں کے معاشرتی رویہ میں بدلاؤ آتا ہے اس لیے سماجی یوٹوپیا کی کوئی مخصوص سماجی تعبیر ممکن نہیں۔

تاہم ان مفکرین کے نظریات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ معاشرے کو بہتر بنانے کے لیے اخلاقی حدود و قیود کا ہونا لازمی ہے جس کے لیے قانون بنائے جائیں جو لوگوں کو پابند کر سکیں۔ سہگل نے اس صورتِ حال میں اپنی رائے یوں دی:

> “ But the dream goes away when the utopian vision is not merely imposed through logical.”(3)

کیونکہ اس کے خیال میں ایک یوٹوپیائی سماج میں انصاف نہ صرف عدالتوں میں بلکہ سماجی اقدار اور روایات میں بھی عیاں ہونا چاہیے۔ غریب و امیر کو اپنے مقاصد کے حصول کے یکساں مواقع میسر ہوں۔ معاشرے میں کسی قسم کا امتیازی سلوک حیثیت، مرتبہ اور دولت کو مدِ نظر رکھ کر نہ رکھا جائے۔

کارل مارکس کے مطابق:

"The citizens may rebel if the society is changed through-political change.(4)

مارکس کے نزدیک اگر معاشرے کو سیاسی انداز سے تبدیل کیا جائے گا تو لوگ اس کے خلاف بغاوت کریں گے کیونکہ سماج میں سیاسی تبدیلی مارکس کے نزدیک کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ اس کے مطابق سماجی یوٹوپیا کا حصول تب ممکن ہو سکے گا جب لوگوں کے معیارِ زندگی، ان کی روایات اور ان کے اقدار میں تبدیلی آئے گی۔ اگر ان مفکرین کے خیالات کو عملی جامہ پہنایا جائے تو سماجی یوٹوپیا کی تعبیر ممکن ہے۔ لیکن اس کے لیے لوگوں کے رویوں اور کردار میں تبدیلی لانا زیادہ ضروری ہے۔

یوٹوپیا کی سیاسی تعبیر

یوٹوپیا کے موضوع پر سب سے پہلے افلاطون نے قلم اٹھایا۔ اس نے اپنی کتاب "ریاست" "Republic" میں متنوع طرزِ حکومت کا ذکر کیا ہے جس میں Oligocracy Aristocracy اور Democracy نمایاں ہیں۔ افلاطون کے خیال میں حکومت کی باگ ڈور فلسفیوں کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ ان کے فلسفیانہ نظریات ملک میں تبدیلی لا سکتے ہیں۔ وہ لوگوں کو اپنی پسندیدہ طرزِ حکومت یعنی Aristocracy کی طرف مائل کریں گے کیونکہ یہی بہترین طرزِ حکومت ہے اور عوام کے مسائل کا حل نکال سکتا ہے۔

افلاطون کے برعکس تھامس مور کے نزدیک ملک کے حکمران ماہرِ تعلیم ہونے چاہئیں کیونکہ تعلیم کی بدولت ہی ملک کے حالات میں تبدیلی آ سکتی ہے اور اپنے حکمرانوں کا انتخاب عوام خود کرے۔ تھامس مور جمہوریت کو اپنی مثالی ریاست کے لیے بہترین طرزِ حکومت کے طور پر منتخب کرتا ہے۔ مور کے یوٹوپیا میں کوئی تحریری معاہدہ نہیں ہوتا کیونکہ زبان پر اعتبار کیا جاتا ہے۔ مور کے نزدیک اخلاقی اعتبار سے زندگی کا مقصد خوشی حاصل کرنا ہے کیونکہ خدا کا مقصد بھی یہ تھا کہ انسان زندگی میں خوش رہے لہٰذا زندگی کا حاصل خوشی کا حصول ہے۔

ڈاکٹر ڈارین شالیف[1] اپنے لیکچر میں بتاتا ہے کہ تھامس مور نے یوٹوپیا کے ذریعے ایک اخلاقی نظریہ دیا ہے جس کالبِ لباب یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد خوشی کا حصول ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے دو طریقے بتائے ہیں۔ ایک جسمانی اور دوسرا ذہنی سرور یا خوشی۔

جسمانی خوشی ہم جسم کی مادی و جنسی ضروریات پوری کر کے حاصل کرتے ہیں جب کہ اولین خوشی یا ذہنی خوشی کا حصول دوسروں کے کام آنا اور مدد کرنا ہے اور یہی اخلاقی یوٹوپیا کی معراج ہے۔

جاوید چودھری بحیثیت کالم نگار

جاوید چودھری ۱ جنوری ۱۹۶۸ء میں پیدا ہوئے۔ وہ مشہور پاکستانی کالم نگار ہیں۔ ۲۰۰۸ء سے تاحال وہ ایکسپریس نیوز میں "کل تک" شو کی میزبانی کر رہے ہیں۔ جاوید چودھری نے "زیرو پوائنٹ" کے عنوان سے اردو زبان میں کالم لکھے ہیں۔ ان کا تعلق لالہ موسیٰ (ضلع گجرات) سے ہے۔ بعد ازاں وہ لاہور منتقل ہو گئے۔ بہاول پور کی اسلامیہ یونیورسٹی سے ابلاغیات میں ایم اے کیا۔ کولمبیا یونیورسٹی (Columnbia University) اور جونز ہوپکنز یونیورسٹی (Johns Hopkins University) سے بھی ابلاغیات کے شعبے میں ڈپلومہ حاصل کیا۔

جاوید چودھری پاکستان کے معروف کالم نگار ہیں۔ ان کے کالم مختلف معلومات سے لبریز ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا زندگی کے متعلق ایک مخصوص نقطہء نظر ہے۔ ایک طرف وہ پاکستان کے موجودہ نظامِ حکومت سے کچھ زیادہ مطمئن نظر نہیں آتے تو دوسری جانب وہ امریکا اور یورپ کے نظامِ حکومت کو مسیحائے عالم ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ ناقدین کے مطابق ان کی تنقید اس قدر سخت اور ترش ہوتی کہ پڑھنے والا مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ ان کو ایک قنوطیت پسند کالم نگار کے طور پر دیکھنے اور سمجھنے لگتا ہے۔ کیونکہ وہ پاکستان کو ایک ناکام ترین ملک بھی سمجھتے ہیں یعنی یہ ایک Banana Republic ہے لیکن صرف اس خصوصیت کی بنا پر ان کو ایک یاسیت پسند یا منفی سوچ رکھنے والا کالم نگار کہنا بھی درست نہیں ہے۔ کیوں کہ ایک طرف جب وہ وطنِ عزیز کی صورتِ حال کو مکمل افراتفری (Chaos) یا ڈسٹوپیا قرار دیتے ہیں تو دوسری جانب مغرب کے سیکولر طرزِ حکومت اور اس کے نمائندوں کو نظریاتی اور تقلیدی نقطہء نظر سے پیش کرتے ہیں۔ اس میں ان کا یوٹوپیا نظر آتا ہے۔ ان کے کالموں میں سیکولر ازم کے

---

1 Dr Darren Shalloff's Lecture on the Moor's Utopia."The search for meaningful Past": Jan 2004

فروغ کی بھرپور کوشش نظر آتی ہے۔ بارہا انھوں نے اسلام کے نام پر حاصل کیے گئے اس ملک کو سیکولر بنانے کی خواہش کا برملا طور پر اظہار بھی کیا ہے۔ اس بات کا اظہار کالم نگار نے محقق سے اپنے انٹرویو میں بھی کیا۔ اپنی باتوں کو اہم، مدلل اور ٹھوس ثابت کرنے کے لیے وہ حقیقی زندگی سے کرداروں کا انتخاب کرتے ہیں جنھیں اپنی خود ساختہ تعبیر کے سامنے لاجواب کرتے نظر بھی آتے ہیں۔

اگر جاوید چودھری کے یوٹوپیا کی بات کی جائے تو اس کے مثالی طرزِ حکومت کے تین بنیادی ستون ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کے یوٹوپیا کی بنیاد پہلے اسلاموٹوپیا، دوسرا سیکولر طرزِ حکومت اور تیسرا جمہوری نظامِ حکومت اور آئیڈلزم پر ہے۔ سعودی عرب میں ۲۰۱۱ء میں ان کو حکومت کا انتظام و انصرام مثالی نظر آیا کیوں کہ وہاں مسلمان ایک جسدِ واحد کی طرح حرم پاک کے وسیع صحن میں ایک امام کی اقتدا میں نماز پڑھتے ہیں۔ شیعہ سنی، بریلوی، حنفی اور دوسرے تمام فقہا کے معتقدین ایک دوسرے کے ساتھ بحیثیت مسلمان کھڑے نظر آتے ہیں۔

> "ایک ہی صف میں کھڑے لوگ مختلف انداز سے ایک ہی امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے۔
> کسی نے پیٹ پر ہاتھ باندھ رکھے تھے، کسی کے ہاتھ ناف پر تھے۔ کسی کے ٹخنے ننگے تھے، کسی
> کی شلوار نے اس کی ایڑیاں ڈھانپ رکھی تھیں، کسی کے پاؤں کے درمیان زیادہ فاصلہ تھا،
> کسی نے پاؤں جوڑ رکھے تھے، کسی نے احرام باندھ رکھا تھا، کوئی شلوار قمیض میں ملبوس تھا،
> کسی نے پتلون پہن رکھی تھی۔"(۵)

غرض کہ مختلف مسالک اور طرزِ فکر سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک امام کے پیچھے نماز ادا کر رہے تھے۔ ہمارے ملک میں فرقہ بازی اور نفرت کی فضا عام ہے۔ اس لیے کالم نگار کو یہ اتحاد کی فضا بہت پسند آئی۔

جاوید چودھری کی تکنیک بطورِ کالم نگار

جاوید چودھری کے کالموں کی ابتدا عموماً کسی واقعے، داستان یا کہانی سے ہوتی ہے کیوں کہ وہ افسانے کو ادب کی معراج سمجھتے ہیں۔ اس لیے کالم میں افسانے کی تکنیک استعمال کرتے ہیں۔ افسانے میں کہانی ہوتی ہے اور ان کے کالم میں بھی۔ افسانے میں بھی، خبر، تفصیل اور جذبات ہوتے ہیں اور ان کے کالم میں بھی ایسا ہی ہے۔ افسانے کے تمام افراد غیر حقیقی اور فرضی ہوتے ہیں اور تخلیق کار اپنے فلسفے، نظریے اور تخلیقی جوہر ثابت کرنے کے لیے کہانی اور کرداروں کا سہارا لیتا ہے۔ کالم بھی کسی نہ کسی تازہ واقعے اور حقیقی کردار کے گرد

گھومتا ہے۔ کالم نگار کے مطابق انھوں نے اس سلسلے میں کہانیوں اور کرداروں کا سہارا لیا ہے کیوں کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنا پیغام اپنے لوگوں تک پہنچانے کے لیے قصے کہانیوں کا سہارا لیا ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت مریم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ۔ مصنف کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ داستانی طرزِ تحریر اور طرزِ مخاطب چونکہ انسانی فطرت کے قریب تر ہے اور یہی داستان طرازی ان کے کالموں کی انفرادیت بھی ہے۔ مصنف کے مطابق ان کے کالم عام لوگوں کے لیے ہوتے ہیں۔ اس کا قاری ایک عام شخص ہے اور اس کی وجہ وہ یہ پیش کرتا ہے کہ کسی خیال یا تحریر کو جب تک عام شخص کی تائید حاصل نہ ہو گی اس وقت تک اس کی سچائی قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ حکمران اکثر جھوٹ بولتے ہیں اور اعلیٰ طبقے کے لوگ اس کی تائید کرتے نظر آتے ہیں لیکن عام شخص کبھی ان کے جھوٹ اور فریب میں نہیں آتا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے محروم طبقوں کو سچ اور جھوٹ کی تمیز کی صلاحیت عطا کی ہے۔

کالم نگار کے کالموں کی اضافی خوبی معلومات کی فراہمی بھی ہے۔ سچائی کے ساتھ ساتھ معلومات اور علم کی فراہمی ضروری ہوتی ہے۔ موجودہ صدی علم کی صدی ہے اور اس میں وہی کالم نگار کامیاب ہوتے ہیں جو قاری کو حالات حاضرہ کے ساتھ معلومات بھی فراہم کرتے ہیں۔ علم اور معلومات سے عاری تحریریں وقتی طور پر متاثر تو کرتی ہیں لیکن دیرپا اثر نہیں چھوڑ سکتیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے کالموں کی اضافی خوبی جذبات ہیں کیوں کہ وہ جذبات کو تحریر کی روح سمجھا جاتا ہے اس لیے اگر تحریر میں جذبات کی روح نہ ہو تو وہ انسانی جسم کی مانند بے جان ہو جاتی ہے۔

کالم نگار اپنے قارئین کو جذباتی طور پر بھی متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ جو نکتہ آپ عقل اور دلیل سے نہیں منوا سکتے اس کو جذباتی دلائل کی مدد سے منوایا جا سکتا ہے۔ کالم نگار کے یوٹوپیا کا پہلا ستون اسلاموٹوپیا ہے۔ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر ایک مثالی ریاست قائم ہو سکتی ہے مثلاً آج کی عورت جس آزادی کا مطالبہ کرتی ہے وہ اسلام نے اسے چودہ سو سال پہلے عطا کی تھی۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، کالم نگار کے یوٹوپیا کا دوسرا اہم عنصر آئیڈیلزم ہے۔ ایک جگہ اس کی ایک مثال انھوں نے خالد معراج کی زندگی سے دی ہے۔ مذکورہ کالم کا عنوان بھی علامتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ اور ان جیسی شخصیات ملک کی تقدیر بدل سکتی ہیں۔ ان سے یہ امید رکھی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے اعلیٰ کردار اور بلند ہمتی سے حالات کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ کالم نگار کے آئیڈیلزم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سرفہرست ہیں جنھوں نے ریاستِ مدینہ کی روایت کو آگے بڑھایا۔

اس کے علاوہ وہ چین کے بانی ماؤزے تنگ کو بھی وہ اسی قطار میں کھڑا کرتے ہیں کیونکہ ان کی محنت اور دیانت داری نے چین کی تقدیر بدل ڈالی۔

وہ لکھتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو وہ عزت و احترام عطا کیا جو آج کی یورپ کی آزاد عورت کو بھی حاصل نہیں ہے۔ اگر آج ہمارے معاشرے میں عورت کے عزت و احترام کی وجہ سے بسوں میں نشست خالی کی جاتی ہے۔ آج بھی لوگ بیٹی کے پیدا ہونے پر شراب پینا چھوڑ دیتے ہیں تو یقیناً یہ ان مثالی اسلامی تعلیمات کا نتیجہ اور اس مثالی معاشرے کا پرتو ہے جو اسلام کے نام پر ریاستِ مدینہ کی حیثیت سے قائم ہوا تھا۔ اسلام کے اس مثالی معاشرے کی عظمت کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ فیروز خان نون نے کسی مسئلے پر انگریز سرکار کو چنگیز خان جیسے حملے کی دھمکی دی جس کے جواب میں نہرو نے مجلسِ احرار کے ایک جلسے میں کہا تھا کہ افسوس چنگیز خان کا ذکر کرنے والے بھول گئے ہیں کہ ان کی تاریخ میں ایک عمر فاروق بھی تھا۔

آج جب چند ناسمجھ خواتین مغرب جیسے نسوانی آزادی کی طلب گزار ہیں جس میں طلاق، جنسی آزادی اور ناجائز بچوں کے سوا کچھ نہیں تو افسوس ہوتا ہے کہ میڈونا اور الزبتھ ٹیلر جیسی زندگی کی خواہش مند خواتین یہ حقیقت بھول گئی ہیں کہ ان کی تاریخ میں ایک فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں جو اصلی اور سچی عورت تھیں۔

جاوید چودھری کے یوٹوپیا کا دوسرا بنیادی ستون (Idealism) ہے۔ جس سے مراد ان سیاسی و سماجی شخصیات کی مدح سرائی اور ان کو بطورِ آئیڈیل پیش کرنا ہے جو ملک کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ اس کا بنیادی مقصد ایک مثالی معاشرے کے خدوخال پیش کرنا ہیں اور رچوں کہ کوئی بھی مثالی معاشرہ یا نظامِ حکومت اس کے چلانے والے پر منحصر ہے اس لیے اگر حکمران مثالی دیانت دار مخلص اور صادق اور امین ہوں گے تو وہ ریاست یا مملکت کو مثالی طور پر تشکیل دے سکیں گے۔ اپنے کالم "نجات دہندہ" میں جاوید چودھری نے ملک معراج خالد کو ایک مثالی حکمران کے طور پر پیش کیا۔ ان کے خیال میں ایسے مثالی حکمران ملک کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔

> " آپ نے کلرکی سے آغاز کیا۔ آدھی سے زیادہ زندگی سائیکل چلاتے گزاری۔ کرائے کے مکانوں میں رہتے رہے۔ سگریٹ کا عوامی برانڈ پیتے رہے، افریقا اور ایشیا کو قریب لانے کا خواب دیکھتے رہے، بھٹو کے غریب ترین ساتھی رہے، سرکاری تقریبات میں سب سے پہلے پہنچتے رہے، لاہور پریس کلب کی پرانی عمارت کے نیچے تھڑے پر بیٹھ کر تمباکو نوشی کرتے رہے۔ "(٦)

ایک ایسا حکمران جس نے وزارت عظمیٰ کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد بھی اپنا پرانا بوسیدہ گھر نہ چھوڑا اور جس کے دروازے پر کال بیل تک نہیں لگی تھی۔ لاہور کی تنگ و تاریک گلیوں میں موجود یہ گھر جس کی خاتونِ اوّل گھر کا سارا کام خود کرتی تھیں۔

اسی Idealism کی انگلی پکڑے ہوئے کالم نگار حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں داخل ہوتے ہیں جن کی راتیں مدینہ منورہ کی چوکیداری کرتے اور دن صحرا کی تپتی دھوپ میں گزرتے تھے۔ تاریخِ اسلام کے عظیم سپہ سالار خالد بن ولید کو بھی دنیا ان کی اولاد یا معمولاتِ زندگی کی بجائے ان کے کارناموں کے باعث جانتی ہے۔ چین کے عظیم بانی ماؤزے تنگ کپڑوں اور جوتوں کے ایک جوڑے پر زندگری بسر کرتے تھے اور آج بھی دنیا ان کو ان کے کارناموں کے باعث یاد کرتی ہے اس لیے آج کے حکمران اگر خود کو تاریخ کے صفحات میں زندہ رکھنے کے خواہاں ہیں اور یہ چاہتے ہو کہ نوٹوں پر ان کی تصویریں چھپیں تو قوم کے ساتھ انصاف کریں۔ پچاس برس سے اقتدار کے دروازے پر کھڑے اس ہجوم کو قوم بنادیں کیونکہ تاریخ اور عوام دونوں صرف ان قبروں پر رکتی ہے جہاں انسانوں کے نجات دہندہ سوئے ہوتے ہیں۔

کالم نگار برطانیہ کی وزیر اعظم کا تقابل اپنے حکمرانوں سے کرتے ہیں اور اس تقابل کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ملک کے حکمران عیاشیاں کرتے ہیں ملک کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں لیکن اس کا خمیازہ اس کے ملک اور اس کے لوگوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کالم نگار کے مطابق اگر ہمیں بھی ماؤزے تنگ اور مارگریٹ تھیچر جیسے مخلص رہنما میسر آتے تو ہماری صورت حال بھی بہت بہتر ہوتی۔

کالم نگار کا یہ آئیڈیلزم اسلامی تاریخ سے گزرتا ہوا سلطنتِ برطانیہ تک جا پہنچتا ہے۔ کیونکہ ایک سیکولر طرز جمہوریت کالم نگار کا یوٹوپیا ہے۔ ایک ایسی مثالی سلطنت جہاں قانون اور انصاف کی حکمرانی ہے۔ کالم نگار کے دل میں گوروں اور ان کے اندازِ حکومت کے لیے پسندیدگی کا اظہار بھی بارہا نظر آتا ہے۔

برطانیہ کی آئرن لیڈی مارگریٹ تھیچر کی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اس کا آفس کم اور گھر زیادہ تھا۔ دن میں ۴ گھنٹے سے زیادہ وہ نہیں سوتیں۔ ان کے فلیٹ کے لیے کوئی لفٹ نہیں تھی اور خدمت کے لیے کوئی نوکر بھی موجود نہ تھا۔ مہمانوں اور اپنے لیے کھانا تیار کرتیں تھیں۔ اپنوں سے دور تھی کیونکہ کام کی کثرت کے باعث اپنے خاندان سے ملاقات کا وقت ہی نہیں ملتا وہاں برطانیہ جو کبھی دنیا کی عظیم

طاقت تھی ایک ایسا ملک تھا جس میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا اور اب سورج طلوع نہیں ہوتا ہے۔ اس کا وزیر اعظم اس قدر کسمپرسی کی زندگی گزار رہا ہے اور دوسری طرف ہمارے وزیرِ اعظم ہیں جو اپنے جاہ و جلال میں عظیم برطانیہ سے بڑی سلطنت کے مالک نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ اس کے تصرف میں سیکڑوں ایکڑ پر پھیلا وزیر اعظم ہاؤس چھ منزلہ عظیم الشان سیکرٹریٹ اور ڈیڑھ دو ہزار کا عملہ ہے اور مزید وہ کسی قانون کے آگے جواب دہ بھی نہیں ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سلطنتوں کی امارت اور غربت کا پیمانہ دیکھا جائے تو جواب یہ ملتا ہے کہ جن ملکوں کے حکمران غریب ہوتے ہیں وہ ملک امیر ہوتے ہیں اور جن ملکوں کے حکمران فرعون بن کر ایوان میں داخل ہوتے ہیں اور قارون بن کر نکلتے ہیں، وہ ملک اور اس کی عوام کو غریب بنا دیتے ہیں۔

کالم نگار نہ صرف مغرب کے حکمرانوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں بلکہ ان کے نظامِ حکومت کو بھی آئیڈیل قرار دیتے ہیں۔ قانون اور انصاف کی حکمرانی کی ایک مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ فیلڈ مارشل منٹگمری جس نے جنگِ عظیم دوم میں نازیوں کی پھیلی ہوئی آگ کو بجھایا۔ ان کی جنگی حکمتِ عملی آج بھی دنیا بھر کے عسکری نصاب کا حصہ ہے لیکن اس نے اپنے بڑھاپے میں زندگی کو سہل بنانے کے لیے ایک معمولی فلیٹ یا زرعی زمین کا مطالبہ کیا تو اس کے جواب میں سلطنتِ برطانیہ نے اس کی خدمات اور صلاحیتوں کا تو اعتراف کیا لیکن کسی فلیٹ یا زمین کو دینے سے انکار کرتے ہوئے یہ کہا کہ آپ اپنی خدمات کا معاوضہ زندگی میں وصول کرتے آئے ہیں۔

برطانیہ کی وزیرِ اعظم کو اختیار ہی نہیں حاصل ہے کہ وہ ماورائے آئین خود کو کسی قسم کی مراعات دے سکے۔ اسی کالم "احتجاج نہ احسان" میں آگے چل کر کالم نگار نے گولڈا مائیر کا ذکر کیا ہے جو اسرائیل کی وزیرِ اعظم تھیں۔ انھوں نے چند پہاڑوں، تھوڑے سے بنجر، چٹیل میدانوں اور دنیا میں بکھرے چند لاکھ لوگوں کو دنیا کی سب سے بڑی اقتصادی قوت بنا دیا۔ ایک امریکی سنیٹر جب اس سے ملنے آیا تو اس کے گھر کے حالات کچھ اس طرح تھے۔

> "خاتون نے سنیٹر کا استقبال کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے سیدھی کچن میں لے گئی جہاں اسے چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل پر بٹھا دیا گیا۔ گولڈا مائیر نے سفارتی گفتگو کے آغاز کے ساتھ ہی چولھے پر چائے کے لیے پانی رکھ دیا۔ پھر ٹیبل پر آ بیٹھی اور امریکی سنیٹر سے جہازوں اور ایف ۱۶ کا

سوداشروع ہو گیا۔ بھاؤ تاؤ اور ابتدائی شرائط پر گفتگو کے دوران ہی گولڈا مائیر چپکے سے اٹھی اور پیالیوں میں چائے بھر کر لے آئی۔ ایک کپ امریکی سینیٹر کے سامنے رکھا اور دوسرے گیٹ پر کھڑے امریکی گارڈ کو پکڑا آئی۔ گفتگو بھی شروع ہوئی۔ شرائط طے پانے لگیں، اسی دوران اس نے پیالیاں سمیٹیں اور ٹونٹی کھول کر انھیں دھونے لگی۔ دوبارہ ٹیبل پر بیٹھی اور امریکی سینیٹر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ مجھے یہ سودا منظور ہے۔ آپ تحریری معاہدے کے لیے اپنے سیکرٹری کو میرے سیکرٹری کے پاس بھجوا دیجیے۔"(۷)

یہ کالم نگار کا Idealism آئیڈ یلزم ہے۔ اس کی مثالی ریاست کے حکمرانوں کی ایک جھلک جس کے مقابل ہمارے ملک کے حکمران تو کسی بڑے ملک کے حکمران نظر آتے ہیں۔ کالم نگار کے مطابق، زندگی میں اہمیت ظاہری شان و شوکت، جاہ و جلال کی نہیں ہوتی ہے بلکہ محنت، وطن کے ساتھ خلوص اور حب الوطنی کا جذبہ اہم ہوتا ہے۔ کوئی شخص اپنی گاڑی، کپڑوں اور بنگلے سے بڑا آدمی نہیں بنتا بلکہ اپنے کام محنت، کوششوں اور کارناموں سے خود کو بھی اور اپنے ملک کو بھی زندہ اور جاوید بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ دنیا آپ کو آپ کے کارناموں کی بناپر جانتی اور یاد رکھتی ہے۔ سوئٹزرلینڈ کا صدر اپنے روزمرہ کے تمام امور خود سرانجام دیتا ہے۔ اس کی مدد کے لیے کوئی نوکر یا ملازم نہیں ہے۔

روس کے صدر گورباچوف کو ایوانِ اقتدار سے فراغت کے بعد ماسکو میں فلیٹ تک دستیاب نہیں ہوا۔ جاپانی وزیرِ اعظم کو ایک معمولی سے کمرے میں معمولی سی میز پر بٹھایا جاتا ہے۔ ان تمام سربراہان مملکت کی زندگی کو بیان کرنا اور ان کو مثالی قرار دینے کا بنیادی مقصد مصنف کے ذہن میں موجود ایک مثالی ریاست کے قیام کا نقشہ کھینچا ہے یا دوسرے لفظوں میں ایک مثالی ریاست کا تصور جس کی بنیاد پر وہ مثالی ریاست کے خواب کو عملی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے اسی یوٹوپیا کی خیالی تصویر کالم نگار اپنے کالم 'طیفا بدمعاش' میں پیش کرتے ہیں۔ جاوید چودھری کے اکثر کالم تصوراتی یا تخیلاتی فضا میں تحریر کیے گئے ہیں۔ وہ اپنے چشمِ تصور میں ایک مثالی ریاست یا مثالی ماحول کا نقشہ کھینچتے ہیں اور اکثر یہ چشمِ تصور ان کا یوٹوپیا ہوتا ہے کہ وہ اپنے ملک میں ایسا نظام یا منظر دیکھنے کے خواہاں ہیں۔

لیکن مصنف نے اس کالم میں موک یوٹوپیا کو پیش کیا ہے۔ موک یوٹوپیا سے مراد ایسا تصوراتی اور مثالی نقشہ ہے جو بظاہر تو یوٹوپیا ہوتا ہے لیکن دراصل وہ موجودہ معاشرے پر طنز ہوتا ہے۔ کالم نگار نے بھی اس

کالم میں اپنے شہر کی ایسی صورت حال پیش کی ہے، ایک ایسے مثالی شہر کا نقشہ کھینچا ہے جو دراصل مثالی نہیں ہے لیکن وہ اپنے خیالوں میں ملک کو ایسا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا آئیڈیل ایک ایسا شہر جہاں لوگوں کو تمام ضروریاتِ زندگی بنا کسی رشوت کے میسر ہوں گی۔ صفائی ستھرائی کا اعلیٰ نظام ہو گا۔ بجلی اور گیس کی بندش کا کبھی سامنا نہ کرنا پڑے۔ ملک میں چھائی ہوئی رشوت ستانی اور بدعنوانی کے بادل چھٹ جائیں۔ سرکاری افسران ذمہ داری اور دیانت داری سے فرائض سرانجام دیں۔

بعض اوقات ان کے کالموں میں ایک فکاہی تاثر اور افسانوی رنگ بھی ہوتا ہے۔ جیسے مذکورہ کالم میں نظر آتا ہے۔ اپنے کالم "طیفا بد معاش" میں کالم نگار ایسی ہی تصوراتی صورتِ حال پیش کرتے ہیں:

"تم یقین کرو، ہمارے محلے کی استانیاں اور ماسٹر کبھی غیر حاضر نہیں ہوئے، ڈسپنسری کا ڈاکٹر کبھی لیٹ نہیں ہوا، خاکروب نے کبھی چھٹی نہیں کی، ہماری نالیاں کبھی گندی نہیں رہیں، ہمارے کوڑے دانوں نے کبھی بدبو نہیں چھوڑی، ہمارے بجلی کے تار کبھی نہیں ٹوٹے، ہمارے ٹیلی فون کبھی بند نہیں ہوئے، گیس لیک نہیں ہوتی، دائی نے کبھی نخرہ نہیں کیا، ناموں کا اندراج کرنے والے کلرک نے کبھی پیسے نہیں لیے، حفاظتی ٹیکوں والوں نے فرلو نہیں لگایا اور ٹونٹیوں سے کبھی ہوا خارج نہیں ہوئی۔"(۸)

یوں مصنف ایک تصوراتی نقشہ کھینچتا ہے۔ وہ نہ صرف اہلِ مغرب بلکہ کہیں کہیں اپنے ہمسایہ ملک ہندوستان سے بھی متاثر نظر آتا ہے کیونکہ ان ممالک میں جمہوری طرزِ حکومت کامیابی کے ساتھ رائج ہے۔ ان کے مطابق، بھارت کے وزیرِاعظم لعل بہادر شاستری چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے، چٹائی پر سوتے تھے اور ان کی اہلیہ خود اپنے ہاتھوں سے گھر کا کام کرتی تھیں جب کہ مرار جی ڈیسائی سڑک پر گاڑی رکوا کر لوگوں کو کیلے کے چھلکے کچرے کے ڈبے میں پھینکنے کی ہدایت کرتے نظر آتے تھے، صدام حسین کی کامیابی اور ہر دل عزیزی کا راز فقط یہ تھا کہ اگر اس کے ملک کے لوگ ایک روٹی کھاتے تھے تو وہ بھی ایک ہی روٹی کھاتا تھا۔

مصنف یہ دعویٰ کرتا ہے کہ جس روز وزیرِاعظم عام گاڑی پر بس ڈرائیوروں کو ہدایت دیتے نظر آئے۔ خاتون اول نے اپنے ہاتھوں سے گھر کا کام شروع کر دیا، لوگوں کو چھلکے کچرے کے ڈبوں میں پھینکنے کی ہدایت کرتے دکھائی دیں، ان کے بچے چھ نمبر وین پر سکول جائیں گے، وزیر اعلیٰ کی گاڑی کا چالان ہو گا اور انھوں نے اے سی کی عدالت میں قطار میں کھڑے ہو کر پیسے جمع کرائے، ٹوبہ ٹیک سنگھ کے معراج دین نے پی

سی او سے فون کیا اور وزیر اعظم پاکستان نے خود اپنے کانوں سے اس کی شکایت سنی، اس روز پاکستان کی کسی گلی، کسی چوراہے، کوئی اشارہ کوئی بتی اور کوئی شیشہ نہیں ٹوٹے گا۔ کسی لیڈر، کسی وزیر، کسی مشیر کو گالی نہیں دی جائے گی۔ اس نظام کو جو لیڈر کو برہمن اور عوام کو شودر بنا دیتا ہے ختم کر دیں ورنہ یہ نظام عوام کو مٹا دے گا کہ بارود کا لباس پہن کر آگ کے نزدیک کھڑے ہونے والے لوگ بھی زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہتے اور یہ آگ جلد ان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

جاوید چودھری دراصل اس مفاد پرست اور ظالمانہ نظام کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں جو ملک پر قابض اور حکمران ہیں۔ وہ غریبوں کے حقوق غصب کر رہے ہیں۔ ملک کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ ان کے بعض کالموں میں اسلاموٹوپیا کے عناصر بھی نظر آتے ہیں۔ اس کے مطابق اسلام کو جس قدر نقصان مسلمانوں کی غیر دانش مندانہ پالیسیوں سے پہنچا ہے اتنا شاید ہی غیر مسلموں کی وجہ سے ہوا ہے۔ مولوی کو مولوی کے ذریعے ہی ناقابلِ برداشت ثابت کیا گیا ہے اور مدرسے کو مدرسے سے متعلقہ لوگوں نے ہی بدنام کر دیا ہے۔ اہلِ عالم کے سامنے مذہب کی غلط تفسیر و تشریح نے اسلام کو ڈر بنا دیا ہے اور اسی وجہ سے نہ صرف غیر مسلم بلکہ مسلمانوں کے اندر بھی مولوی حضرات کے خلاف نفرت اور تحقیر کے جذبات عام نظر آتے ہیں۔ کالم نگار اس تبدیلی کی فضا کو طبقہ عوام سے لے کر طبقہ خواص تک دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ مغربی حکمرانوں کی طرح ہمارے حکمران اور ان کی بیگمات روزمرہ کے فرائض خود سرانجام دیں۔ (VIP) کلچر کا خاتمہ ہو جائے۔ لوگوں کے پرامن احتجاج پر ڈنڈے نہ برسائے جائیں۔ کالم نگار کا خیال ہے کہ اگر ایسا نہ ہوا تو جلد یا بدیر یہ نظام اپنی موت آپ مر جائے گا کیونکہ کافر کی حکومت تو قائم رہ سکتی ہے لیکن ظالم کی حکومت تادیر قائم نہیں رہ سکتی اور یہ قانونِ قدرت ہے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے جس کا حوالہ خورشید ندیم نے اپنے ۲۷ اگست ۲۰۲۰ء کے کالم میں بھی دیا تھا۔

جاوید چوہدری کے نزدیک اگر ہم موجودہ صورت حال میں بہتری لانے کے خواہاں ہیں تو سب سے پہلے ہمیں اپنے نظام تعلیم کو تبدیل کرنا ہو گا۔ لارڈ میکالے کا نافذ کردہ نظام تعلیم صرف غلام قوم ہی پیدا کر سکتا ہے کیونکہ وہ نو آبادیاتی نظام میں نافذ کیا گیا تھا۔ یہ نظام تعلیم دو انتہاؤں پر چل رہا ہے۔ ایک طرف تو مغرب زدہ تعلیم ہے جو طلبہ میں مغرب کی اندھی تقلید کا جذبہ اجاگر کرتا ہے تو دوسری جانب دینی تعلیم ہے جو احساس کمتری کے مارے ہوئے بچوں کے اندر جہاد اور احتجاج کے عنصر کو ابھارتی ہے جس کے باعث ملک میں دہشت

گری کی فضا پروان چڑھ رہی ہے۔ اس وقت ہمارے ملک کو ایک روشن خیال معتدل نظام تعلیم کی ضرورت ہے۔ ایک ایسا نظام تعلیم جو وقت کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے ایسی نسل کو پروان چڑھائے جو ملک کے مسائل کا ادراک رکھتی ہو۔ اس وقت ہمارے ملک کو پڑھے لکھے ہنر مند افراد کی ضرورت ہے جو ہر شعبہ میں ترقی کریں۔ ملک کو ماہر معاشیات کی ضرورت ہے جو معیشت کو سنبھال سکیں۔ یوٹوپیا کی بحث میں اچھے اور بہترین ڈاکٹر، انجینئر اور استاد درکار ہیں جو اپنے علم اور ہنر سے ملک کو اس مشکل وقت سے نکال سکیں۔ ایک بہترین اور آفاقی نظام تعلیم کی تجویز جان ڈیوی، جی ایچ ویل اور ایف ایچ بریڈ نے بھی دی جس کو انھوں نے تمام مسائل کا حل بتایا گیا تھا۔

مسلمانوں نے دنیا پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ جس مذہب میں ایک مولوی دوسرے مولوی کے پاس بیٹھنے کا روادار نہ ہو گا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایک دوسرے کو کافر اور ملحد ثابت کرنے کی کوششوں میں لگے ہوں۔ وہ مذہب جس کو اس کے اپنے پیروکار ہی غلط اور غیر عمل ثابت کرنے پر تلے ہوں وہ کسی غیر مسلم اور ملحد کے لیے کیونکر پرکشش ثابت ہو سکے گا۔

وہ کہتے ہیں کہ، مسلمانوں نے خود اپنے عمل سے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ جو لوگ معمولی سا اختلاف برداشت نہیں کر پاتے وہ مسائل کا حل کیونکہ نکال سکیں گے۔ ایک مسلک کے پیروکار دوسرے مسلک کے ماننے والوں کو اپنی مسجد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے ہیں تو ان کے اندر صبر، برداشت اور صلح رحمی جیسی اچھی اطوار کیونکر پیدا ہو سکتی ہیں۔ وہ مسلمان جمہوریت اور جمہوری اقدار کو کس طرح قبول اور کس طرح اس کی پیروی کر م سکتے ہیں۔ مسلمانوں نے اپنے طرزِ عمل سے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ہم پتھر کے زمانے کے لوگ ہیں اس لیے ہم اینٹ کا جواب بھی پتھر سے ہی دیتے ہیں۔ جاوید چودھری اس نظام تعلیم کے بھی خلاف ہیں جو ہمارے وطنِ عزیز میں نافذ ہے اور جس کی مدد سے مسلمانوں کو نظریاتی طور پر کمزور کیا جا رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کی جڑیں (Root) کھوکھلی کی جا رہی ہیں۔ ایک طرف پاکستان میں ایسا بنیاد پرست طبقہ پروان چڑھ رہا ہے جو اسلام، جو ایک دینِ فطرت ہے اور جس کو عقل و شعور قبول کرتے ہیں لیکن ان بنیاد پرست ملاؤں نے اس دین کو شدت پسندی، بنیاد پرستی اور جنونیت کی بھینٹ چھڑھا دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام کو مذہبی جنونیت کے مترادف بنا دیا ہے۔ جب کہ دوسری طرف انگریزی میڈیم سکولوں میں ایک ایسی نسل پروان چڑھ رہی ہے جو اپنے مذہب، اپنی تاریخ، اپنے اسلاف اور اپنی تہذیب کو

بالکل بھلا چکی ہے۔ وہ انگریز کی اندھا دھند تقلید میں اس قدر آگے نکل چکے ہیں کہ فردوسی کو خاتون، سعدی کو کپڑا بیچنے والا شیخ، اقبال کو مولوی اور فیض کو شرفا سمجھتے ہیں۔ یہ دین سے بے بہرہ شتر بے مہار نسل قرآن مجید کو ٹیک اور نماز کو یوگا سمجھتے ہیں۔ مکہ مکرمہ کو مسلمانوں کا ویٹی کن سٹی گردانتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کو دی مسلم لیڈر کہہ کر پکارتے ہیں۔ انھیں دوسرا کلمہ نہیں آتا، نماز نہیں پڑھ سکتے، جنازے میں شریک نہیں ہو سکتے۔ مذہب کی آشنائی نہیں ہے اور نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم کے مصداق ناکام و نامراد ہیں کالم نگار اس صورتِ حال کو ملک کا ڈسٹوپیا قرار دیتا ہے۔ ہمارا ملک دراصل ان دونوں انتہاؤں میں کہیں کھو کر رہ گیا ہے اور نوجوان اپنا اصل راستہ فراموش کر چکے ہیں۔ کوئی اس صورتِ حال میں کس طرح تصور کر سکتا ہے کہ بہتری کی کوئی صورت نکل سکے گی۔ ہماری آنے والی نسل تو کوا چلا ہنس کی چال کی عملی صورت پیش کر رہی ہے اور ان کوّوں کو نہ تو ہنس قبول کرتا ہے اور نہ کوا۔ اگر ہم نے ان تمام مسائل سے نجات حاصل کر لی اور قوم ایک سیدھے رستے اور سیدھی منزل کی طرف لے کر جانا ہے جو ہمارے مسائل کو حل کر سکے گی تو ہمیں بحیثیت قوم اسلام کی عملی شکل کو بروئے کار لانا ہو گا۔ وہی اسلام جس کی بنیاد آقائے نامدار ﷺ نے رکھی تھی اور جسے بعد ازاں عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پوری دنیا میں پھیلایا تھا۔ وہ اسلام جو طبقاتی تفریق مٹاتا ہے، گورے اور کالے کی تمیز ختم کرتا ہے، عربی اور عجمی کی دیواریں گراتا ہے، انسان کو انسان سمجھتا ہے، مظلوم کی آہ سے ڈرتا اور خدا کے قہر سے کانپتا ہے۔ اگر نہیں تو پھر آپ کون سا اسلام نافذ کر رہے ہیں؟ آپ کا اسلام کیسا اسلام ہے جس کے دامن میں تازہ ہوا کا کوئی جھونکا نہیں، کوئی اصلاح اور کوئی تبدیلی نہیں۔ کالم نگار کے نزدیک ہمارے موجودہ مسائل کا حل اسلام کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے میں ہے۔ انھوں نے وطنِ عزیز کو ایک مثالی ریاست بنانے کے لیے تین عوامل کو بنیادی ستون قرار دیا ہے جن میں اوّل الذکر جمہوریت کی عملی اور بہترین شکل، دوسرا Idealism اور تیسرا اسلامو ٹوپیا ہے۔ اسلام نے ریاست کے لیے جس حکمتِ عملی کا اعلان کیا ہے وہ جمہوریت اور خلافت کی ملی جلی شکل ہے جس میں خلیفہ کی شکل میں ایک مثالی شخصیت یا Ideal ہوتا ہے۔ جمہوریت ایک ایسا طرزِ حکومت جس میں عوام کی مرضی و منشا چلتی ہے۔

کالم نگار ایک ایسے طرزِ حکومت کو مثالی قرار دیتا ہے جس میں اسلام کے اصولوں کے مطابق طرزِ حکمرانی ہو یہ ان کو یہ طرزِ حکومت مغربی اور غیر مسلم ممالک میں نمایاں نظر آتا ہے۔ مغربی ممالک بالخصوص انگلینڈ، فرانس، کینیڈا میں اسی فلاحی ریاست (Welfare State) کا تصور عملی شکل میں نظر آتا ہے جس کا

منبع وماخذ خود مذہب اسلام ہے اور جس ریاست کو عملی صورت میں اوّل الذکر حضرت ابو بکر صدیق ؓ اور حضرت علی ؓ نے قائم کر کے دکھایا تھا۔ آج یہ غیر مسلم لوگ ہمارے مذہب پر عمل پیرا ہو کر ترقی کے راستے پر چل رہے ہیں اور ہم خوار ہو رہے ہیں تارکِ قرآن ہو کر۔اس کے باوجود کالم نگار موجودہ حالت سے مایوس نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کے یوٹوپیا کا چوتھا ستون رجائیت پسندی (Optimism) ہے تو بے جانہ ہو گا۔ مصنف کے مطابق ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی ذرخیز ہے ساقی۔ ماضی پرستی (Nostalogia) بھی ان کے کالموں میں جابجا نظر آتا ہے۔ وہ جب حال کا موازنہ ماضی سے کرتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں اپنے بچوں کا موازنہ اپنے ماضی سے کرتے ہیں۔ آج کے اساتذہ کا موازنہ ماضی کے اساتذہ سے کرتے ہیں۔ ان کی محنت، جانفشانی اور صدقِ دل جو آج کے مادہ پرستانہ دور میں کہیں نظر نہیں آتا ہے۔ تو انھیں اپنی دھرتی کے بنجر پن کا دکھ ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر صدی میں ایک عظیم شخص پیدا ہوتا تھا جو قوم کی تقدیر بدلنے کا اختیار رکھتا تھا۔ کالم نگار اس روشن ماضی کو یاد کرتا ہے جب فیض صاحب جیسا قلندر تھا، راشد جیسا لفاظ تھا، مجید امجد جیسا نباض تھا، منٹو جیسا سفاک مگر حقیقت پسند افسانہ نویس تھا۔ آغا حشر جیسا ظالم مکالمہ نویس تھا اور صوفی تبسم جیسا دلوں میں اتر جانے والا شاعر تھا۔ حفیظ جالندھری جیسا تیز دماغ تھا اور پروفیسر سلیم اختر جیسا نقاد تھا لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ ہماری دھرتی نے سونے اگلنے ختم کر دیے ہیں۔

وہ اس وقت کو یاد کرتے ہیں جب ملک میں عظیم شاعر، افسانہ نگار اور کالم نگار تھے جن میں فیض احمد فیض، ن م راشد، آغا حشر اور سعادت حسین منٹو جیسے عظیم نام گزرے ہیں جو ملک کی شناخت تھے لیکن اب ایسا نہیں رہا۔اس صورت حال کو وہ ڈسٹوپیا قرار دیتے ہیں جس سے نکلنے کا حل یہ ہے کہ ملک کی معیشت اور ساکھ کو بہتر بنایا جائے۔ کالم نگار کے نزدیک ملک ذہنی بنجر پن اور قحط سالی کا شکار ہے۔

ان کے نزدیک ہر وہ ملک جو اپنے وسائل سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے، قرض کی لعنت سے پاک ہے جس کی برآمدات اور درآمدات میں توازن ہے، اسے مثالی ریاست کہا جاسکتا ہے۔ ایسی مثالی ریاست جو مضبوط اقتصادی بنیادوں پر کھڑی ہو۔ ملک اور بندرگاہوں سے روزانہ کروڑوں ڈالر کا سامان عالمی منڈیوں کی طرف اپنا سفر شروع کرتا ہے، جس کی معیشت ترقی کر رہی ہو اور جس کے زرعی فارم دنیا میں سب سے زیادہ پیداوار دیتے ہوں جہاں جمہوریت مضبوط ہو کیونکہ وہ جمہوریت کو بہترین طرزِ حکومت اور بہترین بدلہ قرار دیتے ہیں اسی لیے ان تمام ممالک کو وہ آئیڈیل قرار دیتے ہیں جہاں جمہوریت مضبوط ہو اور آمریت کو کسی قسم کی اہمیت

نہیں دی جاتی ہے۔ جمہوریت اسلامی طرزِ خلافت سے بھی قریب ترین نظر آتی ہے اس لیے مصنف کے خیال میں یہ بہترین طرزِ حکومت ہے۔ اس سلسلے میں کالم نگار ہمسایہ ملک بھارت کی مثال دیتے ہیں جس کی معیشت اور ترقی کی بنیادی وجہ جمہوریت کا استحکام ہے۔

> "بھارت نے اپنی فوج کو ہمیشہ سیاست دانوں کے پیچھے رکھا، اس نے کبھی فوجی سربراہوں کو آگے آکر کھیلنے کی اجازت نہیں دی۔ بھارت کے پہلے انڈین آرمی چیف نے وزیرِ اعظم جواہر لال نہرو کو ریٹائرمنٹ سے چھ ماہ پہلے ملازمت میں توسیع کی درخواست دے دی تھی، آرمی چیف کا کہنا تھا کہ وہ فوج کو نئی بنیادوں پر استوار کر رہے تھے اور انھیں اپنے کام کی تکمیل کے لیے تھوڑا سا مزید عرصہ چاہیے۔ نہرو کو اس درخواست میں بغاوت نظر آئی لہٰذا انھوں نے اسی وقت آرمی چیف کو بلوایا اور اس سے استعفیٰ لیا۔"(۹)

اگر جاوید چودھری کے یوٹوپیا کا مطالعہ بغور کیا جائے تو وہ تھامس مور کی طرح دوسرے ممالک یا پھر اپنے ملک میں ہونے والی ایسی مثالی سرگرمیوں کی مثالیں دیتے ہیں۔ ان اصولوں کو ان کی مثالی ریاست کے ستون یا بنیادیں کہا جا سکتا ہے ایسی بنیادیں اور اصول جن پر ایک آئیڈیل مثالی ریاست کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ ملک میں ہونے والی ایسی مثالی سرگرمیاں جن کی مدد سے ملک کے حالات کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ ایسی مثبت معاشی، معاشرتی یا مذہبی سرگرمیاں جن کی بنیاد پر ہم اپنے وطنِ عزیز کے حالات و واقعات کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ مصنف کے نزدیک یہ تمام وہ امدادی عوامل ہیں جو ملک کے حالات کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ اپنے ایک کالم میں وہ ایک ایسے رفاعی ادارے کا ذکر کرتے ہیں جس میں زکوٰۃ اور امدادِ باہمی کے اصولوں کو بنیاد بنا کر ایسے تعلیمی ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا ہے یتیم، بے سہارا اور بے آسرا بچوں کے لیے مفت رہائش اور تعلیم کا بندوبست کرتا ہے۔

> "یہ دنیا کا واحد سکول تھا جس میں حاضری کا کوئی رجسٹر نہیں تھا لیکن اس کے باوجود جس بچے نے ایک بار اس دہلیز پر قدم رکھ دیا وہ پھر اس پیر خانے کا ہو کر رہ گیا۔ میں ایک گھنٹہ وہاں بیٹھا رہا۔ معلوم ہوا، اب تک اس سکول کی سیکڑوں برانچیں کھل چکی ہیں۔ حضرت صاحب ہر کلاس میں سے دو تین بچوں کو سلیکٹ کرتے ہیں۔ انھیں دو، دو، تین تین گھنٹے پڑھاتے ہیں۔ جب وہ ان کے معیار کے مطابق "عالم" ہو جاتے ہیں تو وہ انھیں اپنے پاس بٹھاتے ہیں، ان

> کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور میٹھی آواز میں کہتے ہیں، "بیٹا جاؤ اور اپنے جیسے دوسرے بچوں کو یہ کچھ سکھاؤ۔"[۱۰]

دراصل وہ ایک ایسا فلاحی ادارے کا قیام عمل میں لانا چاہتے ہیں جس کا تصور اسلام میں بھی ملتا ہے۔ اسلام میں عوام کے نان نفقے، ان کی تعلیم اور ان کی کفالت کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ ایک ایسا تعلیمی ادارہ جس کی بنیاد مدینہ منورہ میں رکھی گی تھی اور جس کا بنیادی اصول دیے سے دیا جلانا ہے۔ اس تعلیمی ادارے میں انفاق فی سبیل اللہ اور قرضِ حسنہ کا تصور دیا گیا ہے۔

کالم نگار کے یوٹوپیا کا محور صرف مغربی یا سیکولر ممالک نہیں بلکہ دنیا کے کسی بھی کونے میں کوئی بھی بات یا کوئی عمل ان کو پسند آجاتا ہے تو وہ اسے اپنے ملک میں رائج کرنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ حکمرانوں کو اس بات کا مشورہ دیتے ہیں کہ اگر ہمارے ملک میں بھی ایسا نظام رائج ہو جائے تو ہمارے حالات بہتری کی جانب گامزن ہو سکتے ہیں۔ ملائشیا کے صدر محمد مہاتیر آج کی دنیا کے عظیم اور انقلابی لیڈروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے مطابق، وہ ایک جھونپڑی میں پیدا ہوا تھا لیکن جھونپڑی سے اُٹھ کر کوٹھی میں جانے کا خواب تھا، اس کی باتوں میں بھی عجیب کشش اور دل ربائی تھی اس لیے جلد ہی وہ چشم وزدن میں لوگوں میں مقبول ہو گیا۔ الیکشن جیتا اور پارلیمنٹ میں داخل ہو گیا۔ پھر پارٹی چھوڑ کر The Malay Dilemma کے نام سے شاندار کتاب لکھ ڈالی۔ وہ امیر بھی بن سکتا تھا لیکن اس وقت اس نے فیصلہ کیا کہ اپنی پوری قوم کا مقدر بدلوں۔ وہ خود تو جھونپڑی میں رہا لیکن پوری قوم کو محلات میں لا بٹھا دیا۔ مہاتیر محمد اور اس جیسے اعلیٰ کردار کے رہنما جاوید چوہدری کے آئیڈیل ہیں۔ ایسے آئیڈیل جو اپنے ملک کو بدل سکتے ہیں اس کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ایسے رہنما جو اپنے قومی مفادات کو ذاتی مفادات پر ترجیح دیتے ہیں، ان کے نام تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

> "ان اقدامات کے نتیجے میں ملائشیا کے دیہات میں تعلیم سو فی صد ہو گئی۔ اس نے سرکاری خرچ پر باصلاحیت نوجوانوں کو امریکا یورپ کی یونیورسٹیوں میں داخلے دلائے۔ اس کا کہنا تھا اگر آپ معاشی ترقی چاہتے ہیں تو پہلے مقامی لوگوں کے ذہن کو ترقی دیں۔ ملک میں سو فیصد روزگار ہوا، لوگوں کی آمدنی میں اضافہ ہو اور غربت مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ آج یہ صورت

حال ہے کہ وہ ملک جس میں کبھی ٹن اور ربڑ کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا، اس میں دنیا کی بلند ترین عمارت اور سیلیکان ویلی سے بڑی کمپیوٹر مارکیٹ، ملٹی میڈیا سپر اور کوریڈور ہے۔"(۱۱)

مہاتیر محمد جیسے بے مثال، بے لوث اور مخلص لیڈر ملنا ملائیشیا کی خوش قسمتی ہے۔ شاید ایک ہزار برس میں بھی ملائیشیا کو دوسرا مہاتیر محمد نصیب نہ ہو۔ اگر کسی مؤرخ نے کبھی مہاتیر اور پاکستانی حکمرانوں کا تقابلی جائزہ لیا تو اس کے ہاتھ صرف ایک نقطہ ہی آئے گا اور وہ ہے مہاتیر۔ مہاتیر نے اپنے خاندان کو امیر بنانے کی بجائے دوسرا راستہ منتخب کیا ہے۔ پوری قوم کے مقدر کو بدلنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے مقابلے میں اگر پاکستان کا جائزہ لیا تو پاکستان کے ہر حکمران نے صرف خود کو اور اپنے خاندان کو امیر بنایا ہے۔ جھونپڑی سے محلات میں منتقل ہوتا رہا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکمران دن بدن امیر تر اور ملک غریب تر ہوتا رہا ہے۔ مؤرخ صرف مہاتیر محمد جیسے لیڈر کو تاحیات زندہ اور یاد رکھے گا۔ یہ ہے جاوید چودھری کا آئیڈیلزم ہے جو اس کے یوٹوپیا کا بنیادی ستون ہے۔ اگر ہمارے ملک کو قائدِ اعظم اور مہاتیر محمد جیسے رہنما میسر آتے تو پاکستان بھی آج ایشین ٹائیگر بن جاتا۔ معراج خالد جو پاکستان کے صدر رہ چکے ہیں وہ بھی کالم نگار کے آئیڈیل ہیں۔ مصنف نے ان کی سوانح عمری لکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ میں نے زندگی میں کوئی کارہائے نمایاں سرانجام نہیں دیے۔ انھوں نے کہا کہ میرے جیسی ایمان دارنہ زندگی تو بھارت کے درجنوں لیڈر گزار رہے ہیں۔

مصنف تاریخ کی مثال دیتے ہیں کہ اگر اونٹ چرانے والے کا بیٹا عمر فاروق کہلا سکتا ہے، کسان کے بیٹے کو تاریخ ماؤزے تنگ کے نام سے یاد کر سکتی ہے، موچی کا بیٹا آئن سٹائن بن سکتا ہے اور معمولی کاشت کار کا بیٹا جارج واشنگٹن بن کر ابھر سکتا ہے تو ہم بھی اپنے عمل کی بدولت دنیا تبدیل کر سکتے ہیں۔ دنیا میں صدر اور وزیرِ اعظم زندہ نہیں رہتے بلکہ رفاعِ عامہ کے کام کرنے والے لوگوں کو دنیا یاد رکھتی ہے۔ آگے چل کر وہ ان عظیم رہنماؤں میں اشوک کا نام لیتا ہے۔ شاہراہِ ریشم پر سفر کرنے والوں کو آج بھی اشوک کے کتبے نظر آتے ہیں۔ ہزاروں سال کے بعد بھی اشوک کے کھدوائے کنویں اور سڑکیں موجود ہیں جو بآواز بلند یہ دعویٰ کرتے نظر آتے ہیں کہ حکمران سچے اور مخلص ہوں اور ان کے اہلِ زمین پر احسان کیے ہوں تو ان کی آنے والی نسلیں بھی اپنے محسنوں کو یاد رکھتی ہیں۔ اہلِ سندھ آج بھی محمد بن قاسم کو اپنا نجات دہندہ مانتے ہیں اور آج اس ملک کی چوتھی نسل بھی قائدِ اعظم محمد علی جناح کی تصویر کی طرف پشت نہیں کرتی۔ اشوک کے دورِ حکومت کی ایک دھندلی سی تصویر میں مصنف کو اپنے یوٹوپیا کی ایک مثالی ریاست کی جھلک نظر آتی ہے۔

"وہ دنیا کا پہلا بادشاہ تھا جس نے جانوروں کے ہسپتال کا تصور دیا جس نے عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دیے، جو یہ کہتا تھا بچوں کی پرورش حکومت کا فرض ہے، جو یہ سمجھتا تھا جو حکمران عوام کو روٹی، تعلیم اور دوا نہ دے سکے اسے حکومت کا کوئی حق نہیں ہے۔ رہا انصاف تو اس کی سلطنت کے آخری گاؤں میں بھی کسی کے ساتھ کوئی ظلم ہوتا تو سب کو معلوم ہو جاتا دنیا کی کوئی طاقت ظالم کو اشوک سے نہیں بچا سکتی۔ کلنگہ کی فتح تک وہ صرف شمالی ہندوستان کا بادشاہ تھا لیکن جوں جوں اس کی خدمت اور انصاف کی شہرت پھیلی ارد گرد کی ریاستیں بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئیں یہاں تک کہ وہ اشوک سے اشوک اعظم بن گیا۔"(۱۲)

کالم نگار کے مطابق ایک مثالی ریاست یا جنتِ ارضی کی تعمیر میں چار عوامل معاون ثابت ہو سکتے ہیں جن میں پہلے نمبر پر عوام کی فلاح و بہبود پر مبنی سماجی نظام ہے۔ کالم نگار نظام تعلیم کو کسی ملک کے لیے اہم قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق ہمارے ملک کے نظام تعلیم میں اگر بہتری لائی جائے تو یوٹوپیا نہ سہی ہم ایک بہتر زندگی کی امید ضرورر کر سکتے ہیں ان خیالات کا اظہار انہوں نے مقالہ نگار کو دیے گئے انٹرویو میں بھی کیا۔ کالم نگار کے یوٹوپیا کا تیسراا اہم عنصر آزاد عدلیہ ہے جس کا ذکر انھوں نے بارہا اپنے کالموں میں بھی کیا ہے۔ چوتھا رکن جدید ٹیکنالوجی ہے جو آج کے جدید دور کی اہم ضرورت ہے۔

اپنے ایک کالم میں وہ لکھتے ہیں کہ، یوں تو اشوک میں عظیم رہنما کی تمام تر خصوصیات موجود تھیں لیکن سب سے اہم اور نمایاں خصوصیت جس نے مصنف کو اپنا گرویدہ بنایا تھا، اس کی غیر مسلح جدوجہد تھی جس کی ابتدا بھی بہت دلچسپ تھی۔ جب وہ گھر سے نکلا تو اس کے ہمراہ دنیا کی سب سے بڑی اور انتہائی جدید فوج تھی لیکن کلنگہ کے میدان میں اس نے فوج کے خاتمہ کا اعلان کر دیا جس کے نتیجے میں سات لاکھ فوج بے روزگار ہو گئی لیکن اس حیرت انگیز قدم کے بعد وہ پے در پے ایسے مزید اقدامات کر کے دنیا کو حیران کرتا گیا۔ میدانِ جنگ سے واپس پلٹا تو اس نے ہندو مت ترک کیا اور بدھ مذہب اختیار کیا۔ حکومت کاری کے چند اصول وضع کیے۔ پورے ملک سے ایمان دار اور مہربان لوگوں کا انتخاب کیا جنھیں مختلف علاقوں کا والی بنایا۔ اس نے برہمن اور شودر کا تصور ختم کیا، امیر غریب کی تفریق مٹائی۔ اس کی حکومت کاری کے دو بڑے اصول تھے: خدمت اور انصاف۔ اسے سڑکوں کے کنارے درخت لگوائے، کنوئیں کھدوائے، مسافر خانے تعمیر کرائے، درس گاہیں اور منڈیاں بنوائیں۔ فوج کے بغیر حکومت کا تصور اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اشوکا نے آج سے ہزاروں برس قبل ایک دفاعی سلطنت کا تصور دیا جس میں سب سے اہم فوج کے بغیر مملکت اور

حکومت کا تصور ہے۔ اگر بادشاہ عوام کو انصاف، امن اور سکھ فراہم کرتا ہے تو اسے نہ اپنی اور نہ اپنی حکومت کی حفاظت کے لیے فوج کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ بات سچ ثابت ہوئی۔ اشوک کے دور میں کوئی بیرونی حملہ آور ہندوستان میں داخل ہوا اور نہ کسی اندرونی شورش نے سر اُٹھایا۔

کالم نگار کے نزدیک انسان کی سوچ اور طرزِ فکر ہی وہ بنیادی چیز ہے جو اس کے حالات کو بدل سکتی ہے۔ حالات خواہ کیسے ہی کٹھن ہوں، انسان کا جذبہ اس کو ان حالات سے نکلنے میں مدد دیتا ہے۔ قدرت نے سب انسانوں کو یکساں حالات دیے ہیں لیکن ان کا انفرادی نقطۂ نظر حالات کو بدل کر اور نہج پر لے جاتا ہے۔ برصغیر کے بادشاہ شاہجہاں اور سویڈن کے بادشاہ (Oedepus) اوڈیپس دونوں کو یکساں طرح کے کٹھن حالات کا سامنا تھا۔ دونوں کی بیویاں دورانِ زچگی بچی کی پیدائش کے بعد انتقال کر گئیں لیکن اوڈپس نے اس کے بعد ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جس نے اس مسئلے کا حل تلاش کیا۔ اس کے برعکس اس وقت شاہجہاں نے تاج محل بنا کر ملک و قوم کا پیسہ بے دریغ لٹایا۔ اگر شاہ جہاں نے تاج محل کی جگہ آکسفورڈ یونی ورسٹی بنائی ہوتی تو آج تیموری نسل تورابورا کی چٹانوں میں ضائع نہیں ہوتی۔

> "شہروں کے ہر محلے، قصبوں کی ہر کمیونٹی اور دیہات کے ہر طبقے سے دو دو چست اور ذہین لڑکیاں لی جائیں، انھیں دار الحکومت لایا جائے اور دائی کی ٹریننگ دی جائے، جب وہ اس کام میں ماہر ہو جائیں تو انھیں واپس بھیج دیا جائے۔ یہ لڑکیاں مزید دو دو لڑکیوں کو ٹریننگ دیں گی اور پھر اس کے بعد اگر کسی گاؤں، کسی محلے، کسی شہر کے دس دس کوس میں کوئی عورت زچگی کے دوران مری تو نہ دائیوں کی خیر ہے اور نہ لواحقین کی۔"[۱۳]

مسلمانوں کے پاس رصد گاہیں تھیں، درس گاہیں اور لائبریریاں تھیں۔ ان کے پاس عالم اور سائنس دان ہیں۔ مسلمان ٹیکنالوجی میں بہت آگے ہیں۔ یہ فوارے لگاتے ہیں۔ ریگستانوں میں گھر ٹھنڈے رکھتے ہیں۔ آگ جلائے بغیر خیمے گرم کرتے ہیں۔ انصاف ان کی سلطنت کا مرکزی ستون ہے۔ اہلِ یورپ نے سوچا کہ اگر ہم نے ان لوگوں کا مقابلہ کرنا ہے تو ہمارے پاس ان سے بہتر سماجی نظام ان سے بہتر علم اور ان سے بہتر نظامِ انصاف ہونا چاہیے۔ چناں چہ یورپ کے حکمرانوں نے انصاف، علم اور فلاح کو لوگوں تک پہنچایا، وہ حکم کو حکومت سمجھنے لگے۔

"قوموں کے عروج کی صرف چار وجوہات ہوتی ہیں: انسانی فلاح پر مبنی سماجی، بہترین نظامِ تعلیم، ٹیکنالوجی اور انصاف وہ جان گئے تھے۔ مسلمانوں کے پاس بہترین سماجی نظام ہے۔ وہاں گورا کالا اور عربی عجمی برابر ہے، وہاں حکومت بوڑھے، بچے، معذور، بیوہ، یتیم اور مسافر کی کفیل ہے وہاں خلیفہ اور غلام باری باری اونٹ پر سوار ہوتے اور نکیل پکڑتے ہیں۔ وہ جان گئے تھے کہ علم اسلام کی بنیاد ہے۔"(۱۴)

جیسا کہ گزشتہ کالم کے حوالے سے یہ بحث کی جا رہی ہے کہ کالم نگار کے نزدیک اس وقت ملک کو ہنر مند افراد کی اشد ضرورت ہے جو طب، معاشیات اور ٹیکنالوجی کے شعبہ میں اس کو آگے لے جا سکیں لیکن چونکہ CSS کی نوکری پر کشش ہوتی ہے اس لیے بیش تر قابل نوجوان اس کا امتحان پاس کر کے اس نوکری میں آ جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں کالم نگار نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ پیشہ ورانہ لوگوں کی حوصلہ شکنی کی جائے اور انھیں متعلقہ شعبے میں فرائض سرانجام دینے چاہئیں۔ اس طرح ملک کا سرمایہ ضائع ہونے سے بچ گا۔

تھامس مور(Thomas Moor)اورEugene-o-Neilکی طرح جاوید چودھری یوٹوپیا کے لیے مختلف تجاویز بھی پیش کرتے ہیں جن کی مدد سے ملک کو ترقی دی جا سکتی ہے۔ مثلاً اپنے ایک کالم میں کالم نگار نے سی ایس ایس کے امتحانات لینے والوں کے لیے کچھ تجاویز پیش کی ہیں۔ ان کے مطابق سی ایس ایس کے امتحانات میں کچھ بنیادی تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے۔ انھوں نےCBRکے اس فیصلے کو سراہا ہے کہ آئندہ سی ایس ایس میں کامیابی حاصل کرنے والے کسی ڈاکٹر، کسی انجینئر کو کسٹم، سیلز ٹیکس اور انکم ٹیکس گروپ میں تعینات نہیں کیا جائے گا۔ ان محکموں میں صرف ان نوجوانوں کو نوکری دی جائے گی جنھوں متعلقہ علوم میں ڈگریاں حاصل کی ہوں گی جو کہ خوش آئند فیصلہ ہے۔ اس کی مدد سے ملک کا وہ قیمتی سرمایہ ضائع ہونے سے بچ جائے گا جو وہ ڈاکٹروں، انجینئروں پر سالانہ خرچ کرتے ہیں اور اس کے بعد یہ لوگ اپنے متعلقہ پیشے میں جا کر ملک و قوم کو اپنی خدمات پیش کرنے کی بجائے سی اسی ایس کر کے انتظامی امور چلاتے ہیں۔ یاFBRجیسے محکموں میں چلے جاتے ہیں جب کہ ان کو ٹیکس کی ابتدائی سدھ بدھ تک نہیں ہوتی اور اپنے جونیئر افسروں کے پابند ہو جاتے ہیں۔ یوں ان کو اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لیے ماتحتوں کی جائز و ناجائز خواہشوں کا غلام بننا پڑتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہمیں ڈاکٹر، انجینئر، لیکچرار کو اسسٹنٹ کمشنر سے زیادہ عزت دینا ہو گی ورنہ ہمارا ہنر ضائع ہوتا رہے گا اور ہم اسی طرح گلے سڑے جوہڑوں کا حصہ بنتے رہیں گے۔

اپنے کالم "میراث" میں کالم نگار قارئین کو مسلم امہ کے عظیم ماضی کی یاد دلاتے ہوئے کہتے ہیں:

> "میں تاریخ سے مسلمانوں کے عروج کی وجہ پوچھا کرتا تھا۔ مجھے پیٹراک Petrarck سے فردوسی تک یہی بتایا کرتے تھے جب تک مدرسے سائنس دان، طبیب اور فلسفی پیدا کرتے رہے، ہم غالب رہے۔ میں پھر پوچھتا تھا، عالم اسلام اب پستی اور کمزوری کا کیوں شکار ہے؟ جواب آتا تھا، مدرسوں نے انجینئر، طبیب اور سائنس دان پیدا کرنے بند کر دیے ہیں۔ میں سوچا کرتا تھا جس دن ہمارے مدرسوں نے مولوی کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر عبدالقدیر پیدا کرنے شروع کر دیے، ہم دوبارہ غالب آ جائیں گے۔"[۱۵]

مندرجہ بالا کالم میں کالم نگار نے اسلامی مدرسوں کی صورتِ حال پیش کی ہے جنھوں نے بورڈ کے امتحانات میں پوزیشن ہولڈر طلبا پیش کیے ہیں۔ کالم نگار اسلامی مدرسوں کے اچھے نتائج سے پُر امید نظر آتے ہیں۔ وہ اس بات کی امید کرتے ہیں کہ ایسے لوگ آگے رہے ہیں جو دینی تعلیم کے ساتھ دنیاوی تعلیم سے بھی بہرہ ور ہوں گے۔ وہ ملک کے انتظام و انصرام کو اسلام کی اصل روح کے مطابق چلا سکیں گے۔ اس کالم میں اسلاموٹوپیا کی جھلک نظر آتی ہے۔

جہاں ہمیں ان کے کالموں میں یوٹوپیا اور اسلاموٹوپیا کے عناصر نظر آتے ہیں وہیں پر موجودہ بدترین حالات پر مایوسی اور اظہارِ افسوس بھی نظر آتا ہے جس کو ڈسٹوپیا کہا جاتا ہے۔ موجودہ حالات سے مایوس مصنف ماضی کے یا تو شان دار حالات کی تصویر سامنے لاتے ہیں جسے ناسٹلجیا کہا جا سکتا ہے، یا پھر مسلمانوں کے شان دار ماضی کو یاد کرتے ہوئے وہ افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ، موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ ۵۶ اسلامی ممالک میں کل ۳۸۰ یونی ورسٹیاں ہیں جن میں سے ایک بھی ایسی نہیں جس کو ہائیڈل برگ، آکسفورڈ، کیمبرج یا برکلے کے معیار تو دور کی بات ہے اس کے پر تو یا اس کے نقش قدم پر چلتا ہوا بھی نہیں کہہ سکتے۔ اس کے برعکس صرف جاپان میں ایک ہزار یونی ورسٹیاں ہیں۔ ان کے کالموں میں جا بجا ماضی پرستی بھی نظر آتی ہے۔ وہ آج کی یون یورسٹیوں، کیمبرج اور ہائیڈرل برگ کا مقابلہ عراق کی پرانی تہذیب سے کرتے ہیں۔ ان کے مطابق، اس دور میں عراق دنیا کے لیے ہاورڈ تھا۔ دنیا کے بہترین تیر، انتہائی چمک دار تلواریں اور دور تک پھینکے جانے والے بھالے یہاں بنتے تھے۔ دنیا نے لشکر سازی کا فن عراقیوں سے سیکھا۔ عراقی سپاہیوں نے تین براعظموں کو ملٹری اکیڈمیاں دیں۔ انھیں بیدار مغز انسانوں نے تاریخ میں پہلی بار تلوار پر زہر لگایا۔

لیکن پھر علم عراق سے لندن منتقل ہو گیا اور یوں مومن سے اس کی میراث چھن گئی جس کے ماتم کناں علامہ اقبال بھی رہے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ ہمارے مذہب اسلام نے معلمی کو پیغمبرانہ پیشہ قرار دیا ہے لیکن ہمارے ملک میں استاد کی کوئی عزت نہیں ہے۔ معاشی اور معاشرتی دونوں صورتوں میں اس کو وہ احترام نہیں ملتا جس کا وہ حق دار ہے۔ کالم نگار کا خیال ہے کہ اگر اساتذہ کو معاشی آسودگی حاصل ہو گی تو وہ اپنے فرائض تندہی اور جانفشانی سے ادا کریں گے کیونکہ استاد ہی قوموں کو سنوار بھی سکتا ہے اور بگاڑ بھی سکتا ہے۔ اس کی مثال ہماری اپنی تاریخ میں ہے۔ ۱۹۷۱ء سے پہلے بنگلہ دیش میں اکثریت ہندو اساتذہ کی تھی۔ ان اساتذہ نے نئی نسل میں وطن دشمن جذبات پروان چڑھائے جس کے نتیجہ میں بالآخر بنگال، بنگلہ دیش بن گیا۔

"A Teacher can make or break a nation."

ہماری وہی اسلامی روایات جن کے باعث ہم نے ترقی کی آج وہ اہلِ مغرب نے اپنالی ہیں۔ وہ استاد کی عزت کرتے ہیں۔ آج اگر تمام سائنس دانوں اور پروفیسروں کو دو لاکھ روپے ماہانہ تن خواہ دینے کا اعلان کیا جائے۔ ایسے قوانین بنائے جائیں جن کے تحت معاشرے میں پروفیسروں اور سائنس دانوں کو مراعات دی جائیں۔ اگر حکومتِ وقت یہ اعلان کر دے کہ آج کے بعد کسی پروفیسر اور پی ایچ ڈی ڈاکٹر کا چالان نہیں ہو گا اور اس کو ٹیکس کی چھوٹ دی جائے گی تو حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔

یوٹوپیا یا آئیڈیل سلطنت کے تصور میں کالم نگار مختلف ترقی یافتہ ممالک کی مثالیں دیتے ہیں۔ برطانیہ کے ماہرِ تعلیم نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ یہ قانون قدرت ہے کہ ہنر ہمیشہ بڑے شہروں سے دور پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا صرف وہ ملک ترقی کرتے ہیں جن کے دور دراز علاقوں، دیہات اور پسماندہ آبادیوں میں اچھے سکول اور کالج ہوں۔ یورپ اور امریکا میں اچھی اچھی یونی ورسٹیاں شہر سے دور گاؤں میں نظر آتی ہیں۔ ڈینش والدین بہتر تربیت اور معیاری تعلیم کے لیے بچوں کو دیہاتی سکولوں میں بھیجتے ہیں۔ وہ پینڈو بچہ جو ذہانت میں کسی طرح بھی آئن سٹائن، برٹرینڈرسل، برناڈ شا، ایلسک، سیلے اور نیلسن منڈیلا سے کم نہیں ہے۔ ۱۹۵۲ء میں جب مصری انقلاب آیا تو سادات اور جمال عبد الناصر نے شاہ فارق کی ساری جائیداد بیچ کر رقم تعلیم پر لگا دی تھی۔ اگر پاکستان میں یہ قانون بنا دیا جائے کہ آج کے بعد قومی احتساب بیورو کی تمام وصولیاں تعلیم پر

خرچ کی جائیں گی۔ اس رقم سے پاکستان کے دور دراز علاقوں، دیہاتوں اور گاؤں میں جدید ترین تعلیمی ادارے بنائے جائیں گے۔ ننگے پاؤں پھرتے آئن سٹائینوں اور گدھے اور بیل چراتے نیلسن منڈیلیوں کو ترقی کے دھارے میں شامل کیا جائے گا تو بہتری ہو سکتی ہے۔ اگر کسی سے بدلہ لینا ہے تو تعلیم کی مدد سے طاقت ور بن کر لیا جائے۔

"آج کے دور میں ترقی کے اعشاریے معاشی اور صنعتی ترقی پر منحصر ہیں اس لیے ہمارے ملک کو ٹینکوں کی بجائے کارخانوں کی ضرورت ہے جس کی عظیم مثال جاپان اور چین ہیں۔ توپوں کی جگہ لیبارٹریاں بنانا ہوں گی۔ یہ سلسلہ سنا کوب تک چلتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۲ء میں جب امریکی فوج او کی نیوا سے نکلی تو جاپانی سوچ تبدل ہو چکی تھی۔ کاصی کازی کا شکار جاپان صنعت و حرفت اور سائنس و ٹیکنالوجی کے دور میں داخل ہو چکا تھا۔ آج وہی جاپان دنیا کی دوسری بڑی اکانومی ہے۔ اس کے پاس دنیا میں سب سے زیادہ مالیاتی ذخائر ہیں اور اس کا لوہا دنیا کے تمام بازاروں میں سونے کے بھاؤ بکتا ہے۔"(۱۶)

اس جائزے سے یہ بات واضح ہے کہ کالم نگار کے کالموں کا بنیادی عنصر جو ان کے یوٹوپیا کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے، وہ تعلیم ہے۔ ان کے مطابق، تعلیم اور استاد کی عزت سے ہم اپنے ملک میں معجزانہ تبدیلیاں لا سکتے ہیں۔ دنیا میں جس ملک نے بھی ترقی کی ہے تعلیم کے بل بوتے پر کی ہے۔ آج کا دور، علم کا دور ہے، جنگوں کا نہیں۔ معاشی اور معاشرتی لحاظ سے ترقی یافتہ یوٹوپیا کالم نگار کے لیے ایک مثالی ریاست ہے۔ اس مثالی ریاست کے لیے وہ کبھی ماضی، کبھی حال کے خوش حال اور متمدن ممالک کی مثال دیتے ہیں اور یوں Earnest-Block کے یوٹوپیا کی مثال کی عملی تصویر پیش کرتے ہیں کہ جب ماضی کی آرزو میں مستقبل کو ایک نامکمل وعدے کے طور پر دریافت کیا جاتا ہے۔

کالم نگار ملک کے موجودہ حالات سے مایوس اور غیر مطمئن نظر آتے ہیں۔ اس لیے وہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگر ہم اس ملک کو جدید، ترقی یافتہ اور پُر امن نہیں بنا سکتے ہیں تو ہم اسے واپس ۱۹۴۸ء تک تو لے جا سکتے ہیں۔ ہم اسے ۵۶ برس پرانا پاکستان تو بنا سکتے ہیں۔ کالم نگار اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم دوبارہ ماضی دور میں واپس چلے جائیں۔ کاش ہم قائداعظم کے اس پاکستان میں واپس جا سکتے جب ملک کا پیسہ بے دریغ نہیں لٹایا جاتا تھا۔ جب ہمارا ملک سپر طاقتوں کی برابری کرنے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی

جرات کر سکتا تھا کیونکہ ہم کسی سے قرض نہیں لیتے تھے۔ قائد اعظم اپنے اکاؤنٹ سے خریدے گئے پیسے یہ کہہ کر واپس کر دیا کرتے تھے کہ ایک غریب ملک کا گورنر جنرل اتنی عیاشی کا متحمل نہیں ہو سکتا ہے۔ جو وزارتِ خزانہ سے معافی مانگنا اپنی توہین نہیں سمجھتا تھا اور اپنی حفاظت کے لیے بھی ملک کا پیسہ بے جا استعمال نہیں کرتے تھے۔

ان سطروں میں مصنف کا آئیڈیلزم واضح نظر آتا ہے لیکن وہ مایوسی کا شکار ہرگز نہیں ہیں کیونکہ صبحِ امید زیادہ دور نہیں ہے۔ بس تھوڑا انتظار ابھی باقی ہے۔ ان کے کالموں میں رجائیت پسندی (Optimism) کا عنصر نظر آتا ہے۔ بدقسمتی یہ نہیں ہوتی کہ کسی ملک، کسی قوم کے حالات بدتر ہو گئے ہیں بلکہ بدقسمتی یہ ہوتی ہے کہ اس قوم اور اس ملک میں مایوسی پھیلانے والے بڑھ گئے ہیں۔ اگر ہم اس مایوسی کا شکار رہیں گے تو کبھی اس صورتِ حال سے نہیں نکل سکیں گے اور اپنے مسائل کا حل نہیں نکال سکیں گے۔

رجائیت پسندی کے ضمن میں کالم نگار ماں کے رشتے کی مثال دیتے ہیں جس کے بچے معذور اور کمزور بھی ہوں تو وہ ان کی صحت یابی کے لیے کبھی مایوس نہیں ہوتی ہے۔ اس امید کو زندگی میں آگے بڑھاتے ہوئے کالم نگار ملک کے تعلیمی نظام میں بنیادی تبدیلیاں لانے کے لیے کچھ تجاویز بھی سامنے لاتے ہیں۔ اپنے کالم "پاگلوں سے بچائیں" میں وہ ان الفاظ میں ملک میں تبدیلی لانے کے خواہاں ہیں۔

> "ہمیں تعلیم پر جنگی پیمانے پر کام کرنا چاہیے کیونکہ ہمارے پاس علی معین نوازش جیسے لاکھوں بلکہ کروڑوں بچے ہیں۔ ہم اگر انھیں اچھی تعلیم، اچھے مواقع اور پھلنے پھولنے کا ماحول دے دیں تو یہ بچے پوری دنیا کو حیران کر سکتے ہیں؟ مجھے اعلیٰ تعلیم کے لیے اچھے ادارے اور مواقع مل گئے تھے۔ چنانچہ میں نے اپنے ملک کو سرخرو کر دیا۔ علی معین کو بھی اچھا تعلیمی ادارہ ملا، یہ اولیول اور اے لیول کے امتحان میں بیٹھ گیا اور اس نے خاندانی اور ذاتی کوششوں سے اپنے لیے نئے مواقع پیدا کر لیے۔ چناں چہ یہ بکرا منڈی سے کیمبرج پہنچ گیا۔ ہم اگر پاکستان کے دوسرے بچوں کو بھی اچھے تعلیمی مواقع فراہم کریں تو پاکستان کا ہر بچہ عبدالقدیر اور علی معین نوازش بن سکتا ہے۔"(۱۷)

اس کالم میں وہ آگے چل کر ڈاکٹر عبدالقدیر کی مثال دیتے ہیں جن کو قدرت نے اعلیٰ تعلیم کے لیے اچھے ادارے دیے اور اس تعلیم کی طاقت کی بنا پر انھوں نے ملک کو ایٹمی طاقت بنا کر سرخرو کیا۔ کالم نگار کے

نزدیک ملک کے بیش تر مسائل کی اہم وجہ بڑھتی ہوئی بدعنوانی اور رشوت ستانی ہے۔ اس بدعنوانی کے باعث اہل لوگوں کو آگے آنے کا موقع نہیں دیا جاتا اور نااہل لوگوں کے ہاتھوں میں عہدہ اور اختیار سونپ دیا گیا ہے جس کے باعث بروقت صحیح فیصلے نہیں ہو رہے ہیں۔ اس تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ رجائیت پسندی کا رویہ کالم نگار کو یوٹوپیا کی طرف لے جاتا ہے۔

جاوید چودھری کے مطابق تعلیم ہی قوموں کو بدل سکتی ہے۔ قوموں کا عروج تعلیم کے فروغ اور اس کو ترجیح دینے سے شروع ہوتا ہے۔ تعلیم کی وزارت کو ان لوگوں کے سپرد کرنا ہوگا جو صحیح معنوں میں علم کی قدر کرتے ہیں اور جو علم کی بدولت اپنی تقدیر کو بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تعلیم کو سیاست سے الگ کرنا ہوگا کیونکہ ملک میں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں اور اتار چڑھاؤ کے اثرات تعلیمی نظام پر براہِ راست مرتب ہوتے ہیں۔ فوج کے محکمے کی طرح نظامِ تعلیم میں بھی اصلاحات لانا ہوں گی۔ اساتذہ کو ترقی کے بہترین مواقع مہیا ہونے چاہئیں۔ جس طرح ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ فوج میں بھرتی ہو کر چیف کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوتا ہے اسی طرح ایک استاد بھی ترقی کر کے وزیرِ تعلیم کے عہدے تک پہنچ سکتا ہے۔ پارلیمنٹ میں دو تہائی اکثریت کے بغیر تعلیم کے نظام میں ایک نقطہ کی تبدیلی ممکن نہ ہوگی۔ اسی صورت میں ہم اقوامِ عالم کے سامنے آنکھیں اٹھا کر کھڑے ہو سکیں گے۔ ان حالات کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ حکومت میں ہر نظام، ہر عہدہ اور ہر حساس شعبہ نااہل لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اسی وجہ سے پاکستان کی ترقی کا عمل برف میں دبے انڈے کی طرح منجمند ہو کر رہ گیا ہے۔ اگر اختیار اہل لوگوں کے ہاتھوں میں آجائے تو وہ ملک کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔ جس طرح ۱۹۷۴ء میں ڈاکٹر یونس نے چٹاگانگ میں گرامین بنک کی بنیاد رکھی تھی جس نے اپنے اثاثے سے فقط ۲۷ ڈالر لوگوں کو قرضے میں دیے۔ یہ لوگ موڑھے بناتے تھے۔ اس نے یہ قرض مزدور عورتوں کو دیا کیوں کہ خواتین قرض کی لین دین کے معاملے میں مردوں سے زیادہ حساس اور عقل مند ہوتی ہیں۔ اس کی واضح مثال کمیٹی سسٹم ہے۔ بہ ہر حال اس نے قرض پر کاروبار شروع کیا اور پھر ان لوگوں کو اس قدر فائدہ حاصل ہوا کہ انھوں نے نہ صرف اپنے قرضے ادا کر دیے بلکہ معاشی طور پر بھی خوش حال ہو گئے۔ گرامین بینک غریب گھرانوں کو بلا سود قرض دیتا ہے اور قرض دار انھیں چھوٹی قسطوں میں واپس کرتے ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں اس بینک نے حکومت کی توجہ بھی حاصل کر لی تھی۔

"بنگلہ دیش کے علاوہ دنیا کے ۴۵ ممالک میں گرامین کی طرز پر بینک کاری شروع ہو چکی ہے۔ اگر ہمارے ملک میں بھی ان بنیادوں پر قرض شروع کیے جائیں تو غربت اور بے روزگاری کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ ملک کی معیشت کو سنبھالا دینے کا موقع بھی ملے گا۔ اسی ڈاکٹر یونس کو بعد ازاں نوبل پرائز سے بھی نوازا گیا کیونکہ اس نے نہ صرف اپنے ملک بلکہ دوسرے ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک کو بھی ترقی کی راہ سنبھالی تھی"۔[۱۸]

دوسری مثال میں وہ انڈونشیا کے صدر مہاتیر محمد کی دیتے ہیں جو ان کی آئیڈیل شخصیت بھی ہیں۔ کالم نگار کے نزدیک مہاتیر کے پر خلوص جذبے اور کوششوں کے باعث انڈونیشیا نے ترقی کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر ایسا رہنما ہمیں بھی میسر آجاتا تو حالات میں بہتری ہو سکتی تھی اور ہم ملک کو اگر یوٹوپیا میں تبدیل نہیں کر سکتے تو ایک بہتر زندگی کا امکان یقیناً ہو سکتا ہے۔ ایک دفعہ وزیر اعظم نواز شریف نے مہاتیر کے ساتھ ملاقات میں انڈونیشیا کی ترقی کے رازوں کے بارے میں استفسار کیا تو اس کا جواب مہاتیر محمد نے ان الفاظ میں دیا۔

" آپ نے یہ ترقی تفاخر کیسے حاصل کیا؟" مہاتیر محمد اپنے مخصوص انداز سے مسکرائے، "ہماری ترقی کے بے شمار اصول ہیں لیکن ان میں تین کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ہم نے تاریخ کے مطالعے سے اندازہ لگایا کہ دنیا میں تعلیم کے بغیر ترقی ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا ہم نے اپنے کل بجٹ کا ۲۵ فی صد تعلیم پر خرچ کرنا شروع کیا۔" وہ ذرا سے مڑے اور مسکرا کر بولے۔ "ہم لوگ دفاع پر اپنے بجٹ کا صرف چھ سے آٹھ فی صد خرچ کرتے ہیں۔"[۱۹]

کالم نگار کے مطابق، اگر ہم ان کی پالیسیون کا اپنی پالیسیوں سے موازنہ کریں تو ملک کی تنزلی کی پہلی وجہ سامنے آجاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انھوں نے قومی ترقی کے لیے مذہب کا سہارا لیا۔ تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کی فرقہ پرستی اور نسلی اختلافات ان کی ترقی میں انفرادی طور پر اور عالمِ اسلام کے لیے اجتماعی طور پر ایک بڑی رکاوٹ ہیں۔ اس لیے ملائشیا میں فرقہ پرستی پر پابندی لگائی گئی ہے۔ مسجد کو مثبت رجحانات کی ترویج کے لیے استعمال کیا گیا۔ مساجد میں علمائے کرام معاشرتی بہبود اور اجتماعی کوشش کی تلقین کرتے ہیں۔ مہاتیر محمد نے ملک کی ترقی کو ایک جملے میں بیان کیا جو ان کا اور مصنف کا ون لائنز فلسفہ ہے۔

"وہ جمہوریت جو تعلیم کے بغیر ہو، ملک کو نقصان پہنچاتی ہے کیونکہ صرف تعلیم یافتہ لوگ ہی اچھے لیڈر منتخب کرسکتے ہیں۔"(۲۰)

کالم نگار بھی مہاتیر سے متفق نظر آتے ہیں۔ مقالہ نگار کو دیے گئے انٹرویو میں بھی انھوں نے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ تعلیم کے میدان میں عملی اصلاحات لائی جائیں تو ہم حالات کو بہتر بناسکتے ہیں۔ ان کے خیال میں تعلیم کی مدد سے ہم یوٹوپیا کی معراج اگر حاصل نہیں بھی کرسکتے کیونکہ یوٹوپیا کی تشکیل تو کسی دور میں بھی ممکن نہیں تھی لیکن کم از کم بہتر صورت حال ہو سکتی ہے اور آج ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں، ان میں بہتر صورت حال بھی یوٹوپیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بہتری کی طرف ایک قدم ہو گا۔

ملک میں تعلیمی اصلاحات کالم نگار کا ایک اور یوٹوپیا ہے۔ اس کے علاوہ ہمسایہ ممالک میں زرعی میدان میں ترقی کے لیے اٹھائے جانے والے اقدامات کو بھی وہ تقلیدی اور مثالی قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستان ایک زرعی ملک ہے لیکن اس کے باوجود ہم ہر سال غذائی قلت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر بھارت کے اپنائے گئے اقدامات کی تقلید کی جائے تو غذائی اور زرعی بحران پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ بھارت اب نہ صرف اپنی ضروریات کو بخوبی پورا کرتا ہے بلکہ دوسرے ممالک کو غلہ بھی فراہم کرتا ہے۔ بھارت کے پنجاب میں زراعت کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

"بھارت نے پنجاب میں زرعی آلات بنانے والی فیکٹریوں کی حوصلہ افزائی کی۔ ٹریکٹر، ڈرل مشینوں اور کٹائی کی مشینری کے کارخانے لگائے۔ زرعی استعمال کے لیے مفت بجلی دی۔ پنجاب بھر میں ٹیوب ویلوں کا جال بچھایا، زرعی ماہرین کو دروازے دروازے پہنچایا اور بیج اور کھاد سستی کردی۔ مارکیٹنگ کے سلسلے میں بھی بڑا دلچسپ تجربہ کیا۔"(۲۱)

اس کے علاوہ بھارت میں کسانوں کے حقوق کا ہر ممکن خیال رکھا جاتا ہے۔ بیج اور گندم کی قیمت حکومت کے مقرر کردہ نرخوں پر ہوتی ہے۔ پاکستان ایک زرعی ملک ہے اس لیے ایک زرعی صوبے کی حکومت کو شہروں کی بجائے دیہات میں نظر آنا چاہیے۔ اس کو نالوں پر، کھیتوں پر اور کھلیانوں میں موجود ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں بھارتی پنجاب میں زراعت کو بہتر بنانے کے لیے جو اقدامات کیے گئے ہیں، پاکستانی حکومت کو بھی ان کو راہِ عمل بنانا چاہیئے۔

اسلاموٹوپیاجاوید چودھری کے کئی کالموں کا اہم عنصر ہے۔ وہ جب پاکستان کے تباہ کن حالات کو بیان کرتے ہیں تو اس کا حل نکالنے کے لیے کبھی مغربی ممالک کی مثال دیتے ہیں تو کبھی اسلام کے شان دار ماضی کو یاد کرتے ہیں اور اسلام کے زریں اصولوں کو موجودہ حالات کا حل بتاتے ہیں۔

> "اسلام دنیا کا پہلا مذہب تھا جس نے عدالت کا روایتی نظام توڑا، جس نے کہا کہ عدالت کے لیے عمارت کی ضرورت نہیں، جج کے پاس کاغذات، قلم اور دوات کا ہونا بھی ضروری نہیں۔ جج کے لیے اوقاتِ کار بھی ضروری نہیں، مصنف کے لیے کسی لمبے چوڑے پیکیج کی بھی ضرورت نہیں، بس مدعی آئے، ملزم بلایا جائے، دونوں کے بیان اور گواہیاں ہوں اور اللہ کے قانون کے مطابق فیصلہ دے دیا جائے۔"(۲۲)

آگے چل کر کالم نگار مزید اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر ہم اپنے نظامِ عدل کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے معیار تک نہیں لے جاسکتے تو کم از کم آج کے دور کی مثالوں کی پیروی تو ممکن ہے۔ ایسے ممالک جن میں آج کے دور میں بھی انصاف کی حکمرانی نظر آتی ہے، قابلِ تقلید ہیں۔ جن ممالک کے سربراہانِ مملکت اپنے خلاف مقدموں کو سنتے ہیں، عدالت کے سامنے پیش ہوتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ اپنے خلاف پیش کیے گئے فیصلوں کو سنتے اور پھر سزائیں بھگتتے ہیں، قابلِ تقلید ہیں لیکن ہمارے ملک میں حکمران طبقے کو انصاف سے بالاتر قرار دیا جاتا ہے۔ انھیں ججوں، عدالتوں اور مقدموں سے بھی استثنیٰ دے دیا جاتا ہے اور باقی تمام تر لوہاروں، ترکھانوں کو کچہریوں میں بلا کر ننگی زمین پر بٹھا دیا جاتا ہے۔ انصاف دراصل ایک سوچ اور فیصلے کی آزادی کا نام ہوتا ہے۔ جس ملک میں یہ آزادی، یہ سوچ موجود ہو وہاں عمارتوں، کمپیوٹروں اور وکیلوں کے بغیر بھی انصاف قائم ہو جاتا ہے لیکن جہاں یہ سوچ اور آزادی نہ ہو، وہاں اگر ججوں کی تعداد میں پانچ سو گنا اضافہ بھی دیا جائے تو سارے ملک کی عمارتوں میں عدالتیں قائم کر دیں اور تمام منصفوں کو کمپیوٹر کی فیکٹریاں لگا دیں تب بھی اس معاشرے میں انصاف قائم نہیں ہو گا کیونکہ انصاف دکان یا فیکٹری سے نہیں مل سکتا۔ لیکن یہ کسی ملک کی بقا امن اور ترقی کی ضمانت ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ "کسی کافر کی حکومت تو قائم رہ سکتی ہے لیکن ظالم کی حکومت قائم نہیں رہ سکتی۔"[1] اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ معاشرے میں صحت منداقدار کے فروغ کے لیے انصاف کی فراہمی کس قدر ناگزیر ہے۔ اس سلسلے میں وہ مغربی ممالک کی

۱۔ نہج البلاغہ، ص: ۶۳۰

مثال دیتے ہیں جہاں انصاف کی حکمرانی ہے۔ یوٹوپیا کے ساتھ دوسرا موضوع جو مصنف کی تحریروں خاص طور پر کالموں میں زیادہ نظر آتا ہے وہ Nostalgia یا ماضی پرستی ہے۔ وہ اسلاف اور اس کے کارناموں سے محبت کرتے ہیں۔ اسلام کے زریں دور کی یاد اور اس کو دوبارہ سے دیکھنے کی تمنا بھی کالموں میں بکثرت نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ پرانی تہذیبوں کا ذکر کرتے ہوئے عراق کا نام لیتے ہیں۔ عراق کے معنی ہیں: اصل یا بنیاد۔ دنیا کے کسی خطے، تہذیب اور معاشرے کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں اس کا تعلق عراق کی تہذیب سے ملتا ہے۔ اسی ملک میں اربیلا نام کا شہر ہے جسے دنیا کے قدیم ترین شہر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اسی سرزمین پر حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی۔ اسی زمین کو حضرت نوح علیہ السلام نے اپنا مسکن بنایا اور اسی زمین پر حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ سے رہائی حاصل ہوئی۔ یہ سرزمین حضرت ادریس علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا مسکن بھی تھا۔ اسی مقدس سرزمین پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت ہوئی، یہیں پر بابل و نینوا کی قدیم ترین تہذیبوں نے جنم لیا۔

"جس تہذیب میں دنیا کی پہلی جمہوری حکومت تشکیل پائی، جس میں جنگی رتھ ایجاد ہوئے، جس میں تجارت نے باقاعدہ پیشے کی شکل اختیار کی، دنیا کی پہلی منڈی بنی، کرنسی ایجاد ہوئی اور دنیا میں پہلی بار اشیاء صرف کی قیمتیں حکومت نے مقرر کرنا شروع کیں۔ جس میں مزدوروں کی سرکاری اجرت طے ہوئی، جس میں پہلی بار شہری حقوق اور قوانین کا مجموعہ تیار ہو، جس میں دن چوبیس گھنٹوں، گھنٹے ساٹھ منٹ اور منٹ ساٹھ سیکنڈ میں تقسیم ہوئے۔"(۲۳)

مذکورہ اقتباس میں عراق کی قدیم تہذیب کا ذکر کیا گیا ہے۔ عراق کے شہر کلدانیہ میں دنیا کی پہلی لائبریری قائم ہوئی جہاں تمام علوم پر مبنی کتب میسر تھیں۔ اسی شہر میں بابل کے معلق باغات جیسے دنیا کے سات عجوبے قائم ہوئے۔ چاہِ بابل کے قصے عبرت کدے ہیں۔ اسی شہر کے ریتلے راستوں میں ایک راستہ باغِ بکلان کی طرف نکلتا ہے۔ یہ عراق ہے دنیا کا سب سے بڑا عجائب گھر، یہ شہر دنیا کی قدیم ترین تہذیب کا امین ہے۔ اس کے چپے چپے میں آثار قدیمہ ہیں۔ دنیا کی تمام تہذیبوں کے آثار اور تمام معاشروں کے نقوش عراق کی تہذیب نے اپنے وجود میں سموئے ہیں۔ مؤرخین نے دنیا کی تہذیبوں کو دو دھاروں میں تقسیم کیا ہے لیکن اس گتھی کو آج تک دنیا کے مؤرخین حل نہیں کر پائے ہیں کہ تہذیب کا بہاؤ عراق سے بیت المقدس کی طرف تھا۔ یا دھارا القدس سے عراق کی طرف تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر آپ عراق کو دنیا کی تاریخ سے خارج کریں گے تو زمین کا سارا توازن اور سارا حسب نسب بگڑ جائے گا مگر آج اسی عراق پر بم

گرائے جارہے ہیں، اس کو خاک و خون میں نہلایا جارہا ہے۔ عراق جو انسانی تاریخ کا مرکز تھا، اس عراق کو آج تباہ کیا جارہا ہے۔ یہاں مصنف آج اور کل کا تقابل کرتے ہیں۔ وہ عراق جو کبھی تہذیب و تمدن، علم و دانش کا گڑھ ہوا کرتا تھا، آج تباہ و برباد ہو گیا ہے۔ حکمرانوں کی عاقبت نااندیشی نے اس عراق میں قیامتِ صغریٰ برپا کر دی ہے۔ اس کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ کالم نگار اس زوال پر نوحہ کناں ہیں اور امتِ مسلمہ کے لیے اسی روشن ماضی کے لیے دعا گو ہیں جس پر کبھی اہلِ عرب رشک کیا کرتے تھے۔

تھامس مور نے یوٹوپیا کی جو تصویر اپنی کتاب "یوٹوپیا" میں کھینچی ہے اس میں تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ امن کا وجود بھی لازمی عنصر ہے۔ وہ امن جو سعودی عرب کے شہر مکہ میں نظر آتا ہے جہاں کسی کو اپنے جان و مال کا کوئی خوف نہیں ہوتا کیونکہ اس جگہ کے امن و امان کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے اس ملک کی ترقی و خوش حالی کے لیے دعا فرمائی تھی۔ انصاف اور برابری کا سلوک سب سے کیا جائے۔ جب تک وہاں یکساں مواقع اور یکساں سہولتیں نہ ہوں، مالک اور ملازم کے حقوق نہ ہوں، گورے اور کالے، ادنیٰ اور اعلیٰ کے لیے مساوی قانون نہ ہو۔ دراصل خوش حالی اور امن و سکون دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ یہاں کالم نگار نے سعودی عرب کی مثال پر امن فضا اور انصاف کا دور دورہ ہونے کی وجہ سے دی ہے کیونکہ ناانصافی کسی بھی ملک میں بدامنی اور بے چینی کی فضا کو فروغ دیتی ہے۔

> "ہم ترقی اور خوش حالی کے لیے دنیا بھر کے ماڈل کاپی کر رہے ہیں لیکن ہم نے آج تک قرآن مجید کی سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۲۶ نہیں پڑھی جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے مکہ کے شہریوں کے لیے رزق سے پہلے امن و امان کی دعا کی تھی۔ ہم کتنے بے وقوف ہیں۔ ہم قرآن مجید کو چھوڑ کر اس صدر بش کے پیچھے پھر رہے ہیں جس کی اپنی ترقی امن و امان کی مرہونِ منت ہے۔"[۲۴]

اس کالم میں کالم نگار کا اسلاموٹوپیا کی جانب جھکاؤ واضح ہے۔ امن و امان کے قیام کے بعد یوٹوپیا کی دوسری اہم ضرورت محبت، اخلاص اور ہم دردی کا جذبہ ہے۔ اگر کسی ملک کے لوگوں میں اپنے ہم وطنوں کے لیے یہ جذبہ موجود ہے تو پھر اس ملک کو ترقی کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ اگر امیر غریبوں کے دکھ درد کا احساس کریں اور زکوٰۃ و خیرات کو غریبوں کا حق سمجھیں تو ان کو اپنی اولادیں اور عزتیں نیلام نہ کرنا پڑیں۔ ہمارا ملک بہت پسماندہ ہے، وسائل محدود ہیں لیکن یہ بے وسیلا لوگ اگر منظم ہو جائیں، فوڈ بنک جیسے ادارے

بنالیں جس کی مدد سے دس دس روپے میں روٹی اور سالن ان غریب اور مستحق لوگوں کے گھروں تک پہنچادیں ،اس طرح ان لوگوں کی عزتِ نفس بھی مجروح نہیں ہوگی اور اپنے گھر میں بیٹھ کر سحری اور افطاری کا لطف اٹھائیں گے ۔ اللہ کے دیے رزق سے تھوڑا حصہ ان لوگوں تک پہنچا سکیں جو زندگی کی سخت چکی میں پس رہے ہیں اور اللہ کی مدد کا انتظار کر رہے ہیں۔ انھی جذبات کا اظہار مصنف اپنے اگلے کالموں میں بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اس بات پر بھی کفِ افسوس ملتے ہیں کہ دنیا کے ۵۶ اسلامی ممالک میں ایک بھی رفاعِ عامہ کی تنظیم نہیں ہے۔ گول میز جیسی تنظیم مغربی ممالک میں تو نظر آتی ہے۔ ہمارا مذہب جس نے فلاحی ریاست کا تصور دیا تھا لیکن اسلامی ممالک میں آج ایک بھی عالمی سطح کا رفاعِ عامہ کا ادارہ نہیں ہے۔ صرف پاکستان میں ایدھی فاؤنڈیشن ہے جو دنیا کا سب سے بڑا پرائیویٹ ویلفیئر ادارہ ہے۔

کالم نگار کے نزدیک تعلیم سے قوموں کی تقدیر بدل جاتی ہے۔ تیسری دنیا میں فتح جنگوں سے نہیں بلکہ تعلیم اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ترقی سے حاصل کی جاسکتی ہے۔اس سلسلے میں وہ جاپان کی مثال دیتے ہیں جس نے دوسری جنگِ عظیم کی تباہی کے بعد تعلیم کے بل بوتے پر تعمیر نو کی۔ کالم نگار کے نزدیک اگر حکومت ان تجاویز پر عمل کرے تو بہتری آسکتی ہے۔

آگے چل کر وہ ایک جگہ چین کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ۱۹۷۶ء میں جب چین میں شدید زلزلہ آیا تو یہ ہنستا کھیلتا شہر چشمِ زدن میں تباہ و برباد ہو گیا۔ زلزلے کی شدت 7.8 تھی لیکن اتنی آفت کے باوجود چین کے بادشاہ ماؤزے تنگ نے امداد قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ماہرین نے مشورہ دیا کہ زلزلے کے باعث اس جگہ کی زمین کمزور ہو چکی ہے اس لیے اس جگہ نیا شہر تعمیر کرنا بے وقوفی ہوگی۔ اس اعلان کے بعد ماؤزے تنگ انتقال کر گئے لیکن اس کے بیٹوں نے ملبے کے ڈھیر پر کھڑے ہو کر باپ کے عہد کی تجدید کی اور یوں اس ملبے کے ڈھیر پر شہر تعمیر کیا گیا۔ ایسا ایک شہر جس کا شمار چین کے بڑے شہروں میں ہوتا ہے۔ تانگ کیوشان کی تعمیر نو بیسویں صدی کا معجزہ ہے اور چینی قوم نے یہ معجزہ کر دکھایا۔ یہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔ ریلیف کے کاموں سے تعمیرِ نو کا منصوبہ شروع ہوا۔ پہلے مرحلے میں نعشوں کو دفنایا اور زخمیوں کو نکالا گیا۔ دوسرا مرحلہ بحالی کا تھا جس کے لیے چینی حکومت نے شان دار منصوبے کا آغاز کیا۔ جس کے تحت متاثرہ خاندانوں کی خواتین، بچوں، بوڑھوں اور زخمیوں کو پورے ملک میں پھیلا دیا گیا۔

حکومت ایک خاندان کو ٹرین کا ٹکٹ پکڑاتی اور اس کو محفوظ شہروں میں روانہ کر دیا جاتا۔ وہاں لوگ اپنے ان مہاجرین کو پناہ اور نان نفقہ دیتے۔ تیسرا مرحلہ شہر کی تعمیرِ نو کا تھا جس میں تانگ شان شہر کے زندہ بچ جانے والے لوگوں کی مدد لی جاتی کیوں کہ ان لوگوں کو اپنے شہر سے انسیت تھی جس کی بنا پر یہ لوگ زیادہ بہتر اور محبت سے کام کرتے۔ اس واقعے نے مہاجرین اور انصار کے ایثار کی یاد دلائی۔ کالم نگار کا نقطہء نظر یہ ہے کہ آج غیر مسلم ہمارے مذہب کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر اپنی زندگیاں سنوار رہے ہیں، مسائل سے نجات پا رہے ہیں لیکن بد قسمتی سے مسلمان اپنے مذہب کی تعلیمات کو بھلا بیٹھے ہیں۔

اسی طرح دوسری جنگِ عظیم کے بعد جاپان کے ملک نے تعلیم کا سہارا لیا۔ یہودیوں نے نازیوں سے شکست کے بعد اپنا دن رات صرف اور صرف تعلیم حاصل کرنے پر لگا دیا کیوں کہ تعلیم ہی وہ ہتھیار ہے جس کی بدولت وہ دنیا پر ایک بار پھر حاکم بن کر اپنے اوپر کی گئی زیادتیوں کا بدلہ لے سکتے ہیں۔

> "ہم جاپان بن سکتے ہیں اگر ہماری حکومت اپنا ایجنڈا مختصر کر کے صرف تعلیم اور تعلیمی اداروں کو اپنا فوکس بنا لے۔ ملک میں جدید ترین اداروں کا جال پھیلا دے، ٹیکنالوجی کی پچاس ساٹھ نئی یونی ورسٹیاں بنائے، شہروں، قصبوں اور دیہات سے چن چن کر ٹیلنٹ جمع کرے اور انھیں مفت تعلیم دے، بھاری معاوضے پر باہر سے پاکستانی ماہرین منگوائے، انھیں تعلیمی اداروں میں نوکریاں دے اور ایک ایسی نئی پود پیدا کرے جو علم، ہنر اور صلاحیت میں کسی سے کم نہ ہو۔"(۲۵)

قانون کی حکمرانی میں مغربی ممالک مصنف کا آئیڈیل ہیں۔ اپنے ایک کالم میں انھوں نے ۳۵۸ برس قبل لندن کی مثال دی ہے۔ جب ایک شخص، سر ایڈوڈ کوک جو ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا اور ٹرینٹی کالج کا تعلیم یافتہ تھا اور ٹرینٹی کالج کو اس پر فخر تھا۔ اس نے وانس بیکن کو شکست دی اور اٹارنی جنرل بنا۔ بعد ازاں اسکو چیف جسٹس بنا دیا گیا۔ ممزاوں ایک طالع آزما حکمران تھا بیکن سر ایڈوڈ کوک نے بادشاہ کی بجائے عام شہری کا جج بننے کا فیصلہ کیا۔ اس نے لوگوں کے اندر شعور بیدار کیا کہ وہ اپنے حقوق کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

کالم نگار نے پاکستان کے حکمرانوں پر طنز کیا ہے۔ انگریز ذہنی بلوغت میں ہم سے کس قدر آگے ہیں اس کا اندازہ اس ایک واقعے سے لگایا جا سکتا ہے جس کا ذکر کالم نگار نے کیا ہے۔ اس کے مطابق ہمارے حکمران

اکیسویں صدی میں بھی قانون کو معطل کرنے کی روش پر قائم ہیں جبکہ انگریز نے یہی کام تین صدیوں قبل کیا تھا۔ اگر آج برطانیہ قابلِ تقلید ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں اب جمہوریت ہے، قانون کی حکمرانی ہے جس کا ذکر انھوں نے مقالہ نگار کو دیے گئے انٹرویو میں بھی کیا۔ ان کے مطابق مختلف نظامِ حکومت بتدریج ترقی (Evolve) کرتے آئے ہیں اور یہ سفر بادشاہت سے جمہوریت تک تھا۔ بالآخر یہ دیکھا گیا کہ عام آدمی کو حکومت کرنے کا موقع ملنا چاہیے تو فیصلہ جمہوریت کے حق میں ہوا۔ تیسری دنیا کے نوے فی صد ممالک میں جمہوریت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی شکلیں تبدیل ہوئی ہیں۔ کہیں صدارتی نظام ہے تو کہیں پارلیمنٹ۔ کالم نگار کے نزدیک ترقی کی اس ترتیب کو بدل دیا گیا تو ہمیں فائدہ نہیں ہوگا۔

"آج اس واقعے کو ۳۵۸ برس گزر چکے ہیں لیکن لوگ آج بھی سر ایڈورڈ کوک کو یاد کرتے ہیں اور اس کے ساتھ اس کا یہ قول دہراتے ہیں۔ یہ معاشرے اس وقت تک مہذب نہیں ہو سکتے جب تک ان میں قانون کی بجائے بادشاہ، حکمران رہتے ہیں۔"(۲۶)

ہم انگریزوں سے ذہنی ابلاغ کے لحاظ سے کس قدر پیچھے ہیں۔ اس کا اندازہ ۳۵۸ برس کے بعد سے لگایا جاسکتا ہے۔ آج سے ۳۵۸ برس پہلے کے برطانوی بادشاہ جمز اوّل اور آج کے پرویز مشرف کی سوچ میں کس قدر اشتراک پایا جاتا ہے۔ اس نے ۳۵۱ برس قبل سر ایڈورڈ کوک کو معطل کیا تھا اور ہمارے بادشاہ نے ۲۰۰۷ء میں چودھری افتخار کو کیمپ آفس بلا کر غیر فعال کر دیا۔

یہاں مصنف ہماری قوم کی ذہنی انحطاط کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے مطابق برابری، مساوات اور انسانی حقوق کی دستیابی ہی یہ وہ بنیادیں ہیں جو کسی بھی ملک کو جنتِ ارضی بنا سکتے ہیں، کسی ملک کو ترقی کی راہ پر گام زن کر سکتی ہیں اور سپر پاور بنا سکتی ہیں۔ امریکا کے صدر رونالڈ ریگن سے کسی نے پوچھا کہ امریکا کو کس نے سپر پاور بنایا ہے تو اس نے جواب دیا کہ امریکا کو اس کے قانون اور انصاف نے سپر پاور بنایا اور جب تک امریکا میں قانون اور انصاف کا احترام باقی رہے گا، امریکا دنیا کی سپر پاور رہے گا۔ جب کسی معاشرے میں قانون، سیاست داں، حکمران اور مافیا لارڈر کے دروازے پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا ہے اور انصاف حکمرانوں کے گھر کی لونڈی بن جاتی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس معاشرے کو برباد ہونے، اسے کھنڈر بننے سے نہیں بچا سکتی۔ اس کے ساتھ ساتھ حکمرانوں کے مزاج میں عاجزی بھی کسی ملک کی ترقی کی ضمانت ہوتی ہے۔ امریکا اس وقت دنیا کا سپر پاور ہے لیکن اس کے نائب صدر ڈک چینی جس کو بعض معاملات میں صدر سے بھی زیادہ اختیارات حاصل ہوتے

ہیں۔ وہ افغانستان کے ہوائی اڈے بگرام پر نہ صرف اپنا سامان خود اٹھا کر سوار ہوتا ہے بلکہ وہ اپنا بیگ، اپنی فائل اور اپنی کتاب خود اٹھا کر جہاز سے اترتا ہے۔ وہ اپنا ذاتی سامان اٹھانے کے لیے اپنے سٹاف کے کسی شخص کی مدد بھی نہیں لے سکتا اور ہمارے ملک کے حکمران اپنا بیگ تو کیا اپنی عینک تک خود نہیں اٹھا سکتے تو وہ ملک کی ذمہ داری کیونکر اٹھا سکیں گے۔

اسی طرح اپنے ایک کالم "دیوارِ چین' میں انھوں نے چین کا جو نقشہ کھینچا ہے، وہ کالم نگار کے یوٹوپیا کا عکس ہے، ایک آئیڈیل سٹیٹ، جنت ارضی۔

> "یہ لوگ مٹی کو سونے میں ڈھالنے کے فن سے واقف تھے۔ جب دنیا تن ڈھانپنے کے لیے پتوں کی محتاج تھی، اس وقت چین کے کاری گر ریشم بناتے اور پہنتے تھے۔ ان لوگوں نے گرم مسالوں کو تجارت کی شکل دی تھی۔ یہ لوگ بلا کے ستارہ شناس تھے۔ جس وقت دنیا ننگے پاؤں پھرتی تھی اس وقت یہ لوگ لوہے کے جوتے پہنتے تھے اور اپنے کھیتوں میں ایک کاشت سے دو، دو فصلیں حاصل کرتے تھے۔ کہا جاتا تھا اگر ایک چینی گھر سے پتھر لے کر نکلے تو وہ شام کو سونے کی ڈلی لے کر واپس لوٹے گا۔"[۲۷]

چینی قول ہے کہ اگر تم ایک سال کی منصوبہ بندی کرنا چاہتے ہو تو ملٹی بورڈ، اگر اور دس سال کی منصوبہ بندی کرنا چاہتے ہو تو درخت لگاؤ لیکن اگر تم صدیوں کے لیے منصوبہ بندی کرنا چاہتے ہو پھر لوگوں کی اخلاقی تربیت کرو، انھیں تعلیم دو۔

کالم نگار کے یوٹوپیا کے بنیادی عناصر میں اسلاموٹوپیا، ناسٹلجیا، آئیڈیلزم اور جمہوریت شامل ہیں۔ یہ عناصر انھیں جس جگہ نظر آتے ہیں، وہ انھیں بطور نمونہ اپنے قارئین کے لیے پیش کرتے ہیں۔ وہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ اگر اس نمونے پر عمل کیا جائے تو ہمارے ملک کے حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔ مقصد کسی مثالی ریاست کی بنیاد بنانا نہیں بلکہ لوگوں کو ایک بہتر اور پرسکون زندگی کا تصور دینا ہے۔

اس سیاق میں کالم نگار کہتے ہیں کہ اگر مغرب کی مثالیں ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہیں تو ہم اپنے اسلاف کے نمونے پر بھی عمل کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں نے دنیا کو بہترین طرزِ حکومت دیا۔ اگر اس پر عمل کیا جائے تو مطلوبہ نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ کالم نگار جمہوریت کو مسائل کا حل قرار دیتے ہیں اور اس کے مقابلے میں فوجی آمریت کو یہ کہہ کر رد کرتے ہیں کہ ایک آمر کو فقط مر جاؤ یا مار دو کی تربیت دی جاتی ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ ،مارچ ۲۰۰۷ء میں برطانیہ میں غلامی پر پابندی کے دو سو سال پورے ہو گئے تھے لہٰذا لوگوں نے اس دن کو منانے کے لیے خصوصی اہتمام کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے ہل سے لندن تک ۴۰۰ کلو میٹر مارچ کرنے کا اعلان کیا۔ اس مارچ کے ذریعے ہل کے لوگوں نے ان تمام سیاہ فالوں کی روحوں اور نسلوں سے معافی مانگ لی جنھیں برطانوی تاجروں نے امریکہ میں بیچ دیا تھا۔ اس تصویر کو دیکھ کر کالم نگار یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہے کہ کیا دنیا کے تمام اچھے کام یورپی لوگوں کے نصیب میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ ہمارے اپنے اسلاف، ہمارا اپنا مذہب اور ہماری اپنی خلافت میں اس سے کہیں زیادہ روشن مثالیں موجود ہیں لیکن افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ہم اپنے اسلاف کی اعلیٰ روایات کو بھی فراموش کر چکے ہیں اور نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم کے مصداق دونوں طرف سے بے فیض ہو چکے ہیں۔ زندگی کا سلیقہ ، سکون اور اطمینان سب رسول ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں پوشیدہ ہیں۔ پھر خلفائے راشدین جن کا ایک مخصوص طرزِ زندگی تھا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ فکر و غنا کا دوسرا نام تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکمل اور مضبوط معیشت کی علامت تھے[1]۔ عرب میں مقولہ ہے کہ اگر کسی نے تجارت سیکھنی ہو تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے سیکھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہترین منتظم تھے۔ قوت ارادی اور اٹل پن کی علامت، حضورِ اکرم ﷺ کا ارشاد تھا کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہو گا تو عمر ہو گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس دور کے سب سے بڑے عالم تھے۔ شہرِ علم کے دروازے چاروں حضرات نے ثابت کر دکھایا کہ اسلام جیسے آفاقی نظریے کو بھی عملی تفسیر کے لیے ایک فقیر، ایک منتظم، ایک معیشت دان اور ایک عالم کی ضرورت ہے۔

کالم نگار مغرب کی پروردہ جمہوریت کے ساتھ ساتھ ان کی علم پروری کو بھی پسند کرتے ہیں۔ وہ اہلِ پاکستان کو اس روش کی تقلید کرنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ ان کے مطابق، علم کا حصول وقت کی اہم ضرورت ہے۔ علم اور ٹیکنالوجی کے بغیر آج کے دور میں ترقی ممکن نہیں ہے۔ وہ اہلِ وطن میں مطالعہ کے ذوق اور شوق کو پروان چڑھانے کی خواہش کا اظہار اپنے اس کالم میں کرتے ہیں۔ اپنے ایک کالم ("ہوٹل اور مسجد") میں کالم نگار نے اپنی مثالی ریاست کی تشکیل کے لیے چند تجاویز پیش کی ہیں جس میں مغرب کے ماڈل پر سکول کی تعلیم کو دس کے بجائے بارہ سال تک بڑھانا اور جامعات کو آزادانہ طور پر اپنے سلیبس کو تشکیل دینے کی تجاویز بھی

1 https://urdu.arynews.tv

شامل ہیں۔ کالم نگار کے نزدیک تعلیم کے ساتھ ساتھ متعلقہ شعبے میں تجربہ کا حصول بھی ضروری ہے جس کے لیے جامعات میں انٹرن شپ پروگرام کا اجرا ضروری ہے۔

اپنے کالم " تین وجوہات " میں نواز شریف، سنگاپور وزیر اعظم سے سوال پوچھا کہ کیا پاکستان بھی سنگاپور کی طرح ترقی کر سکتا ہے جس کے جواب میں اس نے کہا کہ پاکستان پر فوجی آمر ہیں اور فوجی ہمیشہ مسئلہ پیدا کرتا ہے جب کہ سیاست دان مسئلے حل کرتے ہیں۔ فوجی کو زندگی میں مر جاؤ یا مار دو کی تربیت دی جاتی ہے جب کہ سیاست دان کو صلح، مذاکرات اور نرمی کی تربیت دی جاتی ہے۔ وطنِ عزیز میں پھیلی غربت اور بے روزگاری کا حل بھی وہ مغرب سے تلاش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ، ہمارے نوجوان کالجوں اور یونی ورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہو کر بے روزگاری کا عذاب جھیلتے ہیں اور پھر یہی بے چین اور پریشان حال نوجوان انتہاپسندوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس یورپ میں تعلیم اور روزگار کے درمیان ایک توازن ہوتا ہے۔ اتنی ہی تعداد میں نوجوان گریجویٹ مارکیٹ میں بھیجے جاتے ہیں جتنی ضرورت ہوتی ہے۔بے روزگاری ختم کرنے کے لیے سکول کی تعلیم کو کالج تک پھیلا گیا دیا اور بارہ سال تک سکول کی تعلیم دی گئی۔ جس کے بعد گریجویشن شروع کی گئی اور کالج کو یونی ورسٹی میں ضم کر دیا گیا۔ پاکستان میں بھی حال ہی میں B.A کے بجائے BS کی تعلیم اسی کی کڑی نظر آتی ہے۔ یونی ورسٹیوں کو مرضی سے سلیبس بنانے کی آزادی دی گئی جس کا فائدہ یہ ہوا کہ یونی ورسٹیاں ضرورت کے مطابق نصاب ترتیب دینے لگیں۔ تحقیق اور انٹرن شپ کے نام پر طلبہ تعلیم کے دوران مختلف کمپنیوں اور اداروں کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ انٹرن شپ ان کا تجربہ سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے کوئی طالب علم یونی ورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد فارغ نہیں رہتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ پھر مغربی ممالک کا حوالہ دیتے ہیں:

> "اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ اخبارات امریکا اور اسرائیل میں شائع ہوتے ہیں اور یہ تمام رسائل اور اخبارات خریدے اور پڑھے جاتے ہیں۔ امریکا اور یورپ کے تمام سکولوں میں لائبریری کا پیریڈ ہوتا ہے۔ اس پیریڈ میں ہر طالب علم لائبریری جاتا ہے اور اپنی پسند کی کتاب پڑھتا ہے۔ امریکا میں طالب علموں کے لیے لائبریری سے کتاب ایشو کرانا ضروری ہے۔ اگر کوئی طالب علم کتاب نہ ایشو کرائے تو اس کے نمبر کٹ جاتے ہیں۔"(۲۸)

جب کہ ہمارے سکولوں اور کالجوں میں سے اکثریت میں اول تو لائبریری کا پیریڈ ہوتا ہی نہیں ہے اور اگر ہو تو لائبریری کی سہولت ہی میسر نہیں ہوتی ہے۔

اسی طرح اپنے کالم "تلوار اور مسجد" میں کالم نگار جہاد کے موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں جو ان کے مطابق اسلامو ٹوپیا میں فہرست کے آخر میں آتا ہے۔ ان کے مطابق، ریاستِ مدینہ کی بنیاد رکھتے ہوئے سب سے پہلے دعوتِ اسلام کا مرحلہ تھا۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے کفار کے ظلم کو برداشت کیا اور جب برداشت کی حد ختم ہو گئی تو ہجرت کا حکم ہوا۔ کالم نگار کا مقصد اسلام کو ایک پر امن مذہب کے طور پر دنیا کے سامنے لانا ہے۔ اس کے ساتھ اہلِ مغرب کے اس لیبل کا دفاع کرنا بھی مقصود ہے جس کے ذریعے وہ مسلمانوں کو بنیاد پرست اور جنونی ثابت کرتے ہیں۔

> "آپ ذرا اس ترتیب کو ملاحظہ کیجیے۔ اس ترتیب میں جہاد آخر میں ہوتا ہے جب کہ دعوت، استقامت، تبلیغ، ہجرت، امن پر بنی چھوٹی سی اسلامی ریاست مضبوط دفاع کے ساتھ پوری دنیا کو حیران کر دیا جب کہ اس کے مقابلے میں آپ دنیا کے ان تمام فاتحین کو لے لیجیے جنھوں نے اپنے فلسفے کی بنیاد تلوار سے رکھی تھی۔ ان لوگوں نے بہت جلد آدھی دنیا فتح کر لی لیکن پھر چند برس بعد ان کا نام، ان کی سلطنت اور ان کا فلسفہ دنیا سے کسی سیاہی کی طرح مٹ گیا۔"(۲۹)

اسی طرح کالم بہ عنوان "تلوار سے پہلے" میں بھی مصنف کا اسلامو ٹوپیا واضح نظر آرہا ہے۔ یوں تو وہ مغرب کے سیکولر ممالک کی جمہوریت سے بھی متاثر نظر آتے ہیں لیکن گاہے بگاہے خلافتِ راشدہ اور ریاستِ مدینہ کی مثالیں بھی اپنے کالموں میں دیتے نظر آتے ہے یں۔ اس کالم میں وہ پہلے دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ سوال اٹھاتے ہیں کہ روم کے جولیس سیزر، مقدونیہ کا سکندر اعظم جس کا کبھی بڑا چرچا تھا، اب کہاں ہیں؟ جن کی شہرت کے ڈنکے چار دانگ عالم بجا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں کالم نگار نے ایران کے بادشاہ دارا شکوہ اور ہندوستان کے بادشاہ اشوک کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان حکمرانوں نے ریاست کو قائم کرنے کے لیے جنگ اور ظلم کا سہارا لیا تھا، اس لیے ایک وسیع سلطنت کے حصول کے باوجود اس پر اپنا تسلط دیر تک نہ رکھ سکے۔ اس کی وجہ مصنف کے نزدیک ان کا غلط اندازِ حکمرانی تھا۔ اگر وہ اوپر دی گئی ترتیب کی پیروی کرتے تو ایک فلاحی ریاست کا قیام عمل میں آتا اور ان کا عروج دیرپا ہوتا۔ اگر آج ہم اس ترتیب کے مطابق چلیں تو

ایک اسلامی فلاحی ریاست قائم کر سکتے ہیں جو دنیا کے لیے ایک نمونہ اور مثال بن سکتی ہے۔ طالبان کی ریاست کی ناکامی کی وجہ بھی کالم نگار نے یہی بتائی ہے۔ طالبان نے اس ترتیب کی خلاف ورزی کی۔ انھوں نے جنگ و جدل اور عوام پر زبردستی کر کے ایک اسلامی مملکت قائم تو کر لی لیکن اس کو لوگوں کی حمایت نہیں حاصل تھی، اس لیے تادیر قائم نہ رہ سکی۔ جس ریاست کو عوام کی حمایت حاصل نہ ہو، اس کے وجود کو خطرہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوریت کالم نگار کا پسندیدہ طرزِ حکومت ہے جسے عوام کی قبولیت حاصل ہوتی ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ، اگر ہم آج بھی ان اصولوں پر عمل کریں گے تو کلنٹن، بش اور اوبامہ ہمارے پاس تمام امانتیں رکھوائیں گے اور تمام اسلامی ملک ترقی کریں گے۔ اس کے بعد ہم دنیا کو دعوت دیں گے تو کوئی ہماری بات کو سنے گا بھی، ہم کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائیں گے۔ بے سر و سامانی کے عالم میں اپنا دفاع کر لیں گے۔ غلبے کے بعد عام معافی دیں۔ ایک چھوٹی ریاست قائم کریں جس میں امن کے ساتھ علم بھی ہو اور رزق بھی ہو۔ اس کے بعد دنیا کے ہر فرعون سے ٹکرا جائیں گے۔ کالم نگار کے مطابق آج مسلمانوں کے زوال کی اصل وجہ ہی دراصل یہ ہے کہ وہ اس ترتیب کو بھول چکے ہیں۔ اس ترتیب کو بھول کر مسلمان آج جنگ و جدل کر رہے ہیں جس کی واضح مثال آج کے طالبان نے پیش کر دی ہے۔ انھوں نے دنیا کے سامنے اسلام کی غلط اور قابلِ نفرت صورت پیش کی اور اس کے بعد ان کی منزل عظیم سلطنت کا حصول ہے جو ان کا یوٹوپیا ہے۔ مصنف کے نزدیک ہر شخص کا اپنا یوٹوپیا ہوتا ہے جو اس کا آئیڈیل اور نقطہ ء نظر ہوتا ہے اور جو اس کے خیالات اور زندگی کے متعلق اس کے نقطہ ء نظر کے عین مطابق ہوتا ہے اور وہ اپنے یوٹوپیا کو ان اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تشکیل دیتا ہے۔ مصنف بھی اپنے فلسفہ زندگی کے مطابق یوٹوپیا کی تصویر کھینچتا ہے جو اسلام کے اصولوں پر مبنی ہو گا۔ جس میں امن کے ساتھ علم بھی ہو اور رزق بھی ہو، ہم خود کفیل ہوں گے تو اس کے بعد دنیا کی ہر طاقت اور ہر فرعون سے ٹکرا جائیں گے۔ یہ مصنف کا اسلاموٹوپیا یعنی اسلام کا تصورِ ریاست ہے۔ اسلام کے اصولوں پر قائم ایک ایسی ریاست جو فتح مکہ اور ریاستِ مدینہ کی یاد دلاتی ہو اور فتح مکہ کی بنیاد علم کی حکمرانی تھی۔ عمل اور علم جب مل کر ساتھ چلتے ہیں تو ترقی کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔ آج اگر آپ دنیا پر نظر دوڑائیں تو ان ممالک نے ترقی کی ہے جہاں علم اور دولت ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ہر وہ ملک جس نے دولت یا علم کو بنیاد بنا کر آگے بڑھنے کی کوشش تو کی، وہ ترقی کی دوڑ میں بازی لے گیا ہے۔ چناں چہ دولت اور نام کو اچھا

سمجھو کیونکہ یہ قوموں اور انسانوں کو عزت دیتی ہے۔ صرف اس کے استعمال کو جائز اور درست رکھنا ضروری ہے۔

اپنے ایک اور کالم "اصل سکندرِ اعظم" میں کالم نگار نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور سکندرِ اعظم کا موازنہ کرنے کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سکندرِ اعظم سے بہتر حکمران ثابت ہوئے تھے۔ اگر ان کے حالاتِ زندگی کا موازنہ کیا جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو نہ تو سکندرِ اعظم کی طرح بادشاہت ورثے میں ملی تھی اور نہ ارسطو جیسا استاد ملا جو اس کی اخلاق سازی کرتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو میدانِ جنگ کی کرامات سکھانے والا نہ کوئی اتالیق تھا اور نہ کوئی اکیڈمی تھی۔ جب کہ اس کے برعکس سکندرِ اعظم کے پاس ایک منظم فوج تھی جس کی مدد سے اس نے سترہ برس میں ۱۷ لاکھ مربع میل کا علاقہ فتح کیا تھا۔ اس کے برعکس حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کسی منظم فوج کے بغیر دس برسوں میں ۲۲ لاکھ مربع میل کا علاقہ فتح کیا جس میں روم اور ایران کی عظیم ریاستیں بھی شامل ہیں۔ سکندرِ اعظم نے فتوحات کے دوران اپنے بے شمار جرنیل قتل کروائے، اس کے خلاف بغاوتیں ہوئی اور ہندوستان داخل ہونے سے قبل اس کی فوج نے داخل ہونے سے انکار کر دیا لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے کسی بھی ساتھی کو ان کے حکم سے سرتابی کی جرات نہ ہوئی کیونکہ اسلام کی تعلیمات میں دورانِ جنگ امیر کا حکم ماننا سب سے ضروری ہوتا ہے۔ آپ نے عین میدانِ جنگ میں حضرت خالد بن ولید کو معزول کر دیا اور کسی کو یہ حکم ٹالنے کی اجازت نہیں ہوئی۔

> "الیگزینڈر نے ۱۷ لاکھ مربع میل کا علاقہ فتح کیا لیکن دنیا کو کوئی سسٹم نہ دے سکا جب کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دنیا کو ایسا سسٹم دیا جو آج تک پوری دنیا پر رائج ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے نمازِ فجر میں (الصلوٰۃ خیر من النوم) کا اضافہ کیا، آپ کے عہد میں نماز تراویح کا باقاعدہ سلسلہ شروع کیا گیا، آپ نے شراب نوشی کی سزائیں مقرر کیں، سن ہجری کا اجرا کیا، جیل کا تصور دیا، مؤذنوں کی تن خواہیں مقرر کیں، مسجدوں میں روشنی کا بندوبست کیا، پولیس کا محکمہ بنایا، ایک مکمل عدالتی نظام کی بنیاد رکھی، فوجی چھاؤنیاں بنوائیں اور فوج کا باقاعدہ محکمہ قائم کیا، آپ رضی اللہ عنہ نے پہلی بار دودھ پیتے بچوں، معذوروں، بیواؤں اور بے آسراؤں کے وظائف مقرر کیے۔"(۳۰)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ دنیا میں پہلی رفاعی اور فلاحی ریاست کا قیام عمل میں لائے۔ اس کے ساتھ ساتھ حکمرانوں کے صادق اور امین ہونے کی شرط بھی سب سے پہلے انھوں نے رکھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے جو حکمران عدل کرتے ہیں، وہ راتوں کو بے خوف سوتے ہیں۔ قوم کا سردار قوم کا سچا خادم ہوتا ہے۔ آپ کے دستر خوان پر کبھی دو سالن نہیں رکھے گئے۔

مجموعی طور پر جاوید چودھری کے کالموں میں یوٹوپیا کے مختلف عناصر سے شناسائی حاصل ہوتی ہے اوران کے کالموں میں ان کی بے شمار مثالیں بھی نظر آتی ہیں۔ وہ گاہے بگاہے ایسے عظیم لوگوں کی مثالیں دیتے ہیں جن کو آئیڈیل گردانتے ہیں۔ ان کے یہ Icon کبھی تو مغرب کی عظیم شخصیات ہوتی ہیں اور کبھی وہ تاریخ اسلام کے عظیم الشان رہنماؤں کی زندگی سے مسلمانوں کو مثالیں دیتے ہیں، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، اشوکِ اعظم اور اسرائیل کی وزیرِ اعظم گولڈ امایئر، وغیرہ۔ ان کے خیال میں ایسے عظیم لوگ قوموں کی زندگیوں کو بدل سکتے ہیں۔ جن کے اندر کچھ کر گزرنے کا جذبہ موجود ہو اور وطن اور اہلِ وطن کے لیے مخلص ہوں تو یوٹوپیا کا حصول کم از کم ناممکن نہ رہے گا۔ جیسے کہ گزشتہ بیان کیے گئے کالم میں انھوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی زندگی، ان کی شخصیت اور اس کے خلافتِ راشدہ پر اثرات کے متعلق مفصل بیان کیا۔ اس کے ساتھ کالم نگار نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ان زریں اصولوں کا بھی ذکر کیا تھا جن پر عمل پیرا ہو کر ایک مثالی اور فلاحی ریاست کا قیام عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ کالم نگار نے مثالی اسلامی ریاست یا یوٹوپیا کے نمایاں خدوخال کا بھی ذکر کیا تھا۔

اسی طرح مصنف کے ایک اور کالم "عدل بھی مومن کی کھوئی ہوئی میراث" میں تاریخِ اسلام کے عظیم رہنما سلطان صلاح الدین ایوبی کا ذکر ملتا ہے۔ ان کی شخصیت کی صداقت و امانت کو بیان کرنے کے بعد مصنف ان کے زیرِ سایہ انتظامِ سلطنت کی تصویر دکھانے کے ساتھ ساتھ اس راز کا پردہ بھی افشاں کرتے ہیں کہ اس سلطنت کے قیام کی اصل وجہ دراصل کیا تھی۔

> "صلاح الدین ایوبی مسلمانوں کے پہلے حکمران اور جرنیل تھے جن سے یورپ کے حکمران، عوام، فوجیوں اور پادریوں کا واسطہ پڑا تھا اور سلطان نے اپنے حسنِ سلوک سے یورپ کے لوگوں اور حکمرانوں کا دل موہ لیا جس کے نتیجے میں نہ صرف یورپ کے بادشاہ اور امرا سلطان کی تعریف پر مجبور ہو گئے بلکہ عام شہری بھی تیزی سے اسلام قبول کرنے لگے۔ اس دور میں اسلام اور مسلمان چھ براعظموں تک پہنچ چکے تھے اور ان کی پیش قدمی سے یہودی اور عیسائی

شدید پریشان تھے۔ چناں چہ پریشانی کے اس عالم میں اس وقت کے یورپ نے مسلمانوں کی ترقی کی وجوہات معلوم کرنے کے لیے سٹڈی کروائی۔ یورپ کی اس تحقیقاتی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے غلبے کی سب سے بڑی وجہ ان کا نظامِ عدل ہے۔"(۳۱)

اگر اس فلسفے کو آج بھی سامنے رکھ کر پوری دنیا پر نظر دوڑائی جائے تو اس کی بنیاد پر دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ ممالک ہیں جن میں قانون اور عدل کی حکمرانی ہے اور قانون کے سامنے بادشاہ اور عام شہری برابر ہوتے ہیں جبکہ دوسرے وہ ممالک جن میں بالائی طبقے کے لوگ قانون سے بالاتر ہوتے ہیں اور عام شہری انصاف کے کٹہرے میں کھڑے ہیں۔ اس تقسیم میں بد قسمتی سے پہلی فہرست میں ترقی یافتہ ممالک آتے ہیں جب کہ دوسری فہرست میں تمام پسماندہ ممالک شامل ہوں گے اور مزید قابلِ حیرت بات یہ ہے کہ دوسری فہرست میں شامل ممالک میں ۹۵ فی صد اسلامی ممالک ہیں۔ وہ قانون جس پر عمل پیرا ہو کر غیر مسلموں نے ترقی کی راہ اختیار کی، اسلام کا دیا ہوا تھا۔ لیکن وہ لوگ آج ہمارے قوانین اور اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر ترقی کر رہے ہیں اور ہم اپنے مذہب کی تعلیمات کو بھلا کر دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ذلیل ہو رہے ہیں۔ بقول اقبال:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

انصاف کے ساتھ مصنف مسلمانوں کے اندر ہمت، غیرت اور دلیری کا جذبہ بھی اجاگر کرنے کے خواہاں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ، مسلمان خود پر بھروسہ کریں ان کے اندر خود انحصاری کا جذبہ بیدار ہو تو وہ دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکیں گے لیکن پاکستان تو اس حد تک مقروض ہو چکا ہے کہ اب وہ دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے قابل ہی نہیں رہا ہے۔ اسلامی ممالک کو بھی اللہ تعالیٰ نے بے تحاشا وسائل سے نوازا ہے۔ اگر ہم خود پر بھروسہ کریں تو دشمن ہمارا بال بیکا بھی نہیں کر سکتا ہے۔ مصنف وینزویلا کے صدر ہوگو شاویز کی مثال دیتے ہیں کہ وینزویلا دنیا کا تیل پیدا کرنے والا پہلا غیر اسلامی ملک ہے۔ شاویز نے امریکا کو دھمکی لگائی اگر اس نے بولیویا کے ساتھ کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کی تو وہ اسے تیل کی فروخت بند کر دے گا۔ اسی دوران روس نے وینزویلا میں اپنے طیارے بھجوا دیے۔ یہ طیارے جدید اسلحے سے لیس تھے۔ انھوں نے امریکی طیاروں کا کڑے دل سے مقابلہ کیا۔ ہنڈورس، جنوبی امریکا کا ایک بہت ہی چھوٹا ملک ہے جس کی

معیشت کا دارومدار کیلوں پر ہے جس کی بنیاد پر اسے بناناری پبلک بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن جب امریکا نے ان کے حقوق غصب کیے تو اس بناناری پبلک نے امریکی سفیر کی اسنادِ سفارت کاری واپس کر دیں۔ ہم اگر اپنا تقابل ان دونوں ممالک کے ساتھ کریں تو ہمارے پاس ان سے کہیں زیادہ وسائل موجود ہیں۔ ہم اگر اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں تو امریکا کو یہ جرات نہیں ہو گی کہ ہماری فضائی اور زمینی حدود کی خلاف ورزی کرے، گھروں پر میزائل داغے اور معصوم بے گناہ روزہ دار شہریوں کو شہید کرے۔ اگر دل جرات اور آنکھ غیرت سے محروم ہو تو ایٹم بم بھی کسی قوم، کسی انسان کو جرات مند نہیں بنا سکتے۔ کاش ہم بولیویا ہوتے یا ہمارے لیڈر موریلس یا ہوگوشاویز ہوتے۔

یہاں کالم نگار نے اپنے ملک کے لیے بھی ایک مثالی ریاست یا یوٹوپیا کا تصور پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ سارے کام ہو جائیں تو ہمارے ملک کو ایک مثالی ریاست بنانے سے کوئی طاقت روک سکتی نہیں ہے۔ اگر ہم حصول کی بجائے اصول کو مقصد بنالیں۔ ہم لوگ دینے، جھکنے اور مک مکاؤ سے توبہ کر لیں۔ خدمت کو سیاست بنالیں، ہماری بیورکریسی آج سے متحرک ہو جائے، تاخیر اور رکاوٹ کی پالیسی کو اپنے خمیر سے باہر نکال پھینکیں۔ یہ فیصلہ کر لیں کہ آج کا کام آج ہی ختم ہو گا، کوئی درخواست فائل نہیں بنے گی، جائز کام کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں آئے گی اور ناجائز کام کسی قیمت پر جائز نہیں ہو گا تو ہمارے مسائل بھی حل ہو سکتے ہیں۔

اس سے قبل بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ جمہوریت مصنف کا پسندیدہ طرزِ حکومت ہے۔ وہ آمریت، مطلق العنانی اور خلافت کے اس لیے بھی خلاف ہیں کہ انھیں عوام کی حمایت اور ان میں مقبولیت نہیں حاصل ہوتی ہے۔ اپنے کالم میں جس کا نام ہی انھوں نے "کالم نگار کی تجاویز" رکھا ہے، آمروں کو یوں نصیحت کرتے نظر آتے ہیں:

> " صرف شہدا اور ان کے پسماندگان کو پلاٹ دیے جائی،ں تمام افسروں سے مراعات واپس لی جائیں، وزرا کی مراعات ختم کی جائیں اور تن خواہیں آدھی کر دی جائیں، ملک کے تمام بچوں کی تعلیم، تمام شہریوں کا علاج اور تمام بچیوں کی شادی حکومت کی ذمہ داری ہو۔ "(۳۲)

اپنے کالم میں مزید تجاویز دیتے ہیں کہ حکومت میٹرک کے بعد تمام بچوں کو فنی تعلیم دے، وہ نوجوان جو ڈاکٹر، انجینئر اور کمپیوٹر ایکسپرٹ بن سکتے ہیں، ان کے علاوہ تمام نوجوانوں کو فنی تعلیم دی جائے۔ ملک میں

ایک کنال سے بڑا مکان بنانے پر حکومت کی جانب سے پابندی لگائی جائے تاکہ امیر اور غریب کا فرق مٹ سکے۔ پبلک ٹرانسپورٹ کا بندوبست کیا جائے اور ذاتی گاڑیوں کے رجحان کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ تقریبات کے لیے ضابطہء اخلاق نافذ ہو۔ عدالتوں میں کوئی مقدمہ چھ ماہ سے زیادہ نہ چلے۔ لوگوں کو معاشرے میں جہاں کوئی ظالم اور بے ایمان شخص نظر آئے، اس کے دروازے پر جا کر بیٹھ جائیں کہ ہم کسی کرپٹ، بے ایمان اور نااہل افسر کو برداشت کریں اور نہ کسی بے ایمان سیاست دان کو۔

مقالہ نگار کو دیے گئے انٹرویو میں کالم نگار نے کہا کہ اس وقت اگر آپ آئیڈیل کی بات کریں تو دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں جو قابلِ تقلید یا مثالی ہو۔ اس لیے اگر کوئی مثالی ملک نہیں ہے تو یوٹوپیا کا وجود بھی نہیں ہے۔ کالم نگار نے یوٹوپیا کی تعریف No Place اور Good Place کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ ایسی کسی ریاست کا وجود نہیں ہے لیکن آئیڈیل کی تلاش ضروری ہے۔ اسی لیے کالم نگار کبھی مغرب، کبھی ریاستِ مدینہ اور کبھی چین کو اپنا آئیڈیل قرار دیتے ہیں۔ وہ ان کے اچھے اصولوں کو اپنے ملک میں لاگو کر کے اپنا یوٹوپیا تشکیل دیتے ہیں یا یوں کہیں کہ ان کی ایک فرضی اور تصوراتی شکل ترتیب دیتے ہیں۔

کالم نگار جمہوریت کے خواہش مند ہیں جو ان کا پسندیدہ طرزِ حکومت اور یوٹوپیا کی تشکیل میں ایک بنیادی عنصر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جمہوریت کی پٹڑی پر چل کر ہم ایک مثالی فلاحی ریاست حاصل کر سکتے ہیں اور اس کی مثال میں وہ برطانیہ اور انڈیا کا ذکر کرتے ہیں۔ کالم نگار مذہبی ریاست کی بجائے اسلامی ریاست کے خواہاں ہیں کیونکہ اگر ملک میں مذہبی گروہ کی اجارہ داری ہوگی تو جنونیت اور دہشت گردی کو ہوا ملے گی۔ ان کا خواب ایک روشن خیال، معتدل ریاست یا کسی حد تک سیکولر ریاست ہے جس پر کسی خاص طبقہء فکر کا تسلط نہ ہو۔ عوام کو آزادیٔ رائے کے ساتھ اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی حاصل ہو۔ لیکن کالم نگار کے نزدیک موجودہ حالات میں یوٹوپیا کا حصول ممکن نہیں ہے۔ ہاں کوشش کی جاتی ہے اور کی جانی چاہیے کہ حالاتِ زندگی بہتر ہو سکیں۔

کالم نگار کے یوٹوپیا کے بنیادی ستونوں میں اسلاموٹوپیا، آئیڈئیلزم اور مغربی جمہوریت بھی شامل ہیں۔ آئیڈیلزم اس لیے بھی اہم ہے کہ ایک مثالی شخصیت، مثالی حکمران اور مثالی رہنما ہی ملک میں بنیادی سطح پر کسی بھی قسم کی نمایاں اور مثبت تبدیلی لانے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ یہ عوام الناس کے بس کی بات نہیں ہے۔ عوام صرف انقلاب لا سکتے ہیں اور انقلاب ہمیشہ کسی تباہی اور بربادی کے بعد ہی ظہور پذیر ہوتا ہے۔

مصنف کی آئیڈیل شخصیات تاریخِ اسلامی کا بھی حصہ شامل ہے۔ اس کے علاوہ مغرب اور مشرق سے تعلق رکھنے والی مثالی شخصیات بھی ان کی آئیڈیل ہیں۔ مصنف کے خیال میں تعلیم اور ترقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تعلیم کی بدولت ہی ہم اپنے موجودہ حالات میں تبدیلی لا سکتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ساتھ اشوک جیسی تاریخی شخصیات کالم نگار کی آئیڈیل ہیں۔ ان کے مطابق اگر ان جیسے مخلص حکمران ہمیں میسر آئیں تو ملک کے حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔

ہارون رشید بحیثیت کالم نگار:

ہارون رشید "ناتمام" کے مستقل عنوان سے اردو کے بڑے اخباروں روزنامہ نوائے وقت، روزنامہ جنگ اور روزنامہ دنیا میں ۳۰ سال سے کالم لکھتے رہے ہیں۔ کالم نگاری کا آغاز ۹۰ء کی دہائی سے کیا۔ ہارون رشید کا شمار ممتاز معاصر کالم نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کا اسلوب منفرد اور متاثر کرنے والا ہے۔ وہ اکثر اپنے کالم کا آغاز کسی تاریخی واقعہ سے کرتے ہیں۔ ان کے کالموں میں اقبال کے کلام سے بھی حوالے نظر آتے ہیں۔ علامہ اقبال اور تاریخِ اسلام کے حوالے ان کے کالموں کی بنیادی خصوصیت ہیں۔ دورِ قدیم کے واقعات کا اطلاق وہ موجودہ حالات پر کر کے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جاوید چودھری کی طرح ہارون رشید بھی مختلف ممالک میں اصلاحی اور مثالی صورت حال سے متاثر ہوتے ہیں اور انھیں اپنے ملک میں نافذ کرنے کی تجاویز دیتے نظر آتے ہیں۔

ہارون رشید کی کالم نگاری میں یوٹوپیا

ہارون رشید کے ہاں یوٹوپیا کی مختلف صورتیں ملتی ہیں۔ وہ تاریخی اور سماجی مثالوں سے اپنے یوٹوپیا کی وضاحت کرتے ہیں۔ جیسے ایک جگہ وہ بتاتے ہیں کہ سوڈان کے لوگوں کی خصوصیات، ان کے صبر و قناعت اور محنت کی عادت نے انھیں متاثر کیا۔ وہ اس قوم کے ماضی کا حوالہ دیتے ہوئے یہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ قوم مصائب کو برداشت کرتے ہوئے اس نہج تک پہنچی ہے۔ مصنف اگرچہ سوڈان کو مثالی ریاست تو قرار نہیں دیتے لیکن چنگیز خان جس کا تعلق منگول قوم سے تھا، وہ اس کی شخصیت سے متاثر ہیں۔ چنگیز خان کی شخصیت میں انھیں ایک ایسا مثالی رہنما نظر آتا ہے جس نے اپنی قوم کی تقدیر بدل دی۔ وہ ایک غلام قبیلے سے تعلق

رکھتا تھا لیکن دنیا کی تاریخ میں لڑی جانے والی دس عظیم جنگوں میں سے دو کا فاتح یہ غلام رہا تھا۔ اپنے کالم میں ہارون رشید سوڈان کی معاشی ترقی کی مثال دیتے ہیں:

> "سوڈان کی تمام سماجی زندگی کا سب سے چونکا دینے والا پہلو عام آدمی کی شائستگی، شرافت اور اپنائیت ہے۔ دنیا بھر میں شاید ہی کوئی اور معاشرہ ایسا انسان دوست ہو۔ جرائم بہت کم تھے، اڑھائی تین کروڑ کی آبادی میں قتل کے صرف دو مقدمات، تیزی سے عدالت فیصلے صادر کرتی ہے اور جرم کو نمٹا دیا جاتا ہے۔"(۳۳)

سوڈان کی سیر کے دوران مصنف نے ان کی مثال آموز زندگی کا مطالعہ کیا۔ ان کے خیال میں اگرچہ سوڈان کو ایک مثالی ریاست کا درجہ تو نہیں دیا جا سکتا ہے لیکن ان ہی اصلاحات کی وجہ سے آنے والے دنوں میں یہ ترقی کرے گا۔ مشرق و مغرب اس کے مخالف ہیں لیکن اس کو کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ سادگی کو اپنا طرزِ زندگی بنانے والے لوگ اپنی غربت میں بھی مطمئن اور قانع ہیں۔ سونے اور چاندی کے زیورات میں جب مصنف نے کھوٹ کا خدشہ ظاہر کیا تو ان کی آنکھیں ورطۂ حیرت سے کھل گئیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ، تباہی کا دارومدار امتحان اور آزمائش سے نہیں بلکہ مبتلا ہونے والے کے ردِ عمل پہ ہے۔ منگولوں کا سردار چنگیز خان، تیرہ سال کا ایک بچہ، دھند اور دھوپ میں زندگی کی مسافت اور منزل کی تلاش میں تھا۔ ڈاکوؤں نے اس کے گھر پر حملہ کیا اور مال و اسباب لوٹ کر لے گئے۔ اگر وہ حالات سے ڈر جاتا تو آئندہ زمانے کیا بستی کی بڑی بوڑھیوں کو بھی یہ بات یاد نہ رہتی لیکن اس نے لوحِ تاریخ پر فاتح اعظم بن کر ابھرنا تھا۔ وسطی ایشیا سے دمشق تک کی مٹی اس نے روند ڈالی۔ اس کا قانون صدیوں تک سلطنتوں پر رائج رہا تھا۔ چنگیز خان منگولوں کا سردار تھا جس کے ورثا نے مدتوں دنیا پر حکومت کی۔ یوں تو تاریخ اس کو غارت گر، سفاک اور بے رحم قاتل کے نام سے یاد کرتی ہے لیکن اس کی فتوحات منگوالی وراثت سے اس کی اولاد رکن دین کو منتقل ہوئی۔ چنگیز خان اور اس کی اولاد سلطان الظاہر رکن الدین بیبرس، نے ہوش سنبھالا تو گرتے پڑتے غلاموں کی اس فوج کا حصہ بن گیا۔ بادشاہ تاتاریوں کی مزاحمت کے لیے مرتب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تاریخ کی دس عظیم ترین جنگوں میں سے دو کا فاتح یہ غلام تھا۔ ملٹری سائنس کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے ایک مثالی کردار رہا ہے۔ اگر ان آزمائش کے ابتدائی ایام میں اس کی ہمت ٹوٹ گئی ہوتی تو آج تاریخ کو ایک عظیم فاتح میسر نہ آتا۔

کالم نگار کی شخصیت کا اہم تعارف ان کے کالموں میں ماضی پرستی کا یہی رجحان ہے۔ وہ اکثر اپنے کالموں میں مسلمانوں کے عظیم ماضی کو یاد کرتے ہیں اور اسی عظمتِ رفتہ میں کھو کر وہ اپنا یوٹوپیا تراشتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ مسلمانوں کی کھوئی ہوئی عظمت لوٹ آئے۔ وہ اکثر اپنے کالموں میں اقبال کے اشعار کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔

کالم نگار کا نقطہء نظر امتِ مسلمہ کو اس شاندار ماضی کی یاد دلانا ہے، جب وہ عروج پر تھے۔ وہ مسلم نوجوان کے اندر احساسِ زیاں بیدار کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اپنے کالم "آئینہ خانہ" میں کالم نگار قرار دادِ پاکستان کی مثال دیتے ہیں جب ہمیں قائد اعظم جیسے عظیم رہنما میسر آئے تھے۔ کالم نگار کے نزدیک ہمارے وطن کو آج بھی قائداعظم جیسے عظیم اور مخلص رہنما کی ضرورت ہے۔ اس سوچ کو اگر مصنف کی رجائیت پسندی کہا جائے تو بے جانہ ہو گا۔

مصنف اس سلسلے میں خوش گماں واقع ہوئے ہیں۔ ان کے خیال میں ترقی کسی کی ذاتی جاگیر نہیں ہوتی بلکہ کاوشوں سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ، ابھی ہندوستان کے لوگوں نے ایک ایسے لیڈر کو دیکھنا تھا جو اپنا وقت کبھی رائیگاں کرتا، ہزاروں برس سے اس سرزمین کا شیوہ خوئے غلامی تھا، خوف، احساسِ کمتری اور عدم تحفظ ان کی صفات تھیں۔ وہ مگر ایسا بہادر تھا کہ خوف اور لالچ اس میں داخل نہ ہو سکتا تھا۔ ایک محدود سے مکتبِ فکر سے اٹھنے والا وہ شخص جس نے زندگی کو اپنی آنکھ سے دیکھا اور بتدریج وسعتِ فکر و نظر پائی۔ ہمالہ کی بلندی سے اپنے میدانوں پر نظر کرنے والے مؤرخ اسٹینلے والبرٹ کا کہنا ہے کہ وہ بیسویں صدی کا سب سے قد آور آدمی ہے۔ اپنے ان عظیم لوگوں کی فہرست میں مؤرخ نیوزی لینڈ کی وزیرِ اعظم کا نام بھی لیتا ہے جس نے تعصب اور تفاخر کو بالائے طاق رکھ کر دنیا کے سامنے اخلاق، رواداری اور انسانیت کی ایک عظیم مثال قائم کی۔

مصنف کے ہاں ماضی پرستی کی اور بھی کئی مثالیں نظر آتی ہیں۔ وہ عہدِ ماضی کے ان سنہرے دنوں کو یاد کرتے ہیں جب یہ خطہ ایک مثالی خطہ تھا۔ لکھتے ہیں کہ، یہ خطہ کبھی تہذیبوں اور ترقی کا مرکز گردانا جاتا تھا۔ راوی اور چناب کے درمیان دریائے سندھ سے ایک ڈیرھ گھنٹے کی مسافت پر سیالکوٹ تک یہ خطہ ۶۷ ممالک پر مشتمل یونانی، ہندوستانی سلطنت کا دارالحکومت رہا اور تقریباً ۱۷۰ برس تک دارالحکومت رہا۔ پھر حملہ آوروں کا ہدف بنا۔ بدھوں نے مزاحمت نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۷۰ ہزار گردنیں شہ زوروں کے آگے جھکیں اور گاجر

مولی کی طرح کاٹ دی گئیں۔ وقت کے ایک تھپیڑے کی دیر تھی، جھکی گردنیں سجدہ ریز ہو گئیں۔ مشرق و مغرب کے ہر دریا کی تاریخ یہی ہے۔ کوئی شہر بستا ہے تو کوئی اُجڑتا ہے، کوئی قبیلہ بڑھتا ہے اور کوئی گھٹتا ہے۔ ملکوں اور قوموں کی سرحدیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ قیام اور استقلال صرف تبدیلی کو ہے اور یہی قدرت کا دائمی قانون ہے۔ ابدیت سفر کو ہے، مسافر کو نہیں۔ علم و ادراک کو ہے، تشکروں کو نہیں اور قومیں افلاس نہیں احساس کی موت سے فنا ہوتی ہیں۔ عقل و شعور کے فقدان کے باعث جذبات غالب آجاتے ہیں۔ غور و فکر کی جگہ تنگ نظری، وحشت اور جنون لے لیتی ہے اور مصنف کے نزدیک آج بحیثیت قوم ہم ایسی بیماری میں مبتلا ہیں۔ مصنف کے مطابق آج ہم ایک ہول ناک تباہی کا شکار نظر آتے ہیں۔ بحیثیت قوم ہم ایک ایسے مسافر کی مانند ہیں جس کی نہ کوئی سمت ہو اور نہ جس کی کوئی منزل نہ ہو۔

کالم نگار دریائے سندھ اور اس کے ساتھ بسنے والی تہذیبوں کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ عروج وزوال کبھی دائمی نہیں ہوتا۔ے مسلمان کبھی روبہ عروج تھے اور آج زوال کا شکار ہیں۔ کالم نگار کے نزدیک جذبات کے بجائے عقل و شعور سے کام لینے والی قومیں ترقی کرتی ہیں۔ اس کی مثال میں وہ اقوام مغرب کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے مطابق مسلمانوں نے جب دینِ اسلام کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھا تو وہ ترقی کا زینہ طے کرتے گئے۔ وہ ریاستِ مدینہ کی تصویر اپنے کالم بعنوان "ذوقِ عمل" میں پیش کرتے ہیں، جو اُن کا یوٹوپیا ہے۔

> "نور برستا رہا، قلب و دماغ کی تاریکیاں علم اور حسنِ علم کے نور میں ڈھلتی رہیں۔ یہ عہد سرکار ﷺ کا تھا۔ پھر ہماری تاریخ کا سنہری دور کون سا رہا، سیّدنا فاروقِ اعظم کا؟ بارہ برس کی حکومت میں پانچ سال قحط کے۔ ایسا قحط کہ کم خوراکی سے چہرے زرد ہوئے۔ ایک نڈھال سی بچی کو دیکھا تو پوچھا کہ یہ کون ہے؟ آپ کو بتایا گیا کہ آپ کی پوتی ہے امیر المؤمنین۔"(۳۴)

یہ مصنف کے یوٹوپیا کی ایک تصویر ہے۔ مالی و دنیاوی خوش حالی کے برعکس وہ روحانی آسودگی کی بات کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ زندگی ہمیشہ اور ہر ایک سے آزمائش لیتی رہی ہے۔ اللہ کی آزمائش سب سے زیادہ اس کے منتخب لوگوں پر آئی ہیں۔ لیکن اگر آپ کے اندر صبر اور استقامت ہو تو بڑے مصائب کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ کالم نگار کا مقصد عوام کی اخلاقی تربیت ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد خلفائے راشدین نے مصائب کا مقابلہ زندہ دلی اور استقامت سے کیا۔ آج بھی اس حوصلہ اور بلند ہمتی کی

ضرورت ہے جس کی مدد سے ایک ریاست کی تشکیلِ نو کی گئی۔ ایک ایسی ریاست جس کی بنیاد رسول ﷺ نے رکھی اور جس کو جغرافیائی وسعت خلفائے راشدین حضرت عمر رضی اللہ عنہ ر، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں حاصل ہوئی۔ ایک ایسی مثالی ریاست جو استقامت کے ساتھ بروئے کار لائی گئی۔ اس مثالی ریاست کے قیام کے لیے جو اصول بروئے کار لائے گئے، ان میں صحیح سمت میں ترجیحات کا تعین اور منزل کی جانب اٹھایا گیا پہلا قدم اہم ترین ہے۔ اگر ہم آج بحیثیت قوم اپنی ترجیحات طے کرلیں اور ان پر ثابت قدم رہیں تو منزلِ مقصود یعنی مثالی ریاست کا قیام ممکن ہو سکے گا۔H.G Well نے اپنے ماڈرن یوٹوپیا میں بھی اسی اخلاقی تربیت کو نقطہء عروج قرار دیا ہے۔

مصنف لکھتے ہیں کہ، اللہ کے برگزیدہ بندوں کی جستجو کا محور صداقت کا حصول ہوتا ہے۔ امیر المؤمنین یروشلم کو روانہ ہوئے تو ایک اونٹ اور ایک غلام ساتھ میں تھا۔ چند عشرے قبل وہ قافلوں کی صورت میں سفر کیا کرتے تھے اور چودہ برس قبل رسولِ اکرم ﷺ کی وفات کے بعد تین شہروں کے بجائے کسی میں بغاوت نظر نہیں آتی تھی۔ مدینہ اور طائف کے سوا کبھی جہاں اوباشوں کی سنگ باری سے پیغمبر ﷺ کی ایڑیوں تک خون گرا تھا۔ قدیم قبائلی وحشت لوٹ آئی تھی۔ نوے فیصد آبادی نے عہد جاہلیت کی بے رحمی و بے باکی سے منور قوانین کی مقدس طنابیں توڑ ڈالیں، زکوۃ دینے سے انکار کر دیا، نو تشکیل شدہ ریاست کے لیے جو آپ نے کہا، وہ کیا، دھیمے، بردبار مہربان اور مشفق خلیفہ الرسول جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: خدا کی قسم اونٹ کی ایک رسی بھی چھوڑوں گا نہیں۔ یہ ہوتا ہے مثالی رویہ۔ المیہ یہ نہیں ہوتا کہ مصیبت آن پڑے تو ہاتھ پاؤں پھول جائیں۔ اللہ اپنے بہترین لوگوں کو بھی آزماتا ہے اور بارہا آزماتا ہے لیکن ان کے استقلال میں لغزش نہیں آتی۔ رہنما کو مشکل حالات میں فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ اس قدر سخت فیصلے لے کر بھی یروشلم تک کا سفر اکیلے طے کرتے تھے کوئی محافظ دستہ ساتھ نہیں ہوتا تھا۔ اس کی وجہ قانون کی حکمرانی تھی۔ قانون کا خوف اس قدر گہرا تھا کہ سہم کر جرم اور مجرم زمین سے چمٹ گیا تھا۔ اور یوں مصنف کے بقول State becomes invisible کی فضا پیدا ہوئی۔ مثالی ریاست ایسی ہوتی ہے اور استقامت کے ساتھ بروئے کار آتی ہے اور اس طرح اپنی ہیبت افق تا افق پھیلا دیتی ہے۔ ان کے بقول، پوری آزادی اور نظم و ضبط کے ساتھ اگر ہم اپنی ترجیحات کو بدل ڈالیں یا دوسرے لفظوں میں ان کے تعین کو بدل ڈالیں تو بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ ترجیحات، صحیح سمت پر متعین کی گئی ہوں تو زندگی کے

مقاصد طے کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اصل منزل کی طرف اٹھایا گیا پہلا قدم ہی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اگر آپ ترجیحات کا تعین ہی نہیں کر سکتے اور ایک دائرے میں گھومتے رہیں گے تو ناکامی کے لیے دوسروں کو ذمہ دار ٹھہراتے رہیں گے۔ حالات کو کوستے اور جواز گھڑنے میں لگے رہیں گے۔ اگر آج ہمارے حکمران اپنی ترجیحات کو طے کر لیں تو منزل مقصود یعنی مثالی ریاست کا وجود آسان ہو جائے گا۔

کالم نگار نے مثالی ریاست کی تشکیل کے لیے جو تجویز دی ہے اس میں ایثار و قربانی کا جذبہ اور صورت حال کا صحیح ادراک بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ وقت کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے لائحہ عمل مرتب کیا جائے جس کے لیے قربانی پہلی شرط ہے۔ وطن عزیز کی حالت اس قدر خراب ہے کہ ہر شخص کو اپنی ہی جگہ پر ملک کے لیے قربانی دینی پڑے گی۔ دولت مند افراد پیسے کی مدد سے ملک کا قرضہ اتاریں اور باہنر افراد اپنے ہنر سے پاکستان کی خدمت کریں۔ اگر سب صدقِ دل اور خلوص سے کام کریں تو یقیناً اللہ کی مدد شاملِ حال ہوگی۔ لیکن خود فریبی اور فرار کی نفسیات کے باعث اعلیٰ طبقہ اس سے کتراتا ہے یا پھر وہ قربانی کے بکرے کی تلاش میں نظر آتے ہیں۔ اسی ثابت قدمی اور بلند عزم کی ایک مثال کالم نگار نے ڈاکٹر امجد ثاقب کی دی ہے جو ملک کے غریب و مستحق اور باصلاحیت طلبا کے لیے مفت تعلیم فراہم کر رہے ہیں۔

> "لاکھوں تاریک گھروں میں چراغ جلانے کے بعد اب ڈاکٹر امجد ثاقب ایک عظیم یونی ورسٹی کی تاک میں ہیں۔ ایک ایسی جامعہ جو ملک کو نئے عہد میں داخل کر دے۔ جس کا ثمر سب کے لیے ہو۔ وہ سبزہ نمودار ہو جو کبھی ماند نہ ہو۔ تین سو سکولوں کے علاوہ وہ تین ایسے شاندار کالج چلاتے ہیں جن میں آنے والے منور کل کے معمار پل رہے ہیں۔"[۳۵]

مذکورہ کالم میں مصنف نے ڈاکٹر محمد ثاقب کے مصنوبہ جات کا ذکر کیا ہے اور اس سے زیادہ اہمیت ان کے اندر جذبے اور ایثار کو دی ہے۔ مصنف کے مطابق جب بتایا گیا کہ پاکستانی قوم سب سے زیادہ فراخ دل ہے تو کچھ لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا لیکن ڈاکٹر امجد صاحب اسی جذبے کو مثبت اور عملی انداز سے استعمال میں لے آئے۔ علاوہ ازیں مندرجہ ذیل کالم بعنوان "فردوسِ بریں" بھی رجائیت پسندی کی ایک واضح مثال ہے۔

> "بات صرف جذبے اور لگن کی ہے۔ ایثار کا بیج اگر شعور اور ادراک کے ساتھ بویا جائے تو ایسی فصل اُگ سکتی ہے جو لازوال ہوگی، جس کے شگوفوں سے شگوفے پھوٹتے ہیں۔ ایک بیج

سے بہت سارے بیج بنتے ہیں۔ ایک بیج سے ایک بالی، ایک بالی سے ستر دانے ہر دانے میں ایک اور بالی شجر سے شاخیں، شاخوں پہ پھول، پھول سے پھل، خیر اور ایمان کے کبھی نہ ختم ہونے والے سلسلے کا آغاز اور یوں بھی نیکی میں بہت برکت ہوتی ہے۔ نیکی کے شجر کی جڑیں گہری اور ٹہنیاں آسمان تک جاتی ہیں۔"(۳۶)

اس کالم میں کالم نگار کی رجائیت پسندی عروج پر ہے۔ مصنف کے اکثر کالموں میں ماضی پرستی اور حال سے فرار کا رجحان بھی نظر آتا ہے اور اس فرار کے دوران وہ کبھی ماضی یا مستقبل میں پناہ لیتے ہیں۔ ایک خیالی دنیا یا دوسرے لفظوں میں ایک رومانوی منظر یا زندگی کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ ان کے ہاں رومانویت پسندی بدرجہا نظر آتی ہے۔ ایسا رومان پرور نظارہ جب بھولے بسرے وقت جاگ اٹھتے ہیں، حال نہ ماضی نہ مستقبل بلکہ ایک ہی ساعت میں سب زمانے مل جاتے ہیں۔ دل جب تڑپ کر بیدار ہوتا اور پھر بیدار ہی رہتا ہے۔ رومانیت پسند سوچ بھی تخیلاتی اور تصوراتی دنیا کی تشکیل میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

"چولستان کی مہربان خاموشی ہوٹل کے سجے سنورے کمرے میں در آئی اور اتر گئی ہے۔ سکوت ہے اور دور دور تک سکوت، نیند کہاں۔ آج کی شب شاید پو پھٹنے تک جاگنا ہوگا۔ اس سچی، فطری اور بے ساختہ زندگی کی تلاش۔ ایک بڑے شہر میں، نمود ذات کی تمنا میں جو بے ثمر بیت گئی۔"(۳۷)

اسی کالم میں آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ، خواجہ غلام فرید نے بھی اپنی شاعری میں اس رومانوی فضا کا ذکر کیا ہے اور اس گوشہ ءتنہائی کو تخلیق اور عالم جذب کا باعث قرار دیا ہے۔ جس کو Wordsworth نے خلوت کا ثمر قرار دیا ہے۔ Abliss of Solitude جس کو مشہور انگریز شاعر ورڈز تھ نے اپنی نظم Daffodiles میں خلوت کا ثمر قرار دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی ادیب یا شاعر گوشہ ءخلوت میں خدا اور مظاہر قدرت سے زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔ اس کے اور خدا کے بیچ حائل تمام پردے بے نقاب ہو جاتے ہیں سوچ کو گہرائی اور کبیرائی حاصل ہوتی ہے۔ وجدان کی کھڑکی کھل جاتی ہے اور وہ آگہی کے اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جو کوشش سے ممکن نہیں ہے۔ آگے وہ اقبال کا حوالہ بھی لے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ، دنیا کو روشنیوں سے منور کرنے والا خالق جب ایک دعا کی دوری پر ہوتا ہے۔ شاید اقبال کو صحرا کی مادری محبت کی ایسی مہربان ہوا کا تجربہ کم تھا مگر ان کے دل میں درد کا ایک صحرا آباد تھا۔ جب تنہائی نصیب ہوتی تو اس میں جا بستے۔

صحرا کے ٹیلوں اور ان کی وسعتوں، نخلستانوں اور ہواؤں سے گفتگو کیا کرتے تھے۔ صحرا میں شب کی ہوا تازگی اور گہری پر اسراریت سے لبریز ہوتی ہے۔ چاندنی رات میں اونٹوں کے خاموش قافلے، ہرن کا خرام، بانسری کی تان دِل کو چھو جاتی ہے۔ وقت کی گردش تھم سی جاتی ہے اور پھر بادلوں کے گلستان میں اک ہو جاتی ہے، لہراتی ہے۔ ہمیشہ صحرا نشینوں کو نہ صرف قدرت نے سحر انگیز ماحول سے نوازا ہے بلکہ انھوں نے خود بھی ان تھک محنت اور جانفشانی سے صحرا کو گلزار بنایا ہے۔ روہی کی خواتین کی ہاتھوں کی بنائی گئی دست کاریاں، گویا رنگین ہار چولی پر کسی نے خواب تحریر کیے ہوں، رنگوں کا ایسا تال میل ہے کہ مصور کا قلم بھی ہیچ ہے۔ پھر سرائیکی کی مٹھاس کانوں میں رس گھولنے کے لیے کافی ہے۔ شاموں، صبحوں اور راتوں کی خاموشی میں ذات باری تعالیٰ کا جلوہ جس نے اپنے پیغمبر ﷺ کو صحرا میں اتارا تھا۔ اس پورے کالم کی فضا رومانویت سے لبریز ہے۔ مصنف کے خیال میں ذات باری تعالیٰ کو بھی اپنی تخلیق کردہ زمین میں محبوب صرف صحرا تھے۔ اس لیے اپنے محبوب کو ادھر ہی اتارا۔ شہر تو یوں بھی تمدن کے عقوبت خانے ہیں جب کہ صحرا اور اس کی فضا یہ سب مصنف کی خیالی جنت ہے۔ اس کا یوٹوپیا جہاں انسان دنیا کے دکھ درد سے نجات حاصل کر کے فطرت کی پناہ میں آجاتا ہے اور فطرت تو یوں بھی ماں کی طرح شفیق ہوتی ہے ہر کسی کو ہر وقت اپنی کوکھ میں سمونے کو تیار رہتی ہے۔

ایک اور کالم میں ملک میں پانی کی قلت کے حوالے سے اپنے یوٹوپیائی خیالات کا اظہار وہ کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> "فی الحال دشمن کے دانت کھٹے کرنا ہی حالات کا اولین مطالبہ ہے۔ مستقل ترجیح مگر یہ ہونی چاہیے کہ جھیل کے شگاف بند کیے جائیں۔ قوم کو اپنی عادات بدلنا ہوں گی۔ سیلابی آب پاشی کے قدیم طریق پر عمل پیرا ۹۰ فی صد پانی ہم ضائع کرتے ہیں۔ بچا سکیں تو بلوچستان، تھر اور چولستان کے صحرا گلزار ہو جائیں۔ بھوکی دنیا کے سارے دستر خواں ہم اناج اور پھلوں سے بھر دیں۔"(۳۸)

آگے چل کر کالم نگار نے ملک میں پانی کی کمی کو پورا کرنے کے لیے چند عملی تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سیلابی آب پاشی کے قدیم طریقے پر عمل کر کے ہم سیلابی پانی کو ضائع ہونے سے بچا سکتے ہیں، اس طریق کار میں سیلاب سے آنے والے پانی کو جھیلوں اور چھوٹے ڈیموں میں ذخیرہ کر کے زراعت میں استعمال

کیا جاسکتا ہے۔ مصنف نے ملک کے حالات کو تبدیل کرنے کے لیے لائحہ عمل حکمرانوں کے سامنے رکھ دیا ہے۔ ان کے خیال میں شاعر حضرات تو خیالات کی وادیوں اور بے عملی کی فضا میں زندہ رہتے ہیں لیکن حکمرانوں کو اس تجاہل اور غفلت کی بالکل فرصت نہیں ہے۔ ملک کے حالات اس قدر دگرگوں ہیں کہ اب عملی اقدام اٹھانا اشد ضروری ہے۔ قدرت کا یہ دریائی پانی ہم لوگ کس قدر فیاضی بلکہ فضول خرچی سے ضائع کر رہے ہیں۔ اپنے وسائل کو بچانے کی ضرورت ہے۔ یہاں مصنف کی رجائیت پسندی کے ساتھ عمل پسندی بھی واضح ہے۔ وہ یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہم نے اپنے نہری پانی کو ضائع ہونے سے بچا لیا تو ہم اپنے ریگستانوں اور اپنے صحراؤں کو گل و گلزار کر دیں اور پھر وہ اس خوش فہمی میں اس حد تک آگے چلے جاتے ہیں کہ وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ہم اس قدر خود کفیل ہو جائیں گے کہ نہ صرف اپنے بلکہ بھوکی دنیا کے دستر خوانوں کو اناج اور پھلوں سے بھر دیں گے۔ ہم نہ صرف خود کفیل ہوں گے بلکہ زرعی اجناس سے زرِ مبادلہ بھی حاصل کر سکیں گے۔

ان کے کالموں میں جہاں رجائیت پسندی نظر آتی ہے وہیں ماضی پرستی کی بھی کئی مثالیں ہیں۔ وہ اپنے کالموں میں اکثر ان کارناموں کی یاد دلا کر امت مسلمہ کے سوئے ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہے جن پر ہمیں فخر ہونا چاہیے۔ وہ ماضی کے عروج و زوال کی داستانیں قاری کو سناتے ہیں اور اس بات کی یقین دہانی کرواتے ہیں کہ ہر کمال کو زوال ہے۔

> "وجیہ اور توانا فاتح کی لاش تخت پر پڑی تھی۔ باکسر محمد علی کلے کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ چاند پر آدمی کے اترنے کا منظر اتنے بڑے ہجوم نے دکھایا، اس کے میچ دکھایا کرتے۔ آخر کو اس حال میں پہنچا کہ رعشہ کے مارے ہاتھ کانپتے رہا کرتے۔ کافی کی پیالی تھام نہ سکتا۔ کچھ باقی نہیں بچتا کچھ بھی نہیں۔ آدمی کا اپنا بھی کیا ہے، سب کچھ عطا کرنے والے کا عطا کیا ہوا۔ جب چاہے واپس چھین لے۔ اس کے دربار میں صرف عاجزی کا سکہ کھرا ہے یا پھر انکسار اور خلوص کا۔ "(۳۹)

ماضی پرستی کے ساتھ اسلاموٹوپیا کے عناصر بھی مصنف کے کالموں میں اکثر نظر آتے ہیں۔ ان کے کالموں میں جا بجا یا تو قرآن کی آیات اور احادیث کے حوالے نظر آتے ہیں۔ تاریخ اسلام اور مسلمانوں کے شاندار ماضی کے حوالے بھی ان کالموں کا حصہ ہیں۔ جسے مصنف کی ماضی پرستی بھی کہا جاسکتا ہے۔

" قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ قاتل جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ پروردگار کے عتاب کا شکار ہوں گے۔ جس نے ایسا کیا ہے تو وہ بھگت لے گا۔ عرب پہلے بھی بھگت رہے ہیں۔" سورۃ النساء ۹۳

اس آیت کی تشریح کے مطابق جو شخص کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے گا تو اس کی سزا جہنم ہو گی اور وہ اس میں ہمیشہ پڑا رہے گا۔ مصنف مزید کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی یہ بھی پیشین گوئی ہے کہ آخری زمانے میں لشکر خراسان سے اٹھیں گے اور دمشق میں یہودیوں کا صفایا کر دیں۔ دوسری طرف سے ترک ان کی مدد کو آئیں گے۔ کئی صدی پہلے خراسان ایک مضبوط اسلامی سلطنت گزری ہے جس کی سرحدیں موجودہ پاکستان، افغانستان، بھارت، ایران، وسط ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک تک پھیلی ہوئی ہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس خطے سے مجھے اچھی یا ٹھنڈی ہوا آتی ہے۔ مصنف اس خطے اور اس کے باسیوں کے بارے میں اور درحقیقت وطنِ عزیز کے متعلق بہت زیادہ پُر امید ہے۔

" کئی صدی پہلے خراسان ایک مضبوط اسلامی سلطنت گزری ہے جس کی سرحدیں موجودہ پاکستان، افغانستان، بھارت، ایران، وسط ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک تک پھیلی ہوئی ہیں۔" (۴۰)

کالم نگار کے خیال میں سبھی انسان خطا کار ہیں لیکن ہر ایک کسی نہ کسی میدان میں کار گر اور کار ساز اور شہسوار بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ، اگر کوشش کی جائے تو جتنی کوئی محنت کرے گا، اس کو اتنا ہی پھل ملے گا۔ اگر ہم اپنے ملک میں اللہ کے قانون پر عمل کریں، اس کے دیے ہوئے قانون کو نافذ کریں تو اللہ تعالیٰ معجزہ بھی دکھا سکتے ہیں۔ کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ اللہ کے آخری رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ ایک آسمانی قانون اگر جاری کر دیا جائے تو یہ چالیس دن کی موزوں مہران بارش کے برابر ہو سکتا ہے۔ ہر حال میں ہمیشہ اللہ کا سب سے بڑا قانون صراطِ مستقیم کی تمنا، تلاش اور کار فرمائی ہے۔

" ابو بکر صدیق کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے یہ حدیث بیان کی، " دجال مشرق (یورپ) کے ایک ملک سے ظاہر ہو گا جس کو " خراسان " کہا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ایسے لوگ ہوں گے جن کے چہرے گویا تہ بہ تہ ڈھال ہیں۔ گوشت سے پر۔" (۴۱)

مندرجہ ذیل کالم میں مصنف نے چراغ سے چراغ روشن کرنے کا عندیہ دیا ہے۔ یہاں ان کی رجائیت پسندی عروج پر نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ استفہامیہ انداز جو ان کے خلوص اور جذباتیت کی عکاسی

کرتا ہے۔ وہ قارئین سے سوال کرتے ہیں کہ اگر ہمارے پاس تمام قدرتی وسائل موجود ہیں، قدرت کی فیاضیوں نے ہمیں نوازا ہے تو ہم ترقی کیونکر نہیں کر سکتے۔

"کچھ اور کامیابیاں ممکن ہیں؟ کیوں نہیں؟ اعلیٰ ترین سطح کا جوہری پروگرام اور میزائل جو ملک بنا سکتا ہے۔ جیٹ جہاز بنا سکتے ہیں۔ بہترین لڑاکا طیارے، جس سے مار گرائے، وہ پائلٹ پیدا کر سکتا ہے جن کا ثانی کوئی نہیں۔ اچھے منتظم اور سیاست دان اس سرزمین پہ کیوں جنم نہیں لے سکتے۔ تعلیم ، صحت، زراعت اور صنعت کاری میں کیوں معرکے برپا نہیں کر سکتے۔"(۴۲)

ان کے بقول، روشن خیالی کی مثال ہے۔ ہم کسی سے کسی طرح بھی کم نہیں پھر ہمیں اپنے زورِ بازو پر بھروسہ کیوں نہیں ہے۔ ہم دوسروں کے سامنے کیوں کاسہ گدائی لیے کھڑے ہیں اور اگر ہم اب نہیں کریں گے تو پھر کب کریں گے۔ بقول اقبال

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے دنیا والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

مصنف کے یوٹوپیا یعنی ان کی مثالی ریاست کا قیام بھی اس وقت ممکن ہو سکے گا جب اہلِ وطن خوابِ غفلت سے بیدار ہوں گے اور پھر اپنے لیے کچھ کرنے کا سوچیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری آج کی بد حالی ،بداعمالیوں اور کوتاہیوں کا نتیجہ ہیں۔ قومیں صدمات سے گزرتی ہیں اور ہمیشہ سے گزرتی آئی ہیں۔ اللہ نے انسان کو بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے بلکہ اس لیے پیدا کیا ہے کہ اس کی آزمائش مطلوب تھی۔ تباہی آزمائش کے اسباب پر ٹھنڈے دل سے غور نہ کرنے اور موزوں نتائج اخذ نہ کرنے سے آتی ہے۔ خوش فہمی آدمی کی فطرت میں شامل ہے۔ کالم نگار کے نزدیک جمہوریت اہلِ برصغیر کے مزاج میں ہی نہیں ہے۔ مغربی جمہوریت کا یہ تصور اہلِ مغرب کا پروردہ اور ان کے مزاج کے مطابق ہے۔

ان ہی خیالات کا اظہار انھوں نے اپنے ایک اور کالم "آئینِ نو" میں ان الفاظ میں کیا ہے:

"ہر معاشرے کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ روایتی پارلیمانی نظام برطانیہ کے لیے سازگار ہے، برصغیر کو نہیں۔ بھارتی پارلیمنٹ کے ایک تہائی سے زیادہ ارکان پر سنگین جرائم کے مقدمات

ہیں۔ ہمارے ہاں نیب کے خلاف بہت واویلا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ سیاسی انتقام کا ذریعہ ہے۔"(۴۳)

مصنف کے نزدیک ہمارا معاشرتی مزاج من حیث القوم جمہوریت سے میل نہیں کھاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اسلام نے خلافت کو بہترین طرزِ حکومت قرار دیا ہے۔ یہاں وہ اقبال کی حمایت کرتے ہیں جنھوں نے جمہوریت کو ایسا طرزِ حکومت گردانا تھا جس میں لوگوں کو گنا جاتا ہے، تولا نہیں جاتا۔ کالم نگار کے مطابق جمہوریت کے باعث ملک میں بد امنی، سفارش اور رشوت جیسی بیماریوں نے جنم لیا ہے جس نے اس ملک کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ اس کالم میں کالم نگار نے حقیقت پسندی سے حالات کا جائزہ لے کر تجزیہ پیش کیا ہے جس کے نتیجے میں جمہوریت کو ملک کے لیے طرزِ حکومت کے طور پر رد کیا گیا ہے۔

دراصل ہر چیز کے اچھے اور برے دونوں پہلو ہوتے ہیں۔ اگر جمہوریت کے ساتھ ساتھ احتساب کا بھی مؤثر نظام ملک میں سرگرم عمل ہو تو سب کو اپنے اختیار اور اپنی حد کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہاں مصنف نے اپنا یوٹوپیا بیان کر دیا ہے یاں یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ رہنما اصول سامنے رکھ دیے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر شاید ہمارے حالات میں سدھار آسکے یا ان کے الفاظ میں، کچھ دنوں میں فردوسِ بریں کا دروازہ کھل جائے کیونکہ یہ مشکل وقت ہے اور اللہ اس قوم پر رحم نہیں کرے گا جو خود پر رحم نہیں کرتی۔

کالم نگار کے نزدیک سب سے اہم چیز ملک کا نظم و نسق اور انتظام و انصرام ہے۔ اگر ملک میں امن و امان کی حکمرانی ہو، قانون کی بات سنی جاتی ہو تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کوئی بھی ملک مثالی ریاست بن سکے۔ ہارون رشید کے اکثر کالموں میں ماضی پرستی نظر آتی ہے جس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ وہ ماضی کے عہد کے عظیم رفقا کو مثالی قرار دیتے ہیں اور موجودہ حکمرانوں کو ان کی تقلید کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان حکمرانوں میں خلیفہ راشدین، شیر شاہ سوری، ظہیر الدین بابر، ہمایوں اور اکبر اعظم شامل ہیں۔ ان کے خیال میں برصغیر کی وسیع مملکت پر حکومت کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ ملکہ صرف مغلوں کو ہی حاصل رہا ہے کہ انھوں نے اتنی ملکیتوں اور مذاہب کے پیروکاروں کو صرف انصاف اور امن کی لاٹھی سے ہانکتے ہوئے ملک کا انتظام و انصرام مثالی انداز سے چلایا۔ وہ لکھتے ہیں کہ، کہا جاتا ہے کہ تاریخ انصاف کرتی ہے، یہ ادھورا سچ ہے کیونکہ اگر شیر شاہ سوری نہ ہوتا تو اکبر اعظم بھی ہمیشہ یاد رہنے والے کارنامے سرانجام نہ دے سکتا۔ اس نے برصغیر میں

پہلی مرتبہ اداروں کا تصور دیا تھا۔ بندوبستِ اراضی کا ڈول اس نے ڈالا تھا۔ کلکتہ سے پشاور تک شاہراہیں اس نے تعمیر کیں۔ بعد میں انگریزوں نے جسے Grand Trunk Road یا GT روڈ کا نام دیا تھا۔ ہزاروں میل لمبی اس شاہراہ پر تین ہزار چوکیاں قائم کیں۔ ہر چوکی پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے بلا تفریقِ مذہب مسافر خانے بنائے جن میں بلا معاوضہ کھانے کا الگ انتظام تھا۔ ڈاک کا محکمہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ تھا۔ شہر تو شہر جنگلوں اور بیابانوں میں تاجروں کے قافلے گزرتے۔ کالم نگار کی رائے کے مطابق مغل بہترین حکمران ثابت ہوئے جنھوں نے ۱۵۲۶ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک برصغیر پر حکومت کی۔ مغل حکومت کا آغاز تو بابر سے ہوا لیکن شیر شاہ سوری نے برصغیر میں پہلی مرتبہ عملی طور پر اداروں کا تصور دیا بندوبست اراضی کے عملے کی بنیاد ڈالی کلکتہ سے پشاور تک شاہراہیں بنائیں جن میں جی ٹی روڈ آج تک بھی قائم ہے۔

ہارون رشید کے اکثر کالموں میں اسلاموٹوپیا نظر آتا ہے۔ دینِ اسلام کے اس زریں دور کی جھلک جب اسلام دنیا میں فاتح کی حیثیت سے داخل نہ ہوا تھا لیکن آقائے دوجہاں کی سیرتِ طیبہ، ان کا بلند عزم اور استقلال اس بات کی گواہی دیتا تھا کہ اک روز ریاستِ مدینہ کے نام پر فلاحی ریاست کا قیام ان کے مبارک ہاتھوں سے عمل میں لایا جائے گا۔ اپنے کالم "ہمیں ان سے کیا واسطہ" میں کالم نگار جنگِ احد میں مسلمانوں کے صبر اور استقامت کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> "ابھی کچھ دیر پہلے کسی نے اُحد کا ذکر کیا اور سیّد الشہدا امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کا تو سرکار یاد آئے۔ اُحد کی شام یاد آئی کہ جیسی شام مدینہ میں کبھی نہ اتری۔ نہ پہلے نہ بعد میں۔ گریہ کی سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی حوصلہ افزائی نہ کی۔ صاحب زادے کا انتقال ہوا تو آنسو بہتے رہے مگر آواز نہیں۔ اس مفہوم کا ایک جملہ ارشاد کیا، غم ہے لیکن ہم صبر ہی کریں گے۔"(۴۴)

گزشتہ کالموں کی طرح اس کالم میں بھی رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید عشق اور ان کی حد درجہ اطاعت نظر آتی ہے جو اُن کے آئیڈیل ہیں۔ مصنف کے مطابق وطنِ عزیز میں اسلام کا قانون نافذ کیا جائے اور ریاستِ مدینہ کی طرز کی ایک فلاحی ریاست قائم کی جائے تو ہمارے ملک کے بیش تر مسائل حل ہو سکیں گے۔ خلافتِ راشدہ قائم کی جائے جس کا دارومدار ہجوم سے زیادہ فرد کی شخصی صلاحیتوں پر ہو۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے لوگ تو پیدا ہونا ناممکن ہیں کیونکہ ان کے ساتھ معجزانہ امداد شامل تھی لیکن اگر ہم اپنے ملک کے ساتھ عمومی طور پر اور ہمارے لیڈران ملک کے ساتھ خصوصی طور پر

مخلص ہوں، اپنے نفع نقصان کو ملک کے نفع نقصان پر ترجیح دیں تو حالات میں بہتری پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر صحیح سمت کی جانب فاصلہ شروع کیا جائے تو منزل دور نہیں۔ اپنے کالم "اعتماد کا رشتہ" میں خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر اسوہ حسنہ کا حوالہ دیتے ہیں جو ان کی بلکہ ہر مسلمان کی آئیڈیل شخصیت ہیں۔

> "برسوں بعد خطبہ حجۃ الوداع کے دن پابندی لگائی۔ آج سے میں سارے سود کو باطل قرار دیتا ہوں۔ سب سے پہلے اپنے چچا عباس بن عبد المطلب کا، عمر بن خطاب نے بوڑھے یہودی کو دیکھا کہ بھیک مانگ رہا تھا۔ تعجب کا اظہار کیا تو اس نے کہا کوئی عزیز راشتہ دار باقی نہیں۔ اس پر جزیہ مشیر بلائے گئے بحث ہوئی فیصلہ ہوا کہ غیر مسلم بھی ریاست کی ذمہ داری ہیں۔"(۴۵)

اس کالم میں اسلاموٹوپیا اور آئیڈیلزم واضح نظر آتا ہے اور وہ مغرب جو آج سے دو صدیوں بعد اس مرحلے میں آپہنچا ہے اور جس کے بارے میں خود اقبال نے کہا تھا کہ جس کا معاشرتی بینکاری کا نظام ہی اس کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہے کیونکہ سود پر نہ کوئی ریاست چل سکتی ہے اور نہ پنپ سکتی ہے اور یہ اسلامی تعلیمات کا خاصہ ہے۔ اسلام نے ایک ایسی ریاست کا تصور دیا ہے جو نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر مسلموں کو بھی تمام سہولتیں فراہم کرتی ہے ایک اسلامی ریاست نہ کہ مذہبی ریاست جو صرف اپنے مذہب کے ماننے والوں کو تحفظ دیتی ہے اور اہلِ مغرب کو آج یہ بات سمجھ آئی ہے کہ No taxation without representation۔

کالم نگار حوالہ دیتے ہیں کہ اس بل کو ۱۷۶۵ء میں نیویارک میں پیش کیا گیا جس کے مطابق حکومت اگر عوام کو سہولتیں فراہم نہیں کرتی تو ٹیکس لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ بات باشعور مغرب کو ۱۵ویں صدی میں سمجھ آئی جب کہ اس کی عملی تصویر حضرت عمرؓ نے پانچویں صدی میں دکھائی۔ یہی کالم نگار کا اسلاموٹوپیا ہے۔ یعنی سرکار اگر عوام کو جواب دہ نہیں ہے تو ٹیکس وصول کرنے کا اختیار بھی نہیں رکھتی۔ جب کہ ان کے مطابق، ہمارے مذہب اسلام اور ہمارے عظیم خلفائے راشدین نے کئی صدیاں قبل ہی یہ ذمہ داری ریاست کے کاندھوں پر ڈال دی تھی۔ ریاست ہر محتاج کی ذمہ دار ہے۔ بارہ سو ٹیکس دہندگان کم از کم ۴۰۰ ارب روپے ٹیکس دیتے ہیں جو حکمران اور طبقہ اشرافیہ ہڑپ کر جاتے ہیں۔ جو کچھ غریبوں کی جیبوں سے نچوڑا جاتا ہے، وہ ضائع ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے عام آدمی ٹیکس دینے سے کتراتا ہے۔ جب اصول سب کے لیے یکساں نہیں ہو گا تو سارا بوجھ غریب کے کندھوں پر ڈالا جائے گا جو پہلے ہی ملکی حالات سے تنگ نظر آتا

ہے۔ اس لیے غریب خیرات دینے کو ترجیح دیتا ہے اور ریاست آئی ایم ایف کے حضور سجدہ ریز ہونے کو اب انصاف پسند حکمرانوں کی جو خلوص کے ساتھ کام کریں۔ اپنے اسلاف کی مثالوں پر عمل کریں۔ افسوس غیر مسلم ہمارے دین کی عظمت اور اس کی تعلیمات پر عمل پیرا نہیں لیکن ہم اپنے مذہب کو عملی طور پر بھول چکے ہیں۔ ہمارا اسلام صرف مسجد و منبر تک محدود رہ گیا ہے اس لیے ہم دنیا میں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ کالم نگار اس ڈسٹوپیا سے نجات کا راستہ بتاتے ہیں کہ اب ہمیں ماضی کی طرف لوٹنا پڑے گا۔

> "گاندھی نے عوام سے خطاب کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا کہ بہترین طرزِ حکومت کی مثال دینے کے لیے اس کے پاس ہندو اساطیر میں کوئی ایسا لیڈر نہیں ہے اس لیے وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مثال دے رہا ہے"۔[۴۶]

اپنے کالم "سونے کے ڈھیر" میں کالم نگار نے دوبارہ ایک عقلی طرزِ عمل کو ترجیح دی ہے اور انقلابی کے بجائے ہوش مندانہ اقدامات کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

> "تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ عسکری غلبے کی بجائے جو آج بھی کارفرما ہے اس مقصد کے لیے سول اداروں کی بالادستی درکار ہے۔ بہت شاندار منصوبہ بندی سے قومی اتفاقِ رائے کے عمل کو شاید زیادہ بہتر انداز میں انجام دیا جا سکتا، تیز تر نہیں کیا جا سکتا۔ اس اثنا میں ایک کے بعد احمقوں کا دوسرا گروہ پھوٹتا رہتا ہے اور خود کو وہ انقلابی کہا کرتے ہیں۔"[۴۷]

مذکورہ بالا کالم میں مصنف نے واشگاف الفاظ میں ملک کی موجودہ صورتِ حال کے متعلق اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ اس نے موجودہ گھمبیر صورتِ حال سے نکلنے کا راستہ بھی دیا ہے۔

ان کے خیال میں ملک کو درپیش موجودہ مذہبی جنونیت اور انتہا پسندی کو ختم کرنے یا اس کو کسی حد تک معتدل کرنے کا سب سے بہترین طریقہ سول حکومت کا قیام ہے۔ دوسرے لفظوں میں عوامی حکومت ہی مسائل کو حل کر سکتی ہے۔ اس لیے جب تک عوامی نمائندے عوام کی سہولت کے ساتھ اس مسئلے کو حل نہیں کریں گے ملک صحیح ڈگر پر نہیں چلے گا۔ مصنف نے اس کالم میں اپنے پسندیدہ طرزِ حکومت کے بارے میں بھی بتایا ہے۔ فوجی طرزِ حکومت اب تک کسی ترقی پذیر ملک میں کامیاب نہیں ہوئی ۔ یہ تو صرف مابعد نوآبادیات (Post colonialism) کی ایک چال ہے۔ بیرونی طاقتوں کے اشارے پر افواج عوام کے حقوق غصب کرتے ہیں اور ان کو اس حد تک زیر کرتے ہیں کہ وہ اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کی جرات تک

نہیں کر سکتے۔ یہ وہ حال ہے جس میں اس نے ایک پرندے کے تمام پر اکھیڑ کر اس کو بے دست و پا اور مجبور و کمزور بنا کر پھر اس کو ایک ایک دانے کے لیے مجبور کر دیا جاتا ہے۔ یہی حال ان استعماری طاقتوں کا ہے۔ یہ پہلے کمزور ممالک کو بے دست و پا کر دیتے ہیں اور پھر I.M.F اور F.A.T.F کی طرح کے اداروں کا مقروض بنایا جاتا ہے یا پھر فوج کے زیرِ تسلط لایا جاتا ہے۔

مندرجہ ذیل کالم میں رومانویت کی فضا نظر آتی ہے جو ہارون رشید کے یوٹوپیا کا بنیادی عنصر لگتا ہے اور اس سے قبل بھی ایک کالم میں حوالہ دیا جا چکا ہے۔

> "بہار کا موسم طلوع ہو۔ ہماری زندگیوں میں صدیوں سے جو کلفت گھلی آتی ہے دھل جائے۔ مدینہ منورہ جیسی اگر نہیں تو پولیس کم از کم مغربی ممالک ایسی ہو جائے، دستک دیں تو عدالت کا قاضی برق رفتاری سے دادرسی کر دے۔ سب نوجوانوں کو روزگار نصیب ہو۔ رعب جمانے والے امریکا کو ہم دھتا بتا تیں، گھور کر بھارت کو دیکھیں تو نریندر مودی کی سٹی گم ہو جائے۔"(۴۸)

یہ مصنف کا یوٹوپیا ہے۔ جس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ دنیا کے نقشے پر ارضِ پاک کے نام سے ایک ایسی مملکت کا وجود جو اگر مدینہ منورہ کے خطوط پر استوار نہ بھی ہو کیونکہ وہ تو ایک غیر انسانی، معجزاتی اور کرشماتی طاقتوں کا کرشمہ تھا لیکن ہمارے سامنے مغربی اقوام کے جو نمونے اور جیتی جاگتی زندہ مثالیں ہیں، ان کی طرز پر ایک مکمل اور خود مختار ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے جو امریکا بہادر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکے جس سے بھارت جیسا ہمسایہ ڈالے جس میں غیرت اور خودداری ہو۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ریاستِ مدینہ جیسی فلاحی ریاست مصنف کے آئیڈیلزم اور تکمیل پسندی کی معراج پر نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ مصنف کی کچھ امیدیں اور آرزوئیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نوکری، آڑھت، وکالت یا کاروبار سے جتنی بھی آمدن ہو ملک کے بہتر مستقبل کے لیے ٹیکس کا ایک دھیلا ادا نہ کرنا پڑے۔ دودھ خالص ہو۔ سبزی، اجناس اور گوشت کی قیمتیں کم ہو جائیں۔ ہمارے تعلیمی ادارے ایسے ہو جائیں کہ دنیا کے لیے قابلِ رشک ہوں۔ بسیں، گاڑیاں اور جہاز وقت پر روانہ ہوں۔ سرکاری دفاتر میں ملازم کام کریں، قوم کا ہر فرد معزز ہو اور شہزادوں کی سی زندگی بسر کرے جو کہ بظاہر ناممکن تو نظر آتا ہے لیکن یوٹوپیائی شرائط بجا طور پر پورا اترتے ہیں۔

بقول احمد ندیم قاسمی:

خدا کرے میرے ارضِ پاک پر اترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو

خدا کرے کہ میرے اک بھی ہم وطن کے لیے
حیات جرم نہ ہو زندگی وبال نہ ہو

یہاں جو پھول کھلے وہ کھلا رہے برسوں
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو

مصنف کے اکثر کالموں میں رومانویت کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ جبکہ یہ کالم تو مکمل شاعری پر مبنی ہے۔ کالم نگار احساس کے دریچوں میں اس ایک لمحے کی خوبصورتی کو محسوس کرتا ہے جو اس کے لیے امر ہو چکی ہے۔ اس ایک لمحے کی یاد اس کے قلب و دماغ میں بھی ہمیشہ جاگتی رہتی ہے۔ کیونکہ ان کے بقول، اس جنتِ گم گشتہ کی خواہش لیے تو انسان اس دنیا میں آیا ہے اور اس دنیا میں بھی اسی کے حصول میں دن رات لگا رہتا ہے۔ تمام مذاہب نے انسان کو اسی بات کی تلقین کی ہے۔ انقلابات برپا ہوئے لیکن شاید ہی کبھی کسی شاعر نے انسان کے اس المیے کو اس طرح بیان کیا ہو گا جس طرح "فردوسِ گم گشتہ" (Paradieslost) کے خالق نابینا شاعر ملٹن نے کیا۔ ملٹن نے اس جنت کی تصویر کھینچی ہے جو انسان نے اپنی کم فہمی کے باعث کھو دی مگر اس جنت کی خواہش کسی طرح نہیں مرتی۔ آدمی کو جس چیز سے محروم کر دیا گیا، اس کی خواہش شدت سے بیدار ہوتی ہے۔ اس کے باطن میں بلکتی رہتی ہے اور یہ خواہش اس کا یوٹوپیا بن کر سامنے آتی ہے۔

کالم نگار کا نقطۂ نظر ہے کہ معاشرے کی تعمیرِ نو سول اداروں کی تعمیر و تشکیل سے ممکن ہو سکے گی۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بات درست ہے کہ پاکستانی فوج کسی طرح بھی امریکی، برطانوی، چینی، فرانسیسی فوج سے کم نہیں۔ وسائل کے فرق کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ اکثر سے بہتر ہیں۔ ایک عام ذہن بھی ادراک کر سکتا ہے کہ اسی طرح کی سول سروس، ایسی پولیس اور بلدیاتی ادارے ہم بھی تعمیر کر سکتے ہیں تو کیوں نہیں کرتے۔ اگر یہ حقیقت مان بھی لی جائے کہ ہمارے سیاست دان نااہل اور کرپٹ ہیں، یہ بھی تو حقیقت ہے کہ جب کبھی فوج

نے اقتدار سنبھالا تو وہ بھی کوئی خاص بہتری یا انقلاب نہ لا سکی۔ اس لیے کسی ابہام کے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کام عسکری قیادت کا نہیں ہے اور جس کا کام اسی کو ساجھے۔ اگر ساری دنیا میں اقوام کا فروغ سول لیڈر شپ کی وجہ سے ہوا ہے تو پاکستان میں کیونکر نہیں ہو سکتا ہے۔ اقتصادی نظم و نسق اور امن و امان کو بہتر بنانے کے سوا فوج کبھی کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکی۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ تمام حکمران بیوروکریسی کو قابو کرنا چاہتے تھے۔ اس کے ساتھ تعلیم کے شعبے میں بھی دن بدن تنزلی ہو رہی ہے۔ ملک کے تمام مایۂ ناز سکالرز اور مصنفین نے ان ٹاٹ سکولوں سے ہی تعلیم حاصل کی تھی لیکن اب لوگ نجی اداروں میں اپنے بچوں کو تعلیم دلواتے ہیں۔ برطانیہ ہی نہیں، سوڈان، سعودی عرب، امارات اور ملائشیا میں بھی پولیس افسر کا تقرر تین سال کے لیے ہوتا ہے۔ برطانیہ میں سزا یاب ملزموں کی شرح ۹۵ فی صد ہے جب کہ پاکستان میں صرف ۵ فی صد تک ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہماری فوج دنیا کی بہترین افواج میں سے ایک ہے۔ پاک فوج کے افسروں کی اکثریت اپنے جوانوں کو اولاد کی طرح عزیز رکھتی ہے۔ افسروں کی شہادت کا تناسب ایک اور بات ہے جو دنیا کی اکثر افواج سے کم ہے۔ ہماری فوج میں کوئی فوجی بھارتی فوج کی طرح خودکشی نہیں کرتا ہے لیکن اس سب کے باوجود بھی حرفِ آخر وہی ہے کہ سیاسی استحکام کے بغیر معیشت کا فروغ ممکن نہیں اور مضبوط معیشت کے بغیر دفاع محض ایک تمنا اور جذبہ تو ہو سکتا ہے، علاج اور مداوا ہرگز نہیں۔

> "کل کے خوارج آشکار تھے اور آج کے بھی لیکن آج ہم جناب عبد اللہ بن عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے راستے پر نہیں، ہم ان کی قوتِ فیصلہ، جرات اور علم کے وارث نہیں رہے۔ ہم نے ان کی راہ ترک کی تو اللہ نے ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیا۔"(۴۹)

اس کالم میں اسلاموٹوپیا کا رجحان واضح نظر آتا ہے۔ کالم نگار کے مطابق رافضی اللہ اور اس کے رسول کی سنت پر عمل کرتے تھ،ے روزے رکھتے تھے، راتوں کو قیام کرتے لیکن وہ آلِ رسول سے بغض رکھتے تھے اور ہمارا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا جب تک رسولِ پاک ﷺ ہمیں اپنی جان، اپنی اولاد سے زیادہ عزیز نہ ہوں گے اور وہ لوگ جو آلِ رسول ﷺ سے بغض رکھتے تھے، ان کی عبادتیں اور ان کی ریاضتیں کسی کام نہ آئیں گی۔

اپنے اس کالم میں آگے چل کر وہ خورشید رضوی کی نعتیہ شاعری کا حوالہ دیتے ہیں جس کی شاعری میں روزِ اول کے ہیجان کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ فردوسِ گم گشتہ کی تصویریں جو کبھی تھیں اور جس کی تمنا

انسان کو بے تاب کیے رکھتی ہے۔ حیات کی خواہش میں جو کبھی یاد آتا ہے، کبھی بھلا دیا جاتا ہے اور اس بھول جانے کا غم، شاموں اور راتوں کی خاموشی میں دل پر دستک دیتا ہے اور دیتا ہی رہتا ہے۔ لسانی افلاس کے اس عہد کی ہی بات نہیں، گزرے ہوئے بے نام زمانوں سے آج تک شاعروں ہی نے حسنِ بیان کے جلال و جمال کو زندہ رکھا ہے۔ ورنہ انسانی لغت گلیوں اور بازاروں میں برباد ہو گئی ہوتی۔ اگر شاعر نہ ہوتے تو ان خوب صورت موسموں، پھولوں اور بادلوں کو کاغذ قرطاس پر کون بکھیرتا، کرۂ خاک اگر چمن زاروں، ندیوں اور دریاؤں سے ہی ہوتا تو اس ویرانے میں زندگی کیسی ہوتی؟ یہ رومانویت پسندی کالم نگار کے یوٹوپیا کا بنیادی عنصر ہے۔

کالم نگار کے نزدیک ریاستِ مدینہ ایک یوٹوپیا تھا لیکن ایک معجزاتی اور کرشماتی اور معجزاتی عہد بھی تھا۔ ان کے مطابق، ایک استثنائی عہد تھا جب سورجِ مدینہ کے آسمان پر چمکتا رہا اور یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ خلوص اور حکمت کبھی رسوا نہیں ہوتے۔ اگر ہمیں صاحبِ فراست وار مخلص حکمران میسر آجائیں تو کچھ بھی ہو سکتا ہے، کوئی معجزہ بھی رونما ہو سکتا ہے۔ اگر آج بھی اورنگزیب عالمگیر جیسے حکمران ہمیں میسر آجائیں جس کے بارے میں اقبال نے فرمایا تھا کہ وہ ہمارے ترکش کا آخری تیر تھا۔ اس کے خطوط پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ دانش و دانائی کا ایک دریا ہے لیکن اس کا المیہ یہ تھا کہ وہ تنہا رہ گیا تھا۔ اچھے حکمران اللہ کا انعام ہوتے ہیں اور برے حکمران قوم کے اعمال کی سزا۔ فرمان رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ہے کہ زندہ معاشرے ہی اچھی حکومت کے مستحق ہوتے ہیں۔ بالالفاظِ دیگر برے حکمران ہماری اپنی بداعمالیوں اور کوتاہیوں کی سزا ہیں۔ مسلم مفکرین بالخصوص امام غزالی کی تعلیمات سے فیض پا کر اور خلیجی جنگوں کی شکست اور ترکوں کے تجربات سے سیکھ کر یورپ تحقیق اور علم کی راہ پر گام زن ہوا ہے۔ سائنس اور جدید علوم کی تشکیل کی۔ صدیوں سے چلے آتے، چرچ کے شکنجے کو انھوں نے توڑا، علم کو رہنما کیا، اجتماعی قیادت کا تصور ابھرا، انھوں نے اسلام کی تعلیمات کو اپنا لیا، صرف اسلام کو نہیں اپنایا اور ہم نے اسلام کو تو اپنا لیا لیکن اس کی تعلیمات کو نہیں اپنایا۔

کالم نگار کے نزدیک قائد اعظم جیسے عظیم لیڈر سے قدرت نے ہمیں نواز لیکن ہم نے ان کی قدر نہ کی۔ ان کا وصف یہ تھا کہ وہ جدید میں قدیم اور قدیم میں جدید تھے۔ انہوں نے نہ جھوٹ بولا اور نہ وعدہ خلافی کی۔ وہ ایک جدید ریاست تعمیر کرنا چاہتے تھے جو سوشلزم اور سرمایہ پرستی کی تاریکیوں میں مثال بن سکے۔ وہ اسلامی اقتصادیات کے حامی تھے۔ مفلسوں کے لیے زکوٰۃ اور صدقات کا دوہرا حفاظتی انتظام اور ایک ایسی ریاست جہاں کاروبار کی مکمل آزادی ہو۔ دنیا نہیں آخرت فقط معاش نہیں اخلاق بھی۔ چودہ صدیاں پہلے وہ

زمانہ جو گزر گیا مگر مسلم اجتماعی لاشعور میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ جاگیر داروں اور صنعت کاروں کو عام لوگوں کا لہو چوسنے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ یہ قرآن ہمارا دستور ہوگا۔ قائدِ اعظم نے بھی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو جواب دیا تھا کہ جمہوریت کا سبق ہم نے چودہ سو سال پہلے سیکھ لیا تھا۔ قائد اعظم ایک بنیاد پرست مولوی نہ تھے اور یوں بھی مذہبی طبقہ بھی زوال کے دور میں عروج حاصل کرتا ہے۔ قائد اعظم سیکولر بھی نہ تھے۔ آج ہمارا المیہ یہ ہے کہ مذہب اور سیاست کو ادنیٰ ترین لوگوں پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ وطن عزیز کو ان لوگوں کی ضرورت ہے جو اقتدار نہیں فقط ملک و ملت کے لیے کام کریں۔ ایسے لوگ کبھی ناکام ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ خلوص اور حکمت کبھی رسوا نہیں ہوتے، راہِ محبت میں پہلا قدم ہی شہادت کا قدم ہوتا ہے۔

> "صنعتی نمو کی یہ سطح بر قرار رہتی تو پاکستانی معیشت آج ملائشیا اور ترکی سے کہیں زیادہ مستحکم اور استوار ہوتی۔ صنعت پھول پھل رہی تھی۔ اصفہانی، آدم جی، سہگل، جعفر برادر، رنگون والا اور افریقا والا برادرز کی قیادت میں ملک تیزی سے ترقی کے راستے پر تھا۔ عالمی پریس میں پاکستان کو ایک مثال کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ ایک صنعتی معیشت (Industrial Paradise) ایک کے بعد دوسری فیکٹری، ایک کے بعد دوسرا کارخانہ لاکھوں ملازمین ہر سال۔"(۵۰)

مذکورہ کالم میں مصنف ماضی پرستی(Nostalgia) کا شکار نظر آتے ہیں۔ انھیں اس وقت کی یاد ستاتی ہے جب پاکستان ایک مثبت اشارے سے ترقی کرنے والا ملک تھا۔ ایک ایسا وقت جب دبئی کے شہزادے گرمی کی چھٹیاں گزارنے پاکستان آیا کرتے تھے، لیکن آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ افسوس اس بات کا ہے کہ ہم نے ترقی کی بجائے تنزلی کا راستہ چن لیا ہے اور اس تنزلی کی وجوہات پر بھی بار بار روشنی ڈالی گئی ہے۔ آج پاکستان خطے کے دوسرے ممالک کا مقابلہ کرنے کے بھی قابل نہیں رہا ہے۔ انڈیا، انڈونیشیا، ملائشیا حتیٰ کہ بنگلہ دیش جو کل ہم سے آزاد ہوا ہے، اس کی معاشی ترقی نے بھی دنیا کے ماہرین اور مبصرین کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ افغانستان نے آج سود سے پاک ۳۴۰ ارب کا بجٹ پیش کر کے فلاحی ریاست مدینہ کی یاد تازہ کر دی ہے بلکہ عملی طور پر اس کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

اسی طرح وہ عمران خان کے تبدیلی کے نعرے سے متاثر نظر آتے ہیں اور یوٹوپیائی انداز میں اس کا برملا اظہار کرتے ہیں:

"بالکل برعکس کپتان نے ایک کے بعد دوسرا کارنامہ انجام دیا ہے۔ الزام تراشی کرنے والے ذاتی مخالفین اور حاسدوں کے سوا کوئی اس کی ذہانت پر شبہ نہیں کرتا۔ وہ ایک عملی آدمی ہے۔ باتیں اور نعرے لگانے کی بجائے وہ کام کرتا ہے۔ کپتان کے حق میں سب سے بڑا عنصر تبدیلی کی بے پناہ تمنا ہے۔ تاریخ کا سبق یہ ہے کہ ایک بار کسی معاشرے میں آرزو جنم لے چلے تو مرتی کبھی نہیں اور فیصلہ صادر کر کے رہتی ہے۔"[۵۱]

اس کالم میں مصنف کا نقطہء نظر رجائیت پسندی (Optimism) کے ساتھ مثالیت پسندی کا (Idealism) بھی ہے۔ عمران خان مصنف کی پسندیدہ شخصیت اور ان کا Icon ہیں۔ جس طرح اسلامی تاریخ سے انھوں نے اپنی پسندیدہ شخصیت کے حوالے دیے ہیں اور انھیں مثال بنا کر پیش کیا ہے، اسی طرح عمران خان کو بھی مصنف ایک تبدیلی لانے والا عنصر یا ایک Gamechanger کے طور پر دیکھتے ہیں۔ جس کے بارے میں وہ یہ امید کرتے ہیں کہ وہ موجودہ منظر نامے میں تبدیلی لا کر ان کا یوٹوپیا تشکیل دے گا۔ اس حوالے سے وہ کافی پُر امید نظر آتے ہیں کہ خاموش اکثریت ان کے ساتھ ہے۔ الیکشن کا اعلان ہونے کے بعد تڑپ کر وہ اٹھیں گے اور پرانی سیاست کو دفن کر دیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ، عمران خان معمولی پس منظر رکھنے والا ایک معمولی سا طالب علم ہے۔ زندگی میں ہر کمال اور عروج کو اس نے اپنی ذاتی محنت اور کاوش کی بدولت حاصل کیا ہے۔ اس کے ساتھ اس کی اضافی خوبی یہ ہے کہ مخلص ہے اور خلوص کا ایک ذرہ بھی خالقِ کائنات ضائع نہیں کرتا۔ عمران کو اس نے جرات بخشی ہے۔ کالم نگار کے خیال میں اخلاقی جرات ناکام ہو ہی نہیں سکتی۔ تقدیر کا مالک جب فیصلہ ہی کر ڈالے تو چیخنے چلانے والے کریں گے کیا، آج تک کوئی بھی برستے بادل اور سورج کی کرنوں کو روک نہیں سکا ہے۔

جہاں تک سوال ہے مصنف کے پسندیدہ طرزِ حکومت کا تو کالم نگار کے مطابق نہ تو جمہوریت ہم لوگوں کے مزاج کی ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہنا درست ہو گا کہ ہم جمہوریت کے مزاج کو سمجھ ہی نہیں پائے ہیں۔ مارشل لا آمریت ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس ملک میں جتنی بھی ترقی ہوتی ہے وہ آمریت کے دور میں ہوتی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ صحافت کو آزادی بھی آمریت میں ہی ملی ہے۔ ہم جمہوریت کو سمجھ نہیں سکے اس لیے جمہوریت جب بھی آتی ہے ملک کا نظم و نسق برباد کر دیتی ہے۔ ایک ہیجان، افراتفری اور کرپشن کا طوفان اپنے ہم راہ لاتی ہے۔ ہر طرزِ حکومت کی طرح جمہوریت کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں لیکن ہم جمہوریت کے آداب کی پروا نہیں کرتے ہیں کیونکہ یہ فقط الیکشن اور اختیار حوالے کرنے کا سوال نہیں

ہے۔ اس کے اور تقاضے بھی ہیں۔ جمہوریت ہمارے ہونٹوں پر تو ضرور ہے مگر دل میں نہیں ہے۔ ہمارے شاہانہ مزاج اس کے مطابق ڈھلتے ہی نہیں ہیں۔ وزیر اعلیٰ، وزیرِ اعظم اور صدر نہیں بلکہ اپنے لیے بادشاہ کا انتخاب کرتے ہیں۔ جن ممالک نے جمہوریت کے ساتھ ترقی کی ہے انھوں نے جمہوریت کے مزاج اور اس کی اصل روح کو سمجھا ہے۔ امریکا کی مثال سامنے ہے۔ اولین عہد کے امریکی صدور کی داستان دیکھیے۔ صرف ابراہیم لنکن ہی نہیں بلکہ سب کے سب نچلے یا درمیانے طبقے سے تھے۔ ریاست ہائے متحدہ میں سیاسی جماعتیں مضبوط جمہوری بنیادوں پر استوار ہیں۔ دو سو برس قبل بھی صدارتی امیدوار کا انتخاب کھلے اجلاس میں کیا جاتا تھا اور کوئی بھی شخص امیدوار کے طور پر کھڑا ہو سکتا تھا۔

یوٹوپیا انسان کی ایک ازلی خواہش ہے اور ایک نفسیاتی رجحان کا نام بھی ہے۔ ایک ایسا رجحان جو فراریت کی انسانی سرشت کی جانب نشاندہی کرتا ہے۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے، دنیا کے کسی بھی خطے سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے جو ادب تخلیق کیا ہے، اس میں یہ رجحان کہیں نہ کہیں ضرور نظر آتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ انسان کی بالعموم اور تخلیق کاروں کی بالخصوص، تکمیل پسندی کی خواہش کا وجود ہے جس کو انگریزی میں Perfctionism کہا جاتا ہے۔ بحیثیت مسلمان ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ مکمل یا Perfect تو صرف خدا کی ذات ہے اس لیے انسان نے اپنی اس جبلت کی تکمیل کے لیے Idealism میں پناہ لی۔ Idealism سے مراد مثالیت پسندی ہے۔ اس سے مراد انسانی زندگی، معاشرے اور شخصیات میں ایسے بت تراشنا ہے جنھیں Icon کہا جاتا ہے اور جن کی پیروی یا تقلید کو زندگی کا مقصد قرار دیا جاتا ہے۔ ایک معیار یا کسوٹی بنا دی جاتی ہے جس پر انسانوں اور معاشروں کو پرکھا جاتا ہے۔ یہی یوٹوپیا تخلیق کرنے کی نفسیاتی وجہ ہے۔ دوسری وجہ انسان کی سرشت ہے؛ ایک جنتِ گم گشتہ کی تلاش۔ مصنف کے بقول، وہ جنت جس سے آدم بڑا آبرو ہو کر نکلا تھا لیکن اس کے ذی شعور میں اس جنت کے حصول کی خواہش اسے بے چین کیے رکھتی ہے۔ اس خواہش نے نمرود و فرعون کو بے چین کیے رکھا اور انھوں نے جنتِ ارضی تراشی لیکن یہ کم فہم اور بے عقل انسان اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ دنیا کے مادی وسائل سے ایک لافانی جنت کی تشکیل کیونکر ممکن ہو سکتی ہے۔ اسی خواہش نے شاعروں اور نثر نگاروں کو برسوں بے چین کیے رکھا اور انھوں نے اپنے تخیل کے پروں پر پرواز کرتے ہوئے اپنی اپنی جنتِ ارضی تخلیق کی جس میں Homer، Illiad، odyssy، Milton اور Wordsworth شامل ہیں۔ کسی حد تک یہ درست ہے کہ ان کی اس جنت سے آج بھی اہلِ دل پڑھ کر لطف اور حِظ اٹھاتے

ہیں۔ مندرجہ بالا شاعروں میں Milton نے اپنے مضبوط تخیل اور حسیات کی بنا پر اس جنتِ گم گشتہ کا نقشہ کھینچا ہے جس کو پڑھ کر قاری واقعی جنت کو دیکھ اور محسوس کر سکتا ہے۔ اردو ادب میں اقبال، فیض اور فراز جیسے شاعروں نے بھی جنت کی تصویر کشی کی ہے۔ اسی جنتِ گم گشتہ کی تلاش نے مختلف مذاہب کے لوگوں کو زمین پر اپنی جھوٹی موٹی جنتیں بنانے پر مجبور کیا ہے لیکن دینِ اسلام نے اپنے پیروکاروں کو اس جنتِ گم گشتہ کے حصول کی اصل راہ سجھائی ہے۔ یہ دنیا فانی ہے اس لیے جنت کا حصول فقط اگلے جنم میں یا بعد از وفات ہی ممکن ہے۔

شاعر، ناول نگار اور افسانہ نگار تو تخیل کی دنیا کے باسی ہیں لیکن کالم نگاروں کا واسطہ حقیقی زندگی اور اس کے مسائل سے پڑتا ہے۔ اس لیے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ کالم نگاروں کے یوٹوپیا کا گزر کسی حد تک حقیقت یا موجودہ حقیقت سے ضرور ہو گا۔ اسی لیے اگر اس بات کو مدِ نظر رکھا جائے تو کالم نگاروں کے ہاں یوٹوپیا کی وہ مثالیں نظر آتی ہیں جن تک رسائی کم از کم انسانی کوشش سے ممکن ہو سکے گی اور وہ اس کو ممکن بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لوگوں کو ایک راستہ دکھاتے ہیں۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو مذکورہ کالم نگاروں کے ہاں بالعموم اور ہارون رشید کے ہاں بالخصوص ان کے یوٹوپیا کی عمارت مندرجہ ذیل ستونوں پر کھڑی نظر آتی ہے۔

۱۔ شخصیت پرستی ۲۔ رجائیت ۳۔ ماضی پرستی

۴۔ اسلاموٹوپیا ۵۔ رومانویت ۶۔ عملی اصلاحات

ہارون رشید کے اکثر کالموں میں شخصیت پرستی یا Idealism نظر آتی ہے۔ اس کے پس منظر میں ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ عظیم لوگ اور عظیم شخصیات قوموں کی زندگیاں بدل سکتے ہیں اور اگر Right man in the right place والا کلیہ کام میں لایا جائے تو انقلابات برپا ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں مصنف سب سے پہلے آقائے نامدار رسولِ اکرم ﷺ کی مثال دیتے ہیں۔ جنھوں نے ریاستِ مدینہ کے نام پر ایک فلاحی ریاست قائم کی تھی۔ اس کے بعد وہ تاریخِ اسلام سے خلفائے راشدین، صحابہ کرام کی مثالیں لاتے ہیں لیکن اس سلسلے میں ان کی ذاتی رائے یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ ایک کرشماتی اور معجزاتی کارنامہ ہے جس کا حصول آج کے دور میں ممکن ہے۔ اس سلسلے میں وہ خورشید ندیم کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ صلاح الدین ایوبی،

شیر شاہ سوری، چنگیز خان اور قائدِ اعظمؒ بھی ان کے Idealilsm کا حصہ ہیں جنھوں نے اپنے اپنے دور میں معجزاتی کارنامے سر انجام دے کر اپنے ملک و قوم کی تقدیر بدل دی اور ملک کو مثالی ریاست میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔

اسی طرح رجائیت پسندی بھی مصنف کی شخصیت اور ان کی کالم نگاری کا ایک اہم ستون ہے۔ یہاں تک کہ ملک کی معاصر صورتِ حال جسے ڈسٹوپیا کہا جاسکتا ہے، کو بیان کرتے ہوئے بھی مصنف رجائیت پسندی کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے بلکہ وہ بہتر مستقبل کے لیے پُر امید ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ نے ہمارے وطن اور قوم کو بہترین وسائل سے نوازا ہے۔ پاکستان کی جغرافیائی حیثیت بہترین ہے۔ ضرورت صرف جذبہ، لگن اور خلوص کی ہے اور جب پُر خلوص حکمران وطنِ عزیز کو میسر آئیں گے جو ملک کو اس بھنور سے نکالنے میں کامیاب ہوں گے تو اس دن یہ ارضِ پاک یوٹوپیا یا جنت اَرضی بن جائے گی۔

ماضی کی آرزو میں مستقبل کو ایک نامکمل وعدے کے طور پر دریافت کیا جاتا ہے اور یہ وہ مقام ہے جب نوسٹلجیا اور یوٹوپیا باہم مدغم ہو جاتے ہیں کیونکہ یوٹوپیا ایک مثالی جگہ ہے اور جب مصنف ڈسٹوپیا جو کسی موجودہ ابتر صورتِ حال کا نام ہے، سے ماضی میں پناہ لیتے ہیں تو یہ یوٹوپیا ہی کی ایک صورت ہے۔ مصنف کے کالموں میں بھی جابجا تاریخِ انسانی سے بالعموم اور تاریخ اسلام سے بالخصوص وہ واقعات اور حالات نظر آتے ہیں جب وہ ان کی رعنائی میں کھو جاتے ہیں اور انھیں مثالی تصور کرتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ اسلامی تاریخ اور بالخصوص خلافتِ راشدہ اور رسولِ اکرم ﷺ کے دور کے واقعات نہ صرف قاری کے جذبۂ ایمانی کو ولولہ انگیز کرتے ہیں بلکہ مصنف کی اسلام سے والہانہ محبت کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ کالم نگار یہ ثابت کرتا ہے کہ اسلام ہی وہ دین ہے جس کے اندر نوعِ انسانی کے تمام مسائل کا حل ابد ازل موجود ہے، جس کی ایک مثال ریاستِ مدینہ جیسی فلاحی ریاست کا قیام تھا۔

یوٹوپیا چوں کہ ایک تصوراتی دنیا ہے اور تصور اور رومان کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے، اس لیے مصنف کی رومانوی دنیا کوئی اور نہیں اپنا وطن ہے۔ کبھی روہی کے صحرا تو کبھی سون سیکسر کے جنگلات کا حسن اور کبھی وہ بالائی علاقوں کو آئیڈیل بنا کر پیش کرتا ہے۔

مصنف نے نہ صرف مختلف کالموں کے حوالے سے ایک مثالی ریاست کا نقطہء نظر دیا ہے بلکہ اس کے حصول کے لیے عملی اقدامات بھی تجویز کیے ہیں۔ جن میں خلوص، قیادت، محنتِ پیہم، تعلیم کے شعبے میں اصلاحت کی ضرورت اور مذہبی میدان میں اچھی ذہنیت رکھنے والے لوگوں کی کمی کے مسائل در پیش ہیں۔ بد قسمتی یہ ہے کہ ہم نے مذہب کو سرِ فہرست کی بجائے پس پشت ڈال دیا ہے۔ جو بچہ کچھ نہیں کر سکتا، اسے مدرسے ڈال دیا جاتا ہے اور اس کا نتیجہ طالبان کی پیداوار ہے۔ علامہ اقبال نے بھی اس طرف توجہ دلائی ہے کہ اگر دین کو سیاست سے جدا کر دیا جائے تو ظلم اور بربریت رہ جائے گی۔

ارشاد بھٹی کی کالم نگاری

معروف صحافی اور تجزیہ کار ارشاد بھٹی ایک Self-made صحافی اور تجزیہ کار ہیں۔ وہ پنڈی بھٹیاں کے قریب چنیوٹ روڈ پر واقع گاؤں مچھونیکا میں پیدا ہوئے۔ جاوید چودھری کو دیے گئے ایک انٹرویو میں انھوں نے اپنے بچپن کے دردناک واقعات سے پردہ اٹھایا ہے۔ دوسرے لوگوں کے برعکس انھوں نے اپنے ماضی کو چھپانے کی کوششیں نہیں کی۔ ان کی والدہ فقط ۳۲ سال کی عمر میں انتقال کر گئی تھیں۔ باپ نے دوسری شادی کر لی اور وہ سوتیلی والدہ کے ظلم و ستم کا شکار بن گئے۔ ان کے بقول وہ بچپن میں اس قدر مسائل سے آشکار رہے کہ آنے والی زندگی میں بھی کبھی فاقے سے یا کسی امتحان سے نہیں ڈرے۔ ان کے پاس سکول کی ایک ہی یونیفارم تھی جس کو انھوں نے کئی سال استعمال کی، اجوتوں کا صرف ایک ہی جوڑا تھا۔ ان کے ہم جماعت جب ایک نان اور روٹی کھاتے تھے تو وہ انھیں حسرت سے دیکھتے ہوئے سوچا کرتے تھے کہ ان کی زندگی میں وہ دن کب آئے گا جب وہ بھی ایسا کھانا کھا سکیں گے۔ وہ اکثر فاقے کاٹتے۔ جب چوتھی جماعت میں تھے تو سکول فیس کی رقم بھی ان کے پاس نہیں تھی۔ اس لیے ان کو ٹافیاں بیچ کر سکول کی فیس ادا کرنا پڑی۔ اسکول میں بیٹھنے کے لیے ان کے پاس بوری نہ تھی، سلیٹ اور قاعدہ تک نہ تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ماں مر جائے اور باپ دوسری شادی کر لے تو پھر بچے بڑے مشکل حالات سے گزرتے ہیں۔ جب وہ میٹرک میں تھے تو ماں نہ ہونے اور گھر میں قدر نہ ہونے کے باعث سب لوگ ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے کہ وہ بھی میٹرک پاس کر جائے گا لیکن ان کے نتیجے نے سب کو حیران کر دیا۔ ان کے تمام ہم جماعت فیل ہو گئے اور صرف وہی کامیاب ہو سکے۔ ان کے ایک کزن نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور وہ انھیں لاہور لے آئے۔ وہاں مختلف کام کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ اس دوران انھوں نے ریڑھی بھی

لگائی اور فٹ پاتھوں اور بنچوں پر راتیں گزاریں۔ اس کسمپرسی کو دیکھ کر پھر انھوں نے فیصلہ کیا کہ اسلام آباد چلا جاؤں کیونکہ وہاں پر میری اس قابلِ رحم حالت کا ناظر تو کوئی نہ ہو گا۔ وہ بتاتے ہیں کہ جب میں اسلام آباد آیا تو میری جیب میں صرف ۱۵۰ روپے تھے۔

ارشاد بھٹی کے کالموں میں یوٹوپیا:

ارشاد بھٹی نے کالم نویسی کا آغاز ۲۰۱۷ء میں روزنامہ جنگ سے کیا تھا اور اب تک روزنامہ جنگ کے مہمان کالم میں مختلف سیاسی و سماجی موضوعات پر کالم تحریر کرتے ہیں۔

جاوید چوہدری کی طرح ارشاد بھٹی کے ہاں بھی مغرب اور اس کے طرزِ حکمرانی کو مثالی قرار دیا جاتا ہے۔ ایک کالم میں ان کا یہ نقطۂ نظر واضح ہے۔

> "یورپ، امریکا، برطانیہ کی جمہوریتیں دیکھ کر رشک آئے، ان کی جمہوریت پسند قیادت دیکھ کر رشک آئے، یہاں اس جمہوریت کی فرسٹ کاپی بھی نہیں۔"(۵۲)

ارشاد بھٹی کا آئیڈیل کا جمہوری یوٹوپیا مغرب کی جمہوریت ہے جس کے بارے میں ہارون رشید کا بھی یہ خیال ہے کہ جمہوریت مغرب کے مزاج کا حصہ ہے۔ یہ ان کی تراشیدہ اور ان کی ایجاد کردہ ہے۔ اس لیے ہمارے ہاں تو جمہوریت کبھی پنپ ہی نہیں سکی، کیوں کہ ہم نے جمہوریت کے مزاج کو سمجھا ہی نہیں ہے۔ ارشاد بھٹی کے مطابق بھی ہمارے ہاں جمہوریت تب ہی کامیاب ہو سکے گی جب اسے اصول، منطق اور اخلاقیات پر کھڑی جمہوریت پسند قیادت نصیب ہو گی۔ کالم نگار نے اپنے ایک کالم میں جمہوریت کی چار اقسام گنوائی ہیں جو ہمارے ملک میں کامیاب ہوتی ہیں۔ جس میں پہلی قسم یوٹرن کی حکومت ہے جس میں آپ اپنی سہولت کے مطابق اپنے بیانات اور لائحہ عمل کو تبدیل کر لیتے ہیں۔ جس کی مثال وہ عمران خان کی حکومت کو قرار دیتے ہیں۔ دوسری قسم جو اب تک ہمارے ملک میں پائی جاتی رہی ہے، وہ ہے اشتہاری حکومت جسے مغرور حکومت بھی کہا جاتا ہے۔ جب بھی وطن پر کوئی مشکل وقت آتا ہے تو یہ جمہوریت پچھلی گلی سے نکل جاتی ہے۔ تیسری قسم کو فالودے والی جمہوریت کہا جاتا ہے جس کی برکت سے فالودے والے، باہر والے یا پھیری والے کروڑ اور ارب پتی بن جاتے ہیں اور چوتھی ہے جو جیتے، اس کے ساتھ کی جمہوریت۔ اس جمہوریت میں مفاد پرست ٹولہ جیتنے والے کے ساتھ مل جاتا ہے۔ کالم نگار نے ملک میں موجود جمہوریتوں کی

صورت حال بنانے کے بعد ڈسٹوپیا کا ذکر کیا ہے لیکن اس ابتر صورتِ حال میں بھی وہ پُر امید نظر نہیں آتا ہے۔ اس لیے وہ مغربی ممالک کی مثال دیتے ہیں کہ اگر ہم ان کی مثال کو سامنے رکھیں تو اس معیار کے مطابق ملک میں جمہورت کو ترویج دے سکتے ہیں۔

ارشاد بھٹی کے اکثر کالموں میں اسلام اور اسلامی طرزِ حکومت کی طرف مثبت جھکاؤ بھی نظر آتا ہے۔

> "عمران خان نے فرمایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دورانِ جنگ اپنے سپہ سالار خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو تبدیل کر دیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پاکستان سے بھی بڑی سلطنت کے حاکم امیر المؤمنین تھے لیکن ان کا عدل ایسا تھا کہ جرم ثابت ہونے کو بیٹے کو کوڑے مارے۔"(۵۳)

دیگر منتخب کالم نگاروں کی طرح ریاستِ مدینہ ان کا بھی آئیڈیل یا ان کا یوٹوپیا ہے۔ ان کے مطابق، ریاستِ مدینہ کا یوٹوپیا ہر مسلمان کا خواب ہے لیکن اس کے لیے آپ کو اپنی ذات کے اندر تبدیلیاں لانی پڑیں گی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، "اگر فرات کے کنارے کتا بھی بھوک سے مرے تو ذمہ دار میں ہوں لیکن کیا وہ وزیر اعظم سے یہ سوال کر سکتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح ایک رات بھی جاگ کر گلی محلوں میں پھر کر اپنی رعایا کی خبر گیری کی ہے کہ وہ کس حال میں ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہر عہدے دار عہدہ سنبھالتے ہوئے اپنے اثاثے ظاہر کرتا تھا لیکن ہمارے وزیر اعظم کی حکومت نے ایسا نہیں کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کبھی سرکاری خرچ پر روزانہ دفتر سے گھر اور گھر سے دفتر ہیلی کاپٹر پر نہیں آئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے خاندان کے کسی بھی فرد نے بیت المال کے ملکیتی کسی اونٹ، گھوڑے، خچر کا ذاتی استعمال نہیں کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کبھی کوئی ایسا قانون پاس نہیں کیا اور نہ قانون میں کوئی ایسی ترمیم نہیں کی ہے جس کی مدد سے وہ اپنے دوستوں کو مالی فائدہ پہنچا سکے۔ کالم نگار کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پیروی ہمارے حکمران نہیں کر سکتے ہیں کیوں کہ ان کی شخصیت ایک معجزاتی اور کرشماتی نمونہ تھی۔ ان کی تربیت اور ان کے حالات وواقعات مثالی تھی لیکن ہم اپنے عظیم قائد کی پیروی تو کر سکتے ہیں۔ ان کے کردار و افعال ہمارے سامنے مثالی ہیں جنھوں نے اپنے پسند کے باورچی کو اس لیے فارغ کر دیا تھا کہ ایک غریب ملک کا گورنر جنرل اس قدر عیاشی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اپنے اس کالم میں مصنف نے ملک کو ریاستِ مدینہ کی طرز پر استوار کرنے کے لیے کچھ عملی اقدامات کا ذکر کیا ہے۔ مزید یہ کہا ہے کہ اگر ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پیروی کریں تو ریاستِ مدینہ کے طرز کی ریاست قائم

ہو سکتی ہے جس کی مثال اس وقت کے وزیر اعظم عمران خان اپنی تقاریر میں تو بارہا دیا کرتے ہیں لیکن اس کے لیے انقلابی اور عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔

> "اس سال گندم ریکارڈ ساز، گنے کی پیداوار توقعات سے زیادہ، تعمیراتی کاروبار اور اس سے جڑے ۳۲ شعبوں میں تیزی، خوشی یہ بھی ہے کہ اس سال بیرونِ ملک پاکستانیوں نے ریکارڈ پیسہ بھجوایا۔ اسٹاک ایکسچینج سمیت معاشی اشاریوں میں بہت بہتری، ایف بی آر کی وصولی ۱۴ فی صد بڑھی۔ دعا یہی ہے یہ سب اچھی باتیں کاغذوں، دعووں تک ہی نہ رہیں ان کے اثرات عوامی زندگیوں میں بھی آئیں۔"(۵۴)

کالم نگار کے یوٹوپیا کا دوسرا بنیادی ستون آئیڈیلزم ہے۔ اس کے ساتھ اس کی رجائیت پسندی جو تمام مثبت انداز اور خواب دیکھنے والوں کا بنیادی وصف ہوتی ہے۔ کالم نگار ملک کے مستقبل کے بارے میں کافی پُر امید نظر آتے ہیں۔ معاشی ترقی کے مثبت اشارے بہتر مستقبل کی طرف نشاندہی کرتے ہیں جو مصنف کے یوٹوپیا کی جانب ایک قدم ہے اور اس سلسلے میں وہ حکمرانوں کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ یہ وقت بہت قیمتی ہے۔ اگر انھوں نے کچھ حاصل کرنا ہے تو اب Do or Die کی پالیسی اپنانی پڑے گی۔ ورنہ بقول شاعر اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں۔ اب باتیں کرنے کا نہیں بلکہ کچھ کر کے دکھانے کا وقت ہے۔

وہ اس سلسلے میں دعا گو بھی ہیں کہ جو کچھ حکومت کر رہی ہے، وہ سچ ثابت ہو مگر ان کے بقول، دکھ کی بات یہ ہے کہ حقیقت ہو یا سیاست ہمارا نظام ایسا مضحکہ خیز ہے کہ ہم سچ اور جھوٹ میں فرق کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کیا جائے جس میں نہ تو اقربا پروری ہو، نہ رشوت خوری اور نہ سفارش۔ کالم نگار بھی تھامس مور (Thomas Moor) اور یوجین اونیل (U-Gen-o-Neil) کی طرح ایسے عملی اقدامات یا دوسرے لفظوں میں اصلاحات کی تجاویز دیتے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر ملک کو ایک مثالی ریاست یا یوٹوپیا بنایا جا سکے۔

> "ذرا سوچیے جو بائیڈن چاہتے دو چار جگاڑ لگا کر اربوں کما سکتے تھے۔ بیٹے کا علاج سرکاری خرچ پر کروا سکتے تھے۔ کوئی ارب کھرب پتی دوست بھی علاج کا خرچہ اٹھا سکتا تھا۔ ان کی امریکا، برطانیہ، یورپ، دبئی میں آف شور کمپنیاں، جائیدادیں ہو سکتی تھیں۔"(۵۵)

جو بائیڈن مصنف کی مثالی ریاست کا مثالی حکمران ہے۔ مصنف کے بقول، اس کے پاس رشوت اور سفارش کے ان گنت مواقع تھے۔ وہ ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا باپ چمنی ساز تھا۔ محنت مزدوری کر کے اور حالات کی ستم ظریفی کا سامنا کرتے ہوئے وہ اس مقام تک پہنچا ہے۔ زندگی کے کسی بھی موڑ پر قسمت نے اس کی دادرسی نہیں کی لیکن اس کے باوجود وہ ہمت نہیں ہارا۔ ۷۸ سال کی عمر میں وہ دنیا کی سپر پاور کا صدر بنا جب کہ ہمارے ملک میں اس طرح کسی غریب کا ترقی کرنا اور اوپر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس نظام کی پیداوار ہے جس میں رشوت کا رواج نہیں ہے اور دوسری بات وہ جس ملک میں رہتا ہے، اس میں خود سے زیادہ ملک کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اپنے ملک اور اپنی قوم سے جھوٹ اور فراڈ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا بلکہ عزتِ نفس اور اپنی ساکھ ہر چیز سے برتر اور محترم ہوتی ہے۔ بائیڈن پر جب ایک برطانوی سیاست دان کی تقاریر کا اقتباس چوری کرنے کا الزام لگا تو اس نے خود کو سیاست سے الگ کر لیا کیوں کہ وہ ایک زندہ قوم کا زندہ نمائندہ ہے۔

> "صاحب! کیا خوب صورت نظام ہے جمہوریت، امریکا، برطانیہ، یورپ میں جمہوریت دیکھ کر روح تک پھیل جائے تاثیر جمہوریت کی مگر صاحب ہم پر مسلط کردہ یہ جمہوریت، پہلے تو یہ جمہوریت نہیں، جمہوریت کی نقل بھی نہیں۔"(۵۶)

مصنف نے علامتی طریقے سے بدیسی آقاؤں کو مخاطب کیا ہے۔ ان کو اس بات کا احساس دلایا ہے کہ وہی جمہوریت جو آپ کے لیے اس قدر باثمر ثابت ہوتی ہے، یہی نہیں ہمارا پڑوسی ملک بھی اس کے ثمرات سے مستفید ہو رہا ہے لیکن وہ کون سی وجوہات ہیں جس کے باعث ہمارے ہاں یہ جمہوریت بانجھ ثابت ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ آمریت کے خمیر سے جنم لینے والی یہ جمہوریت لولی لنگڑی اور بانجھ ہو سکتی ہے۔ ایک ایسی جمہوریت جس کے نتائج ہمارے خود کے مرتب کردہ نہیں ہوتے۔ ایک کٹھ پتلی جمہوریت، کہا جاتا ہے کہ لولی لنگڑی جمہوریت بھی آمریت سے بہتر ہوتی ہے۔ اور Democracy is the best revenge لیکن بدلہ لینے والے خود اس جمہوریت سے مستفید ہو رہے ہیں اور عوام کے لیے صرف حکمرانوں یا دوسرے لفظوں میں چہروں کی تبدیلی ہے۔ اس کالم سے ظاہر ہے کہ کالم نگار کا ووٹ جمہوریت کے حق میں ہے۔ وہ آمریت اور فوجی استبداد کے خلاف ہیں لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان حالات میں یہ بھی آمریت کی ایک بدلی ہوئی شکل نظر آتی ہے۔

"کبھی کسی نے سوچا تھا ۵ سو سال بعد غرناطہ میں اذانیں گونجیں گی، بی بی سی ریڈیو پر اذانیں گونجیں گی، جمعہ کے خطبے نشر ہوں گے، ٹرمپ قرآن سنے گا؟ کبھی کسی نے سوچا تھا امریکا، برطانیہ، یورپ میں شرعی فیصلے ہوں گے؟ کبھی کسی نے سوچا تھا کہ ٹرمپ سورہ فاتحہ کا ترجمہ پڑھے گا، آسمانی خدا سے معافی مانگے گا؟"(۵۷)

مذکورہ کالم میں کورونا کے بعد دنیا کی صورت حال کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مصنف کی اسلام سے محبت بھی نمایاں ہے۔ مصنف کے خیال میں دنیا کے قانون (Global Word Order) میں کوئی بڑی تبدیلی آنے والی ہے۔ یہ قدرتی آفات انسانوں کے لیے آزمائش کے ساتھ ساتھ ایک اعلان ہیں اور ایک آذان ہے کہ امن اور سلامتی صرف دین اسلام کے اندر ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ سپر پاور صرف خدا کی ذات ہے جس کے سامنے سب بے بس ہیں اور جس نے سب کو اپنے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مصنف اس بارے میں کافی پُر امید نظر آتے ہیں اور اس کی وجہ ان کے نزدیک ناممکن کا ممکن ہونا ہے۔ اس کی وجہ ٹرمپ کا اظہارِ شکست ہے اور اس بات کا اقرار کہ کوئی تو ہے جو نظامِ ہستی چلا رہا ہے۔ دن بدن ہونے والی موسمیاتی تبدیلیاں ایک بڑی اور خطرناک تبدیلی کی جانب اشارہ کر رہی ہیں۔ ایسی تبدیلی جس کا وعدہ ازل سے کیا گیا ہے۔ مصنف کو مستقبل میں تمام دنیا پر اسلام کی حکومت نظر آ رہی ہے کیونکہ یہ تبدیلیاں اس کی طرف واضح اشارہ کر رہی ہیں۔

وہ استفہامیہ انداز میں لکھتے ہیں کہ، کبھی کسی نے یہ سوچا تھا کہ ایک کورونا وائرس معیشت، معاشرت، تجارت، میل ملاپ، رشتے ناتے، تعلق مزاج اور رویے سب کچھ بدل ڈالے گا؟ دنیا کے طاقت ور لوگ اس چھوٹے نہ نظر آنے والے کیڑے کے ڈر سے خود کو گھروں میں مقید کر لیں گے؟ اپنے معمولاتِ زندگی کو بدل ڈالیں گے؟ تاریخ خود کو دہرا رہی ہے۔ خدائی کا دعویٰ کرنے والا نمرود ایک چھوٹے سے مچھر سے ہلاک ہو گیا، فرعون دریا برد ہو گیا۔ مٹے نامیوں کے نشان کیسے کیسے۔ تبدیلی کا اشارہ ہو رہا ہے۔ ایک نئی دنیا، ایک نیا نظام آنے والا ہے۔ محمد ﷺ کے وفاداروں کا، ان کے غلاموں کا، دنیا کو بدلنے والا۔ موت سے نہ ڈرنے والے لوگ یقیناً کوئی تبدیلی لائیں گے کیونکہ دنیا امید پر قائم ہے۔

علاوہ ازیں رومانیت بھری فضا کے ذریعے بھی وہ اپنے کالموں میں ایک یوٹوپیائی فضا پیدا کرتے ہیں۔ ترکی کی سیر سے متعلق اپنے ایک کالم میں لکھتے ہیں:

"دل خوش، دماغ پر سکون، یہ مشن ناممکن کے ممکن ہونے کا سکون اور خوشی، استنبول میں چار دن کیا نہ کیا، میٹرو میں بیٹھا، کم گہرے سمندر میں کشتی چلائی، میزی نما جہاز میں بیٹھ کر ایشین استنبول، یوبین استنبول کے درمیان دو گھنٹے مرمر سمندر کی سیر کی"۔(۵۸)

مصنف کا یہ کالم ترکی کی رومان پرور فضا میں تحریر کیا گیا ہے۔ انھوں نے ترکی کی فضا کی رنگینیوں اور دل فریبی کو الفاظ میں ڈھالا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ترکی کے شان دار ماضی کا ذکر بھی مذکورہ کالم میں ملتا ہے۔ کالم نگار اس وقت کا ذکر کرتے ہیں جب استنبول رومن سلطنت کا دارالخلافہ تھا پھر مسلمانوں نے اس پر قبضہ کیا۔ ۱۴۵۳ء میں اس کا نام اسلامبول رکھا گیا، جس کا مطلب تھا: اسلام کا گھر۔ یہاں کے پُر سکون ماحول نے کالم نگار کو بہت روحانی خوشی سے سرشار کر دیا۔ دوسری بات جو ان کے نزدیک ترکی کے حوالے سے متاثر کن ہے، وہ یہ ہے کہ یورپ کے یہ مردِ بیمار اپنی زبان میں سب کام کرتے ہیں۔ یہ ہماری طرح انگلش کے محتاج نہیں ہیں۔ کالم نگار کے مطابق انھیں جتنی ترکی آتی تھی وہاں کے لوگوں کو اتنی انگریزی آتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے بقول، یہ ہم سے تو کہیں بہتر ہیں۔ ہم تو اغیار کی زبان پڑھ کر نہ اِدھر کے رہے اور نہ اُدھر کے۔

اپنے اس ایک اور کالم بہ عنوان "گندم سستی آٹا مہنگا" کا آغاز کالم نگار اپنے اور اس وقت کے وزیرِاعظم کے خوابوں اور ان کی تکمیل کے منصوبہ جات سے کرتے ہیں۔ کالم کا آغاز یوٹوپیا یا تصوراتی انداز سے کیا گیا ہے جس کے بعد حقیقت نگاری اور ڈسٹوپیا کو بیان کیا گیا ہے۔

"مجھے یاد ہے پچھلی ملاقات کے دوران میں نے وزیرِاعظم سے پوچھا: "کوئی ایسے تین کام جو ایک ملک کے لیے کرنا چاہتے ہیں؟" بولے، "پاکستان کو سرمایہ کاری کا مرکز بنانا، صنعت و حرفت کا عروج اور چین کی مدد سے زراعت میں انقلابی تبدیلیاں لانا۔"(۵۹)

مصنف کے بقول یہ لوگ خوابوں کے سوداگر ہیں۔ نہ صرف کالم نگار بلکہ حکمران بھی خواب بیچتے ہیں۔ لوگوں کی نفسیات سے کھیلتے ہیں اور پھر عوام جب خواب سے بیدار ہوتے ہیں تو ان کو اسی مخدوش صورتِ حال اور حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کالم نگار نے کالم کے اختتام پر پڑوسی ملک ہندوستان کی صورتِ حال پیش کی ہے جو ہماری طرح ایک زرعی ملک ہے۔ لیکن زراعت اس کی اولین ترجیح ہے۔ انھوں نے زراعت اور کاشت کاروں کی صورتِ حال کو بہتر بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اس کے نتائج بھی دنیا

کے سامنے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد ان ۷۰، ۲۷ سالوں میں ہندوستان نے اپنی زراعت کو اس قدر بہتر بنایا ہے کہ آج وہ نہ صرف خود کفیل ہے بلکہ جنوبی ایشیا کی بہتر ریاستوں کو زرعی اجناس فراہم کرتا ہے۔ زراعت جس کو معیشت کی ریڑھ کی ہڈی کہا جاتا ہے، اس نے ہندوستان کی معیشت کو بھی بہتر بناتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان بھی اگرچہ مکمل طور ملک طور پر تو نہیں لیکن معاشی اور زرعی لحاظ سے مصنف کا یوٹوپیا ہے۔ کیونکہ اگر ملک مستحکم (Stable) ہو گا تو لوگوں کو روزگار ملے گا اور غربت کا خاتمہ ہو گا۔

ایک اور کالم میں دوسرے ملک کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ، ازبکستان کے صدر کی بیٹی کے خلاف حزبِ اختلاف نے بدعنوانی اور کرپشن کے الزامات عائد کر دیے تو آفرین ہے اس مرد پر کہ اس نے اپنے ذاتی اختیار کو رستے کی آڑ بنا کر اپنی بیٹی کو بچانے کی کوشش ہر گز نہ کی بلکہ اپنی اس ناخلف بیٹی کو انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کیا۔ وہ خود اس بات کا صدمہ لے کر ۲۵ سالہ اقتدار کے بعد ۲۷ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اُدھر صدر نے آخری سانسیں لیں، اِدھر گلنارا کے احتساب کا عمل تیز تر ہو گیا۔ تحقیقات کا دائرہ وسیع تر ہوا۔ کرپشن، منی لانڈرنگ، فراڈ کے ثبوت ملے، خاندان والوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ یہاں تک کہ باپ کے قریبی ساتھی پیچھے ہٹے۔ گلنارا نے حکومت کو ایک ارب ۲۰ کروڑ ڈالر دے کر رہائی کی درخواست کی۔ اپنے انسٹاگرام پیغام میں گلنارا نے قوم سے معافی مانگتے ہوئے کہا کہ مجھے معاف کر دیں، میں نے آپ کو مایوس کیا۔

> "تھوڑی سی توجہ، کہانی اپنی اپنی لگے گی۔ جانی پہچانی سی کہانی۔ شروع کرتے ہیں اسلام کریموف سے، ثمر قند قبیلے سے، یتیم خانے سے پلے بڑھے کمیونسٹ پارٹی کے فرسٹ سیکرٹری سے، پارٹی پر قبضہ کیا، روس لوٹا، بروقت چالیں چلیں، ازبکستان کو آزاد کروا کر فادر آف نیشن کہلوایا۔ یہ اس صدر کی کہانی جس نے قوم کو آزادی کی نعمت دلوائی۔ وہ بابائے قوم تھے اور اگر چاہتے تو قوم اس کی بیٹی کے ایک گناہ کو اس آزادی کے بدلے معاف کر سکتی تھی لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ کیوں کہ وہ ایک زندہ قوم کے زندہ رہنما تھے اور زندہ قومیں مفادات پر سمجھوتا نہیں کیا کرتیں۔"(۶۰)

اسی کالم میں آگے چل کر کالم نگار اپنے ملک کی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہیں کہ وزیرِ اعظم نے کہا کہ "کابینہ نے مجھے روکا مگر مجھے نواز شریف پر رحم آگیا۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ یاد آ گئے۔ فرمایا: جو ریاست مجرموں پر رحم کرتی ہے، وہاں بے گناہ بے رحمی سے مرتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ اس کالم میں ان کی مثالیت پسندی یا Idealism بھی سامنے آتی ہے۔ اسلامی تاریخ میں ان کے آئیڈیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں جن کا ذکر وہ بار بار اپنے ان کالموں میں کرتے نظر آتے ہیں۔ اپنا ایک کالم وہ ان کے فرمودات اور ارشادات کے حوالے کے ساتھ شروع کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ، اگر آج ہم اپنی ریاست پر اسلام کے قوانین کو نافذ کر دیں گے ریاستِ مدینہ کی طرز کی ریاست قائم کریں گے جس میں انصاف کا بول بالا ہو گا۔، قانون کی حکمرانی ہو گی، کسی کے حقوق سلب نہیں ہوں گے تو ایک مثالی ریاست قائم ہو سکے گی۔ ایک ایسی فلاحی ریاست جس میں غریب کو دو وقت کی روٹی ملے گی۔ مظلوم کو انصاف میسر آئے گا، بے کس اور لاچار کی دادرسی ہو گی۔

اسی طرح اپنے ایک اور کالم میں کالم نگار ازبکستان کے صدر سلمان کریموف کی مثال دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ، ازبکستان جس کو آزاد ہوئے ابھی کچھ عرصہ ہی ہوا ہے لیکن اس میں اسلامی تعلیمات اس قدر راسخ ہیں کہ وہ مصنف کی آئیڈیل ایک مثالی شخصیت بن گئے۔ مصنف کے خیال میں ایک مثالی حکمران، ایک مثالی ریاست کا قیام عمل میں لا سکتا ہے۔ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا تو پھر بھی مثبت سمت کی جانب ایک قدم تو اٹھا سکتا ہے۔ مگر بات پھر وہی کہ ۷۰ سال میں زراعت سے انڈسٹری تک، نہری نظام سے دریاؤں تک، پی آئی اے سے اسٹیل مل تک، جنگلوں سے ریگستانوں تک ملک سے قوم تک، معاشیات سے اخلاقیات تک، زمین پر ہر شے کا تیل نکال کر اب زیر زمین تیل کی باتیں۔ وہ وقت دور نہیں جب ہم زیر زمین کا تیل نکال کر ہواؤں، خلاؤں کی باتیں کر رہے ہوں گے۔ ان خیالات کا اظہار مصنف نے اپنے کالم "باتوں کے دھنی" مشمولہ مورخہ ۸ اپریل ۲۰۱۹ء کو کیا تھا۔ یہ وہ خواب اور وہ یوٹوپیا ہے جس کا اظہار ہر حکمران اپنے دورِ حکومت میں کرتا رہا ہے اور اپنے خوابوں کی سوداگری کرتے ہیں۔ گزشتہ ستر سالوں سے ہمارے غریب عوام کے ساتھ یہی دھوکا دہی ہو رہی ہے۔ ان کے خوابوں کی سوداگری کر کے ان کو غریب بنایا جا رہا ہے اور یوں ان کے یوٹوپیا کی تذلیل کی جا رہی ہے۔ ان کے بقول، کبھی آٹا چینی اور بجلی سستی ہونے کے خواب دکھائے جاتے ہیں، ملک کو قرضوں کے بوجھ سے نکالنے کا مژدہ سنایا جاتا ہے، ریگستانوں کو گلستانوں میں تبدیل کرنے کا عندیہ دیا جاتا ہے۔ ایک کروڑ نوکریوں کا جھانسا دیا جاتا ہے تو کبھی ریاستِ مدینہ جیسی فلاحی ریاست کا منصوبہ عوام کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ زراعت کو ترقی دینے اور کاشتکاروں کو سہولیات دینے کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ کھاد اور دوسری سہولیات دینے کا وعدہ کیا جاتا ہے لیکن یہ سب کچھ صرف وعدوں اور خوابوں تک محدود ہوتا ہے۔

غریب عوام کے جذبات سے کھیلا جاتا ہے، ہر پارٹی اور حکمران کا اپنا پلے کارڈ ہوتا ہے، کوئی روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ لگا کر غریب عوام کو بے وقوف بناتے آئے ہیں تو کوئی ملک میں صنعتی انقلاب لانے کا خواہش مند نظر آتا ہے اور کوئی زرعی میدان میں معرکے اور معجزے سرانجام دینے کا وعدہ کرتا ہے لیکن یہ سب صرف اور صرف وعدوں اور خوابوں تک ہی محدود رہتا ہے۔ عملی زندگی میں ایسا کچھ نظر نہیں آتا ہے۔ یہ سب انسان کی اس فطرتی خواہش کا مذاق اڑاتے ہیں جس کے تحت انسان ازل سے اپنے لیے آسودگی کی تلاش میں تھا۔ اس کے یوٹوپیا کا طنز اڑاتے ہیں، اپنے مفاد کے لیے لوگوں کی خواہشات سے کھیلتے ہیں اور اپنی دکان چمکاتے ہیں، ان کے خوابوں کی سوداگری کرتے ہیں۔

جہاں کالم نگار کے اکثر کالموں میں Utopia نظر آتا ہے، وہیں پر ماضی پرستی کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ وہ ماضی کے ان خوب صورت لمحات کو یاد کرتے ہیں جب ان کی زندگی ہر قسم کے فکر و فاقے سے آزاد تھی۔ بچپن کے خوب صورت لمحات ہر شخص کی زندگی کے لیے یادگار ہوتے ہیں اور ایک تخلیق کار کے لیے جو زیادہ محسوس کرنے والا ہوتا ہے۔ وہ ہر دکھ اور ہر غم کو ایک عام شخص کی نسبت زیادہ محسوس کرنے والا شخص اپنے گزرے ہوئے دنوں کو یاد کرتا ہے اور زندگی میں دوبارہ ان کو لانے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ گاؤں کی صاف ستھری فضا، لہلہاتے کھیت، بچپن کے دوست ساتھی، مدرسہ اور کھیل کے میدان وہ سب جگہیں جہاں انھوں زندگی کے حسین لمحات اور شب و روز گزارے تھے۔ مصنف ان سب دنوں کو چشمِ تصور میں لاتے ہیں اور دوبارہ سے اپنے بچپن میں جانے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔

> "اسلام آباد کا موسم پھر خوشگوار، صبح بارشیں، دوپہر بادلوں بھرا، شام خنکی بھری، دھند پھر سے، پنڈ یاد آرہا ہے، پتا نہیں موسم خوشگوار ہو، ڈوبتا سورج دیکھ لوں، چڑھتے سورج پر نظر پڑ جائے، پنڈ کیوں یاد آئے، مٹی کی کشش نے بچپن کی یادیں کچھ تو ہے، دیکھوں تو پنڈ میں کچھ نہ رہا، کچھ گاؤں کی صبح نے بھی ہم کو نہ پکارا۔"[۶۱]

اس کالم میں سب سے دکھ دینے والی بات یہ ہے کہ کالم نگار کو اب وہ سب کچھ نظر نہیں آتا ہے۔ وہ سب کچھ جو اس گاؤں میں ان کے ساتھ لازم و ملزوم تھا اور جس کے بغیر وہ زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن اب جب اسلام آباد سے لاہور تک وہ رستے میں اپنے گاؤں گھڑی بھر کے لیے رکتے ہیں تو ان سب

چیزوں کو نہ پا کر دلبر داشتہ ہوتے ہیں اور اپنے ماضی کو یاد کرتے ہیں۔ یہاں ناسٹلجیا اور رومانویت پسندی کا عنصر نمایاں ہے۔

مزید اس کالم میں وہ مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی عظیم شخصیات کا حوالہ دیتے ہیں جن میں دلیپ کمار، شاہ رُخ خان اور من موہن سنگھ شامل ہیں جو اپنی جائے پیدائش کا دورہ کرتے ہوئے نہایت جذباتی ہو گئے تھے کیونکہ وطن سے محبت انسان کی فطرت میں بلکہ جبلت میں شامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہمارے نبی اکرم ﷺ کے سامنے جب بھی مکہ مکرمہ کا ذکر ہوتا تو فرطِ جذبات سے ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے تھے۔ انسان اپنی زندگی میں مگن ضرور ہو جاتا ہے لیکن ماضی کی وہ خوب صورت صبح و شام و بھلا نہیں سکتا۔ مصنف کے ہاں ماضی پرستی کے ساتھ ساتھ رومانیت پسندی کا بھی رجحان پایا جاتا ہے۔ کالم نگار اپنے وطن پرستی کے جذبات کو ان شخصیات سے منسوب کرکے آسودگی محسوس کرتے ہیں۔

۱۱ فروری ۲۰۱۹ء کو مہمان کالم میں شائع شدہ کالم بہ عنوان "کہاں سے لائیں اچھی باتیں" میں کالم نگار موجودہ صورت حال کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

> "ابھی تک معجزہ، کرامت کیوں نہیں، کہاں ہے نیا پاکستان، ریاست مدینہ، سستا فوری انصاف، معاشی چمتکار کیوں نہیں ہو رہا۔ لٹی دولت کیوں نہیں واپس آ رہی ہے؟" [۶۲]

کالم نگار ملکی حالات سے مایوس ضرور ہیں لیکن ایک امید کا سہارا ہے کہ شاید حالات بہتر ہو جائیں کیونکہ ان کے بقول، جھوٹی امید بھی زندگی کے لیے ضرری ہوتی ہے۔ ہر وقت مایوسی پھیلانا درست نہیں ہوتا ہے۔ گو کہ کالم نگار کا نقطہ نظر رجائیت پسندانہ ہے لیکن ان حالات میں اچھی باتیں کرنا بھی مجذوب کا خواب اور دیوانے کی بڑ کے مترادف ہے۔ اس لیے کالم کے اختتام میں کہتے ہیں کہ ان حالات میں اچھی باتیں کیونکر ہو سکتی ہیں!

کالم نگار کے چند ایک کالموں میں رومانیت پسندی کا عنصر بھی نظر آتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی وہ ایک حقیقت پسند نقطۂ نظر رکھنے والے شخص ہیں جو زندگی گزارنے کے لیے منطق اور دلیل کی راہ کو اپنانے کی تلقین کرتے ہیں۔ دوسرے کالم نگاروں کے برعکس ان کے ہاں Optimism کا بھی فقدان نظر آتا ہے۔ یہ درست ہے کہ مغربی ترقی یافتہ ممالک اور ریاست مدینہ ان کا یوٹوپیا ہے اور وہ اس نہج پر اپنے ملک کو ترقی دینے

کے خواہاں ہیں۔ مزید ان کی مثالیں بھی جا بجا ان کے کالموں میں نظر آتی ہیں لیکن ملک کی موجودہ صورتِ حال سے بھی کچھ زیادہ مطمئن اور پُر امید نظر نہیں آتے ہیں اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ موجودہ صورتِ حال میں اصلاحات کی ضرورت ہے۔ ان کے نزدیک، اس ملک کو ایک عملی نقطہء نظر اور انقلابی اقدامات کی ضرورت ہے۔ ان کے مطابق، اگر آپ زندگی میں کچھ بننا چاہتے ہیں تو ریل کا انجن نہیں بننا کیونکہ یہ اپنا راستہ نہیں بدلتا ہے۔ زندگی میں کچھ دینے والے نہیں، لینے والے بنیں۔ نپولین بوناپارٹ اپنی تمام تر فتوحات اور بادشاہت کے باوجود زندگی کے آخری دنوں میں کہہ رہا تھا کہ میں دنیا کا وہ بدنصیب ہوں جسے پوری زندگی میں خوشی بھرے دو دن نصیب نہ ہوئے۔ جب کہ دوسری طرف بصارت سے محروم ہیلن کیلر آخری دنوں میں بھی کہہ رہی تھی کہ میرے پاس پریشان ہونے کا وقت ہی نہیں کیونکہ خدا نے مجھے جو دیا ہے یہ اتنا کہ اس سے فرصت نہ ملی کہ سوچوں کہ میرے پاس کیا نہیں ہے۔ صبر، قناعت اور شکر کا وہ درس جو ہمیں ۱۴۰۰ سال قبل اپنے نبی حضرت محمد ﷺ سے ملا تھا، اس کی عملی تعلیمات آج اغیار کے قول و فعل میں نظر آتی ہیں۔ لیکن ہم نے ان ہی چودہ سو سالوں میں اتنا اغیار کو فتح نہیں کیا، جتنا ایک دوسرے کو فتح کر لیا ہے۔ مسلمانوں نے دنیا کا ۹۵ فی صد علاقہ اسلامی عروج کی پہلی صدی میں فتح کر لیا تھا۔ اس کے بعد ساڑھے تیرہ سو سال اس علاقے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ بغل گیر ہوتے رہے۔ ہم نے دنیا کو کوئی ایجاد نہیں دی۔ مسلمان آج یہودیوں اور عیسائیوں کی بنائی ہوئی چیزوں کو استعمال کر کے ان کی بربادی کی تعبیریں بناتے ہیں۔ ہم ایک اللہ کے ماننے والے، ایک قرآن پڑھنے والے اور رحمۃ اللعالمین کے امتی ایک نہیں۔ کب ہم کفر، قتل کے فتوؤں اور نفرتوں کو چھوڑ کر درگزر، صبر اور محبت بھری زندگیاں گزاریں گے؟ کب یہ سمجھ پائیں گے کہ رسول ﷺ سے محبت کا مطلب تو ان کی سنت کی پیروی کرنا ہے۔ وہ رسول جو رحمۃ اللعالمین تھے، جنھوں نے دشمنوں سے پتھر کھا کر بھی ان کو دعائیں دی ہیں، وہ رحمۃ اللعالمین جنھوں نے فتح مکہ پر دشمن کے گھر کو دارالامن بنایا۔ جنھوں نے جنگوں میں عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا تھا۔ جنھوں نے غیر مسلموں کی لاشیں بگاڑنے سے روک دیا، وہ رحمۃ العالمین جنھوں نے جانوروں پر ظلم کرنے اور پھل دار درخت کاٹنے سے منع فرمایا۔ ہم کب ان کی سنت پر عمل پیرا ہوں گے؟!

اس خواہش کے پردے میں مصنف کے اسلاموٹوپیا کی جھلک واضح نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ حقیقت پسندی کا عنصر بھی نمایاں نظر آتا ہے اور کہیں کہیں رومانویت پسندی کے عناصر کا رجحان بھی کالموں

میں نظر آتا ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی وہ ایک روشن خیال کالم نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں جو ملک کے مستقبل کے بارے میں اچھے خواب دیکھتے ہیں اور اپنے قارئین کو بھی دکھاتے ہیں۔

اپنے ایک کالم "سب کچھ یقین ہے" میں ان کا اسلامو ٹوپیا واضح نظر آتا ہے۔ وہ تاریخ اسلام سے مثال دے کر مسلمانوں کے جذبہ ایمانی کو یوں گرماتے ہیں:

> کاش سب یہ جان جاتے کہ جس نبی پر اللہ درود بھیجے، اس نبی کو بھی یتیمی اور غریبی سے گزرنا پڑا، رات کی تاریکی میں گھر چھوڑا اور طائف اور احد میں زخمی ہونا پڑا لیکن ہر مشکل کا ثابت قدمی سے مقابلہ کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ درس دے گئے کہ بالآخر فتح اسلام کی ہو گی۔"[۶۳]

بحیثیت مجموعی کالم نگار حقیقت پسندانہ سوچ رکھنے والے ہیں البتہ ان کے کالموں میں رومانویت پسندی اور اسلامو ٹوپیا کے عناصر کی جھلک بھی نظر آتی ہے اور وہ ایک ایسے سماج کا خواب دیکھتے ہیں جو ریاستِ مدینہ جیسا ہو۔

جاوید چوہدری کے کالموں کے تجزیاتی مطالعے سے یہ واضح ہے کہ ان کے یوٹوپیا کے تین بنیادی اجزاء ہیں۔ اول ذکر وہ اسلام کو ریاست کے بنیادی مسائل کا حل مانتے ہیں۔ آئیڈیل ریاست کی تشکیل کے لیے آئیڈیل حکمران ضروری ہیں۔ ان کی آئیڈیل شخصیات میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، معراج خالد اور مارگریٹ تھیچر جیسی شخصیات سرفہرست ہیں جنہوں نے اپنے عمل سے ملک کی تقدیر بدل ڈالی۔

ہارون رشید کے کالموں کے تجزیاتی مطالعے سے یہ بات واضح ہے کہ ان کے نزدیک ایک مثالی ریاست کا تصور ناقابل حصول ہے لیکن ایک بہتر معیار زندگی کے حصول کی کوشش بہر حال کی جانی چاہیئے۔ جاوید چودھری کی طرح وہ بھی ایک مثالی ریاست کی تشکیل کو ایک مثالی حکمران کے بغیر ناممکن قرار دیتے ہیں۔ یوٹوپیا کی مثال میں وہ کبھی اسلام کے درخشاں ماضی کو لاتے ہیں تو کبھی ریاست مدینہ کو ایک مثالی ریاست کا درجہ دیتے نظر آتے ہیں وہ اپنے اکثر کالموں میں مثالی ریاست کی تشکیل کے لیے حکمرانوں کو عملی اصلاحات تجویز کرتے نظر آتے ہیں۔

حوالہ جات

1. MacDonald, L (1993), “Early origins of Social Sciences”, MC Gill-Queen’s, Press- MQUP, P.250
2. Babar Javed, “Social Utopia: A Study of Perfect Socio Political Setup”, by University of Gondar, International Journal of Research, Jan 2014, P.72
3. Sahgal, G (2006), Legislating Utopia, Violence against women: the sipuated Politics of Belonging, Retrieved from http:IIbooks:goggle
4. A.J.M Mine “The Social Philosophy of English Idealism” Routledge Library Editions, 1989, P. 230

۵. جاوید چودھری، زیرو پوائنٹ ا، ایٹم بم کھودیں گے، علم و عرفان پبلشرز، الحمد مارکیٹ، ۴۰۔ اردو بازار لاہور، اکتوبر ۲۰۰۹ء

۶. جاوید چودھری، زیرو پوائنٹ ا، "پرائم منسٹر سیکرٹریٹ"، علم و عرفان پبلشرز الحمد مارکیٹ ۴۰، اردو بازار لاہور اکتوبر ۲۰۰۹ء، ص ۸۳

۷. جاوید چودھری، زیرو پوائنٹ ا، "احتجاج نہ احتساب"، ایضاً، ص ۸۰

۸. جاوید چودھری، زیرو پوائنٹ ا، "طیفا بدمعاش"، ایضاً، ص ۶۸

۹. جاوید چودھری، زیرو پوائنٹ ا، "جنرل دیپک کپور کو بھی میڈل دیں"، ایضاً، ص ۲۴

۱۰. جاوید چودھری، زیرو پوائنٹ ا، "اللہ کا ہاتھ" ایضاً، ص ۳۶

۱۱. جاوید چودھری، زیرو پوائنٹ ا، مہاتیر کے ساتھ ملاقات"، ایضاً، ص ۴۷

۱۲. جاوید چودھری، زیرو پوائنٹ ۴، حیات بھی مختصر ہے، الحمد مارکیٹ ۴۰، ایضاً، ص ۷۶

۱۳. جاوید چودھری، زیرو پوائنٹ ۴، علم و عرفان پبلشرز اردو بازار لاہور، اکتوبر ۲۰۰۹ء، ص ۵۰۴

۱۴. جاوید چودھری، زیرو پوائنٹ ۴، علم و عرفان پبلشرز، اردو بازار لاہور، اکتوبر ۲۰۰۹ء، ص ۵۰۴

۱۵. جاوید چودھری، زیرو پوائنٹ ۴، "میراث "علم و عرفان پبلشرز، ایضاً، ص ۶۰۷

۱۶. جاوید چودھری، زیرو پوائنٹ ۲، "کامی کازی" علم و عرفان پبلشرز، اردو بازار لاہور، اکتوبر ۲۰۱۰ء، ص ۱۴۸

۱۷. جاوید چودھری، زیرو پوائنٹ ۲، "پاگلوں سے بچائیں"، ایضاً، اکتوبر ۲۰۱۰ء، ص ۲۱

۱۸. جاوید چودھری، زیرو پوائنٹ ۲، ایضاً، ص ۶۳

۱۹. جاوید چودھری، زیرو پوائٹ ۲، مہاتیر کے ساتھ ایک ملاقات، ایضاً، ص ۴۷

۲۰. ایضاً

۲۱. جاوید چودھری، زیرو پوائٹ ۲،، ص ۳۰

۲۲. جاوید چودھری، زیرو پوائٹ ۲، " انصاف دوکان یا فیکٹری میں ہوتا، علم و عرفان پبلشرز الحمد مارکیٹ، اردو بازار لاہور، اکتوبر ۲۰۱۰ء، ص ۳۰

۲۳. جاوید چودھری، زیرو پوائٹ ۲، شاید اسی کو طاقت کہتے ہیں، ایضاً، ص ۲۸۹

۲۴. جاوید چودھری، زیرو پوائٹ ۲، امن و امان، ایضاً، ص ۹۵

۲۵. جاوید چودھری، زیرو پوائٹ ۲، کوے کے انڈوں سے بچے نکلنے کا انتظار، ایضاً، ص ۱۴۶

۲۶. جاوید چودھری، زیرو پوائٹ ۳، واقعی آمریت ایک طرح سے سوچتی اور فیصلہ کرتی ہے، علم و عرفان پبلشرز الحمد مارکیٹ ۴۰، اردو بازار لاہور، اکتوبر ۲۰۰۹ء، ص ۱۹۵

۲۷. جاوید چودھری، زیرو پوائٹ ۳، دیوار چین، ایضاً، ص ۲۵۴

۲۸. جاوید چودھری، زیرو پوائٹ ۳، "ہوٹل اور مسجد"، ایضاً، ص ۶۷

۲۹. جاوید چودھری، زیرو پوائٹ ۳، " تلوار سے پہلے " ایضاً، ص ۹۶

۳۰. جاوید چودھری، زیرو پوائٹ ۵، اصل سکندر اعظم، ایضاً، ص ۴۲

۳۱. جاوید چودھری، زیرو پوائٹ ۵، عدل بھی مومن کی کھوئی ہوئی میراث ہے، ایضاً، ص ۶۵

۳۲. جاوید چودھری، زیرو پوائٹ ۵، کالم نگار کی تجاویز، ایضاً، ص ۶۰

۳۳. ہارون رشید، "ناتمام"، روزنامہ دنیا، لاہور، ۱۳ اپریل ۲۰۱۹ء

۳۴. ہارون رشید، "ناتمام"، ذوق عمل، روزنامہ دنیا لاہور ۲۳ مارچ ۲۰۱۹ء

۳۵. ہارون رشید، کالم "ناتمام"، آئینہ خانہ، روزنامہ دنیا، لاہور، ۱۹ فروری ۲۰۱۹ء

۳۶. ہارون رشید، کالم "ناتمام"، فردوس بریں۔ روزنامہ دنیا، لاہور، ۲۰ مارچ ۲۰۱۹ء

۳۷. ہارون رشید، کالم "ناتمام"، بھولے بسرے زمانے، روزنامہ دنیا، لاہور، ۲۷ مارچ ۲۰۱۹ء

۳۸. ہارون رشید، کالم "ناتمام"، اٹھو گرنہ حشر نہ ہو گا پھر بھی، روزنامہ دنیا، لاہور، ۷ مارچ ۲۰۱۹ء

۳۹. ہارون رشید، کالم "ناتمام"، تاریخ کے سبق، ۱۹ اپریل ۲۰۱۹ء

۴۰. محمد بن یزید، ابن ماجہ سنن ابن ماجہ، ترجمہ عطاء اللہ محمد ساجد، ۴۰۹-۴۳۷ ۴۲، ص ۴۰۷۲

۴۱. رفعت اللہ اورکزئی، دولت اسلامیہ اور خراسان کا استعارہ، ۱۷ستمبر ۲۰۱۴ء، ص ۵۶

۴۲. ہارون رشید، کالم "ناتمام"،، اک چراغ اور چراغ اور چراغ، روزنامہ دنیا، لاہور، ۱۹مارچ ۲۰۱۹ء

۴۳. ہارون رشید، کالم "ناتمام"،، آئین نو، روزنامہ دنیا، لاہور، ۵ جنوری ۲۰۱۹ء

۴۴. ہارون رشید، کالم "ناتمام"، ہمیں ان سے کیا واسطہ، روزنامہ دنیا، لاہور، ۲۵اپریل ۲۰۲۲ء

۴۵. ہارون رشید، کالم "ناتمام"، اعتماد کا رشتہ، روزنامہ دنیا، لاہور، ۳فروری ۲۰۲۲ء

۴۶. ہریجن اخبار، ۱۹۴۷-۰۷-۲۷، دہلی

۴۷. ہارون رشید، کالم "ناتمام"، سونے کے ڈھیر، ایضا، ۱نومبر ۲۰۱۸ء

۴۸. ہارون رشید مہمان کالم، روزنامہ دنیا، فروری، ۲۰۲۱ء

۴۹. ہارون رشید، کالم "ناتمام"، کل اور آج کے خوارج، ایضاً، ۱۴ستمبر ۲۰۱۸ء

۵۰. ہارون رشید، کالم "ناتمام"، بت پرستی، ایضاً، ۱۲مارچ ۲۰۲۲ء

۵۱. ہارون رشید، کالم "ناتمام"، اسی ہزار، ایضاً، ۹دسمبر ۲۰۲۱ء

۵۲. ارشاد بھٹی، مہمان کالم، جمہور لیس جمہوریتیں، روزنامہ جنگ، لاہور، ۱۵نومبر ۲۰۲۱ء

۵۳. ارشاد بھٹی، مہمان کالم، روزنامہ جنگ، لاہور، ۱۲اکتوبر ۲۰۲۱ء

۵۴. ارشاد بھٹی، مہمان کالم، ایک ٹکٹ میں دو مزے، روزنامہ جنگ، لاہور، ۳۱مئی ۲۰۲۱ء

۵۵. ارشاد بھٹی، مہمان کالم، صدارت اپنے پاس رکھوں گا، روزنامہ جنگ، لاہور، ۹نومبر ۲۰۲۰ء

۵۶. ارشاد بھٹی، مہمان کالم، صاحب اپنے پاس رکھو اپنی جمہوریت، روزنامہ جنگ، لاہور، ۱۴ائی ۲۰۲۰ء

۵۷. ارشاد بھٹی، مہمان کالم، کورونا کورونا کر دی، روزنامہ جنگ لاہور، ۲۷اپریل ۲۰۲۲ء

۵۸. اارشاد بھٹی، مہمان کالم، روزنامہ جنگ، لاہور، جون ۲۰۱۹ء

۵۹. ارشاد بھٹی، مہمان کالم، گندم سستی آٹا مہنگا، روزنامہ جنگ، لاہور، ۱۲دسمبر ۲۰۱۹ء

۶۰. ارشاد بھٹی، مہمان کالم،، ازبکستانی گلنارا سے پاکستانی گلنارا تک، روزنامہ جنگ، لاہور، ۱۰جولائی ۲۰۱۹ء

۶۱. ارشاد بھٹی، مہمان کالم، کچھ گاؤں کی صبح نے بھی ہم کو نہ پکارا، روزنامہ جنگ، لاہور، ۱۴مارچ ۲۰۱۹ء

۶۲. ارشاد بھٹی، مہمان کالم، مہمان کالم، کہاں سے لائیں اچھی اچھی باتیں، روزنامہ جنگ، لاہور، ۱۱ فروری ۲۰۱۹ء

۶۳. ارشاد بھٹی، مہمان کالم، سب کچھ یقین ہے، ایضاً، ۶ جنوری ۲۰۱۷ء

باب چہارم:

منتخب فکاہی کالموں میں یوٹوپیا کے رجحان کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ

موک یوٹوپیا یا فکاہی یوٹوپیا کو انگریزی ادب میں سوفٹ کے نام سے جانا جاتا ہے موک یوٹوپیا کے تناظر میں فکاہی کالم نگاروں عطاء الحق قاسمی اور منو بھائی کے کالموں کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے گا۔

فکاہیہ کالم نگاری

فکاہیہ کالم نگاری سے مراد اخبار میں لکھے گئے وہ مخصوص کالم ہیں جن میں کالم نگار روزمرہ کے سیاسی و سماجی معاملات کو شگفتہ یا مزاحیہ انداز میں بیان کرتا ہے۔

موضوعات کے ساتھ ساتھ کالم نگار کے اسلوب میں مزاح یا ظرافت کی چاشنی کا ہونا ضروری ہے۔

کالم نگار کا نقطۂ نظر عام طور پر تنقیدی ہوتا ہے لیکن تنقید نگار کی طرح اس کی تنقید کڑوی کسیلی نہیں ہوتی بلکہ اس میں مزاح اور لطف کا عنصر موجود ہونا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ کالم کی ایک اور خوبی اختصار ہے کیوں کہ طویل بحث، فکر اور اسلوب کی چاشنی کو ختم کر دیتی ہے۔ پاکستان کی صحافت کا جائزہ لیا جائے تو فکاہیہ کالم نگاری کی ذیل میں مولانا عبدالمجید سالک، مولانا چراغ حسن حسرت، حاجی لق لق، مجید لاہوری، عطاء الحق قاسمی اور منو بھائی وغیرہ کے نام سامنے آتے ہیں۔

اردو صحافت میں فکاہیہ کالم نگاری کی تاریخ تقریباً ایک صدی پر محیط ہے۔ یہ سچ ہے کہ صحافت میں فکاہیہ کالم نگاری کی اہمیت ہمیشہ سے مسلم تھی لیکن آج کے دور میں اس کے بغیر صحافت کا تصور ممکن نہیں ہے۔ کالم نگار اخبار کی کامیابی کی ضمانت ہوتے ہیں۔ فکاہیہ کا ماخذ عربی کا لفظ، فکاہ ہے جس کے معنی ظرافت، خوش دلی اور خوش طبعی کے ہیں۔ اسلوب کے ساتھ ساتھ فکاہیہ کالم نگاری کے لیے موضوعات کی بھی کوئی خاص قید نہیں ہوتی ہے بلکہ زندگی سے وابستہ تمام موضوعات ان کالموں کے موضوعات بن سکتے ہیں۔ فکاہی کالم کا مقصد اصلاحِ معاشرہ ہے۔ اس لیے کالم نگار کا موضوع اور اسلوب کا انتخاب احتیاط کا متقاضی ہوتا ہے۔

فکاہیہ کالم نگاری کے مطابق شفیق جالندھری اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"فکاہیہ کالم میں طنز و مزاح کے ذریعے قارئین کو تفریح اور دلچسپی کا سامان باہم پہنچانے کا مقصد پورا کیا جاتا ہے۔ کالم نویس رمز و کنایہ، موزانہ، مبالغہ، لفظی کاریگری اور تعریض وغیرہ کے حربے استعمال کرتا ہے۔ تازہ واقعات و مسائل اور زندگی کی اونچ نیچ سے مضحکہ خیز پہلو تلاش کر کے انہیں نمایاں کیا جاتا ہے۔"(۱)

دوسرے کالموں کی طرح فکاہیہ کالم بھی قاری کو معلومات بہم پہنچاتے ہیں کیوں کہ فکاہیہ کالم کو محض لطیفہ گوئی کے لیے استعمال کرنا اس کے مقاصد میں شامل نہیں ہے۔ الفاظ کا استعمال ازراہِ تفنن نہیں ہونا چاہیے۔ اسی لیے یہ تصور کیا جاتا ہے کہ فکاہیہ کالم تحریر کرنا نثر نگاری اور شاعری سے بھی مشکل ادبی فریضہ ہے۔ کیوں کہ فکاہی کالم میں کالم نگار الفاظ کو اپنے لفظی معنی میں استعمال نہیں کرتا بلکہ وہ اس سے دوہرے تہرے مطلب اخذ کرتا ہے۔ اس لیے فکاہی کالم نگار کے لیے علم لسانیات کے ساتھ علمِ نفسیات کا ماہر ہونا ضروری ہے۔ اس کو زبان پر مکمل دسترس اور عبور ہونا چاہیے۔ اشاروں اور رمزوں میں دل کی بات کھلے بندوں کرنے کا فن آنا چاہیے تاکہ پڑھنے والے کو بُرا نہ محسوس ہو اور مقصد بھی حاصل ہو جائے۔

دوسرے کالم نگاروں کی طرح فکاہی کالم نگار کا مقصد بھی معاشرے میں موجود برائیوں اور جرائم کی نشاندہی کرنا ہے اور نہ صرف نشاندہی کرنا ہے بلکہ ایک محتاط اور شگفتہ اندازے سے ان کا قلع قمع کرنے کا راستہ بھی بتلانا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ فکاہی کالم نویس اپنے شگفتہ کالموں کی مدد سے ایک طرف تو قارئین کی تفننِ طبع کا باعث بنتا ہے۔ ان کو تفریح طبع کے لیے سامان فراہم کرتا ہے تو دوسری طرف روز مرہ کے مختلف مسائل اور معاشرے میں ہونے والی بے اعتدالیوں کا بھی پردہ چاک کرتا ہے۔ کالم نگار کو الفاظ کے برتاؤ کا طریقہ آنا چاہیے کیوں کہ الفاظ اور ان کے معنی کا ایسا اثر انگیز انتخاب جن کو پڑھ کے قاری معلومات کے ساتھ لطف بھی اُٹھاتا ہے اور تحریر کی شگفتگی اور انداز خود مزاح کا باعث بنتاہ۔ ور بعض اوقات اسی شگفتہ اور ہلکے پھلکے انداز میں معصومیت کے پردے میں گہری اور کڑوی کسیلی بات بھی کر جاتا ہے جو عام حالات میں ناگوار محسوس ہو سکتی ہے۔ لیکن فکاہیہ کالم نگاری یہ کالم نگار میٹھی کونین (Sugar Coated quimine) قارئین کو دیتا ہے جو ان کی طبیعت پر گراں بھی نہیں گزرتا اور اس کے ساتھ ساتھ مصنف کا مقصد بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ فکاہی کالم تحریر کرنا ہر کالم نگار کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے کالم نگار کے مزاج اور طبع میں لطافت کے عنصر کا ہونا لازمی ہے۔ لیکن ایسا اعلیٰ درجے کا مزاح شعوری

کوشش سے پیدا نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ ایک فطری صلاحیت ہے۔ صحافت کے برعکس کالم نگار کو جب کوئی موضوع، واقعہ یا فکر اس قدر متاثر کرتا ہے تو وہ ادبی انداز میں اس پر تبصرہ کرتا ہے اور پھر بات سے بات نکالنے کا فن بھی کالم نگار کی خداداد صلاحیتوں پر منحصر ہے۔ اس کے خمیر میں ان جراثیم کا موجود ہونا ضروری ہے۔ بالکل ایسے جیسے شاعر پیدا ہوتا ہے، اکتسابی کوششوں سے نہیں بن سکتا۔ اس کی نگاہ دور بین میں معاشرے میں موجود خفیہ ترین مضحک پہلو بھی آجاتے ہیں۔

فی زمانہ فکاہیہ کالم کا مقصد نہ صرف قہقہے بکھیرنا ہے بلکہ ڈھکے چھپے انداز میں اصلاحِ معاشرہ ہے۔ یہ فکاہیہ کالم نگاری کا بنیادی مقصد ہے کیوں کہ کوئی بھی ادب بغیر مقصد کے تخلیق نہیں کیا جاتا ہے۔ بے مقصد ادب اپنی اہمیت کھو دیتا ہے لیکن مزاح نگار کا کام مشکل ہو جاتا ہے۔ اسے دو تلواروں کے بیچوں بیچ اپنا راستہ ہموار کرنا پڑتا ہے۔ حقیقت پسندی اور علامت نگاری کے بیچ اپنے دل کی بات کہنا اور دوسروں کو اس پر قائل کرنا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ زبان پر عبور بھی اشد ضروری ہے۔ کالم نگار کو ایسی زبان استعمال کرنی چاہیے جس میں نفرت، عداوت اور تعصب کی ترشی کے بجائے ہم دردی کو فروغ دیا جائے۔ فکاہی کالم نگار کسی بھی صورت میں ذاتیات میں الجھ کر کسی کی دل آزاری نہیں کرتا۔ کالم نویس اصلاحِ معاشرہ کا فریضہ تو بجا طور پر انجام دے ہی رہا ہوتا ہے لیکن اس دوران وہ معاشرے کے مسائل کو علامتی انداز سے چھیڑتا ہے اور اس طرح وہ قارئین کو الفاظ کے نئے معانی سے آشنا کرتے ہوئے ان کو درپیش مختلف مسائل کی طرف بھی توجہ دلاتا ہے۔

فکاہی کالم نگاری کی تکنیک

سنجیدہ موضوعات کے مقابلے میں فکاہیہ کالم اپنے منفرد اسلوب اور انداز کی وجہ سے دوسرے کالموں سے مختلف ہوتا ہے۔ فکاہی کالم میں طنز و مزاح کی مدد سے قارئین کو معلومات اور تفریح بیک وقت مہیا کی جاتی ہیں۔ اس لیے کالم نویس مختلف تحریری حربے مثلاً رمز و کنایہ، معازنہ، مبالغہ، لفظی بازی گری اور تعریض کو استعمال میں لاتا ہے۔ فکاہی کالم نویس اپنے موضوعات کو بیان کرنے کے لیے مختلف ادبی و لسانی تکانیک کا استعمال بھی کرتا ہے جن میں بعض اوقات وہ اپنے یا کسی عزیز کے ذاتی تجربے کو موضوعِ بحث لاتا ہے اور کبھی براہِ راست بغیر کسی پردے کے قارئین کے مسائل سامنے لاتا ہے۔ وہ مختلف واقعات، سماجی رویوں اور زندگی کی اونچ نیچ سے مضحکہ خیز پہلو نکالتا ہے اس لیے فکاہیہ کالم کو تحریر میں زیادہ احتیاط برتنے کی

ضرورت ہوتی ہے۔ فکاہیہ کالم میں مزاح کی چاشنی کا ایک حد کے اندر ہونا چاہیے اور اس دوران کسی کی ذات کو براہِ راست تضحیک یا تنقید کا نشانہ بنانے سے اس کی دل آزادی ہوتی ہے۔ قارئین پر بھی بُرے اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں اور یوں کالم نگار مسائل کو حل کرنے کے بجائے غیر ارادی طور پر نفرت کے بیج کی آبیاری کر رہا ہوتا ہے جو معاشرے، صحافت اور خود اس کی ذات کے لیے بھی زہرِ قاتل ثابت ہو سکتا ہے۔

اس سے قبل ابواب میں مذہبی، سیاسی، سماجی اور ادبی کالموں میں یوٹوپیائی عناصر کی موجودگی کا جائزہ لیا جا چکا ہے۔ جہاں تک فکاہی کالموں کے تجزیاتی مطالعے کی بات ہے تو اس ضمن میں دو باتوں کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ ایک فکاہی کالموں کے موضوعات اور دوسرا ان کا اسلوب۔ فکاہی کالموں میں موضوعات کے ساتھ ساتھ اسلوب میں بھی ایک گنجلک موڑ (Twist) ہوتا ہے۔ فکاہی کالم نگار اپنی بات کو واشگاف الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا بلکہ ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنا نقطۂ نظر بیان کرتا ہے جس کے لیے وہ بعض اوقات مزاح یا طنز کا سہارا لیتا ہے اور کبھی ثقافتی اور علاقائی رنگ میں اپنا نقطۂ نظر بیان کرتا ہے۔ اشاروں، کنایوں میں بات کرنے کے لیے کالم نگار تشبیہات، استعارے اور مجازِ مرسل کا بھی سہارا لیتا ہے۔ اسی لیے یہ کہا جاتا ہے کہ فکاہی کالم میں اس قدر ادبی اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں کہ یہ فکاہی کالم سے زیادہ ادبی کالم نظر آتا ہے۔ زبان کا اس قدر تنوع نظر آتا ہے کہ کالم نگار پر ماہر لسانیات کا شائبہ گزرتا ہے یا پھر اس کو ماہر لسانیات ہونا چاہیے۔

جہاں لسانیاتی اور اسلوبی نقطۂ نظر سے کالم نگار فن کی بلندیوں پر نظر آتا ہے، وہاں فکری لحاظ سے بھی وہ فن کی کاری گری دکھاتا ہے۔ کالم نگار اپنے تصور کی روح سے کبھی ایک خیالی دنیا بساتا ہے اور اس خیالی دنیا کو حقیقت کے روپ میں پیش کرتے ہوئے علامت نگاری اور تمثیل نگاری کا سہارا لیتا ہے اور یہ سب کچھ وہی کالم نگار کر سکتا ہے جو فکر و فن کے اعلیٰ درجے پر فائز ہو۔ فکاہی کالم نگار جب ایک تصوراتی یا علامتی دنیا بساتا ہے تو وہ دنیا اور اس کا پس منظر اس کی خواہشات کے عین مطابق ہوتا ہے وہ اس وقت متن کی تخفیف (decontextualization of text) کر رہا ہوتا ہے جس کے لیے وہ کبھی خیال، کبھی خواب یا کبھی علامت نگاری کی مدد لیتے ہوئے اپنا علامتی یوٹوپیا تشکیل دیتا ہے جو شیکسپیئر کے ڈرامے کا Not to or to be be کا قصہ پیش کرتا نظر آتا ہے۔

اگر ان تمام نکات کو مدِ نظر رکھا جائے تو فکاہیہ کالم نگاری کی تکنیک اور اسلوب Jonathan Swift کے Guilvers Travel سے قریب تر نظر آتا ہے جس کو انگریزی ادب کے کچھ ناقدین Utopian

Literature کے زمرے میں ڈالتے ہیں لیکن بیش تر اسے mock-utopia کہتے ہیں کیوں کہ اس میں مصنف جو کہتا ہے وہ اس کا مطلب نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ ایک ڈھکے چھپے انداز میں معاشرے کی خامیوں کو سامنے لاتا ہے لیکن اس کا مقصد معاشرے، ملک اور وطن کی اصلاح ہوتا ہے۔ اس کے لیے وہ طنز، مزاح یا علامت نگاری کو ایک آلے کی طرح استعمال کرتا ہے۔ ایک فکاہی ادیب کے طریقے علاج کو اگر ہومیو پیتھک طریقۂ علاج سے مماثل گردانا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ کیوں کہ وہ جراحی کے ذریعے مریض کی چیر پھاڑ نہیں کر سکتا بلکہ ہلکے پھلکے انداز میں تحریر کے اندر ایک گہرا مطلب پیش کرتا ہے۔

اگر برصغیر میں فکاہی کالم نگاری کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ اس کی ابتدا انگریزوں کے دور میں ہوئی جب کھلے بندوں صاف، سچی اور کھری بات کرنے پر قدغن لگائی جاتی تھی۔ آزادی کے بعد بھی مارشل لا کے طویل ادوار میں حقیقت نگاری اور حقیقت کشائی کو پسند نہیں کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے ادیب اور شاعروں نے جہاں اس علامت نگاری کا سہارا لیا ہے وہیں کالم نگاروں نے فکاہی کالم نگاری کو رواج دیا تاکہ دل کی بات بھی کہہ دی جائے اور مخاطب کو ناگوار بھی نہ گزرے۔

موک یوٹوپیا سے مراد ایسی تحریر ہے جو اصل میں یوٹوپیا نہیں ہے جب کہ یوٹوپیا سے مراد ایک مکمل یا آئیڈیل تصوراتی دنیا ہے۔ اس کا تصور سب سے پہلے افلاطون نے دیا تھا اس نے اپنے یوٹوپیا کے تمام قوانین کو بیان کیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں ایک آئیڈیل ملک کی تشکیل کے عام قوانین بتا دیے تھے۔ اس کے بعد تھامس مور نے سب سے پہلے Utopia کا لفظ ایک افسانوی جزیرہ کے لیے استعمال کیا تھا۔ انگریزی ادب میں جارج آرول (George Orwell) نے Animal Farm کے نام سے یوٹوپیا تشکیل دیا۔ یہ۔سب یوٹوپیا کی مختلف شکلیں ہیں۔ یوٹوپیا ایک تصوراتی دنیا جب کہ mock ایک Pretention یاد کھاوا ہے۔ ایک ایسی جگہ ہے جو جھوٹی (fake) ہونے کے ساتھ تصوراتی ہے۔ ایک ایسی جگہ جو اصلی نہیں ہے نہ سنجیدہ ہے اور حقیقی بھی نہیں ہے لیکن تصوراتی ضرور ہے۔ ایک fake قسم کا یوٹوپیا جو مزاحیہ ہونے کے ساتھ علامتی بھی ہے، یہ ہے یوٹوپیا لیکن مضحکہ خیز (ludicrous) ہے۔ موضوع بھی سنجیدہ نہیں ہے اور اس میں ایک سے زیادہ پرتیں ہیں جن میں مزاحیہ عناصر، حیرت انگیز دنیا اور تخیلاتی فضا موجود ہوتی ہے۔

سوفٹ کا ماک یوٹوپیا عجیب و غریب دنیا اور کرداروں سے مزین افسانوی رنگ لیے ہوئے ایک سنجیدہ موضوع پر مبنی کہانی اور ناول ہے۔ اس کے کردار حقیقی زندگی سے دور ہیں۔ چھ انچ کے لوگ اس کے بعد ۶۰

فٹ کے لوگ اور تمام جاندار بھی یوٹوپیا ہیں لیکن جھوٹے (fake) انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد اُڑنے والے جزیرے، اڑن طشتری کا تصور یہ سب یوٹوپیا کے بنیادی اجزاء ہیں۔ وقتی مشین جو ماضی یا مستقبل کا سفر کرتی ہے۔ اس علامت نگاری میں سوفٹ گھوڑوں کو انسانی عقل و شعور عطا نہیں کرتا بلکہ اس کا مقصد دنیا کی اصلاح تھا اور ایک حقیقی دنیا کی تشکیل کا تصور بھی جس کے لیے ایک غیر حقیقی دنیا کو بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ حقیقی زندگی کی خامیوں، برائیوں کو پیش کرتے ہوئے غیر حقیقی یوٹوپیا کی تشکیل اور اس غیر حقیقی یوٹوپیا کی تشکیل میں جن طریقوں کو استعمال کیا گیا ہے۔ ان میں سب سے نمایاں طنز ہے۔ یہ ایسا طنز ہے جو حقیقی معاشرے کے منہ پر طمانچہ ہے۔ جس کی مدد سے معاشرے کی برائیوں، خامیوں اور بے وقوفیوں کو سامنے لایا جاتا ہے جس سے مصنف کا مقصد اصلاح معاشرہ ہوتا ہے۔ اس دوران بعض اوقات وہ مزاحیہ انداز میں قاری سے مخاطب ہوتا اور بعض اوقات تلخ ہو جاتا ہے۔ کبھی طنز سے کام لیتا ہے اور کبھی بات کو مزاح میں اڑا دیتا ہے۔ مصنف کی علامتی انداز میں گفتگو ایک سے زیادہ معنی لیے ہوئے ہوتی ہے اور معانی کی بھی کئی پرتیں ہوتی ہیں۔

مصنف ادب میں علامتی انداز کو دو طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے۔ پہلے طریقے میں وہ جراحی کے انداز میں معاشرے کی چیڑ پھاڑ کرتا ہے، دوسرا مزاحیہ انداز ہے۔ طنز میں سیاسی، مذہبی اور سماجی طنز شامل ہوتے ہیں۔ معاشرے کو مختلف زاویوں سے دیکھا جاتا ہے۔Swift ایک سفر نامے کے ذریعے برطانیہ کے معاشرے کو محدب عکس کے نیچے رکھ کر پورے معاشرے کی تصویر کشی کرتا ہے۔ سیاسی واقعات کو مزاحیہ اور علامتی انداز میں پیش کرتے ہوئے معاشرتی برائیوں پر تنقید کرتا ہے۔ اس محدب عدسے میں برائیاں اور اچھائیاں زیادہ واضح نظر آتی ہیں۔ ملک میں ہونے والی بدعنوانیوں کو سامنے لایا جاتا ہے۔ گھوڑوں کے اندر اچھے اوصاف اور انسانوں میں جانوروں کی خوبیاں پیش کی گئی ہیں جن کی بنا پرSwift کے بارے میں یہ کہا گیا کہ وہ ایکmisanthrop ہے جو نوعِ انسان سے نفرت کرتا ہے لیکن انگریزی ادب میں جب بھی Utopian Literature کا ذکر آتا ہے توGuiliver's Travel کا نام ضرور لیا جاتا ہے۔ یوٹوپیائی ادب سے مراد ایسا ادب ہے جس میں ایک ایسی تصوراتی دنیا کا وجود ہے جس میں مکمل اطمینان اور یکسانیت کا وجود ہوتا ہے۔ مصنف کا یوٹوپیا دراصل ایک ایسی اخلاقی دنیا ہے جس کا حقیقی زندگی میں تصور ممکن نہیں ہے۔ سوفٹ نے دیہی علاقوں کی ایسی تصویر پیش کی ہے جو باغِ عدن کا تصور پیش کرتی ہے۔ اس کے ساتھ وہ انسانوں

کے اندر عقل و شعور کا مادہ پیدا کرنے کا خواہاں ہے جس کے لیے ایسی مخلوق کو پیش کیا گیا ہے جو ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ خالق کی مکمل تخلیق اور عقل و دانش کی مدد سے دنیا کو قابو میں کیا جاسکتا ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ یہ معاشرہ اور یہ جگہ بظاہر مکمل نظر آتی ہے لیکن یہاں بھی نسلی برتری اور تفاخر کا احساس پایا جاتا ہے۔ انسانوں کو دکھایا جاتا ہے جو بظاہر تو انسان ہیں لیکن اندرونی طور پر جانوروں جیسی عقل و دانش کا مظاہرہ کرتے ہیں، دوسری جانب جانور عقل و دانش سے مالا مال ہیں جو طنزیہ اندازِ فکر ہے۔ کچھ ناقدین کے مطابق swift نے ایک ایسے باغِ عدن کا تصور پیش کیا ہے جو خدا کے وجود سے خالی ہے۔ اس لیے گلیور کے علاوہ اور کسی کو یہاں جانے کا شوق نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک آئیڈیل دنیا کا یہ تصور مکمل ہونے کے باوجود بھی مکمل نہیں ہے۔ ناول کا اخلاقی سبق یہ ہے کہ اپنی ذات سے بڑھ کر بھی کسی چیز کا احترام اور اعتبار ضروری ہے۔ دوسروں کا عزت و احترام، عاجزی اور انکساری اور احساسِ ذمہ داری دوسروں کا احساس بیدار کرنا ناول نگار کا اخلاقی مقصد ہے۔

ناول کی کہانی میں معانی کی کئی پرتیں ہیں جن کے باعث اس کے اندر خفیہ معانی بھی ہیں۔ جن کو تین سطحوں پر دیکھا جاسکتا ہے۔ بظاہر یہ ایک مزاحیہ کہانی کے ساتھ ساتھ یہ ایک سفرنامہ بھی ہے اور اس میں اخلاقی سبق بھی موجود ہے۔ کہانی کے تمام کردار پڑھنے میں مزاحیہ لگتے ہیں۔ ہیرو بطورِ نامہ نگار مختلف جگہوں پر جاتا ہے اور بطور ایک حساس اور سمجھدار انسان، سیاسی اور سماجی معاشرے اور اسکے مزاج پر ایک طنز ہے۔ مزاحیہ واقعات کے ساتھ سنجیدہ مذاق بھی ہے۔ کہانی کے کئی پرت نظر آتے ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ناول ہے تو یوٹوپیا لیکن Fake یا غیر اصل۔

اس باب میں فکاہی کالم نگاری میں عطاء الحق قاسمی اور منو بھائی کے فکاہی کالموں میں یوٹوپیا کے رجحان کا جائزہ لیا جائے گا۔

عطاء الحق قاسمی کی فکاہیہ کالم نگاری

کالم صحافتی ادب کی وہ قسم ہے جس کی زندگی وقتی ہوتی ہے، اگرچہ کالم کے موضوعات وسیع ہوتے ہیں کیونکہ زندگی کے ہر شعبے کے متعلق کالموں میں لکھا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کی طبعی عمر کم ہوتی ہے۔ بقول شیخ ابراہیم:

شمع تیری عمر طبعی ہے ایک رات
رو کر گزار دے یا اسے ہنس کے گزار دے

زندگی کی ہر جہت اور ہر پہلو کو کالم میں بیان کیا جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ بیان منطق سے سلجھا اور لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا ہو۔ہاں یہ ضروری ہے کہ بیان کے اندر بے تکلفی کا عنصر نمایاں ہو تا کہ قاری کو محسوس ہو کہ کالم نگار اسی سے مخاطب ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ غیر رسمی اور بے تکلفانہ طرزِ گفتگو کالم کے اسلوب کا بنیادی خاصہ ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ یہ شوخی اور شگفتگی ہی کالم میں اضافی حسن پیدا کرتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی پاکستان کے منفرد انداز رکھنے والے ادیب، سفر نامہ نگار اور فکاہی کالم نگار ہیں۔ وہ طویل عرصے سے روزنامہ جنگ سے وابستہ رہے ہیں۔ انہوں نے تدریس کے شعبہ سے اپنے فنی سفر کا آغاز کیا اور ،روزنِ دیوار، کے نام سے کالم نگاری کا آغاز کیا جس کا سلسلہ تا دمِ تحریر جاری ہے۔ عطاء الحق قاسمی کی کالم نگاری میں بھی یہی اوصاف نظر آتے ہیں۔ ان کے کالم اخبار کی مجموعی فضا کا حصہ نظر نہیں آتے بلکہ اس کی یک رنگی میں ایک نہیں کئی رنگ کا اضافہ کرتے ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ عطاء الحق قاسمی نے اردو کی فکاہیہ کالم نگاری کو محدود اور مخصوص موضوعات سے نکال کر سیاسی، سماجی اور معاشرتی زندگی کے ہر خاص و عام پہلو کو نہایت خوبی سے موضوعِ تحریر بنایا ہے تو غلط نہ ہو گا۔ ان کے کالم لطافت، سلاست ، شوخی اور روانی اور موضوعات کے تنوع کے باعث فنِ کالم نگاری کے بے مثال نمونے سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے کالم کو فکاہیہ کالم نگاری کی ایک ترقی یافتہ شکل گردانا جاتا ہے۔ انھوں نے مزاحیہ کالم نگاری میں ایک نئی روح پھونکی ہے۔ ان کی تحریروں میں ایک شگفتہ پن اور انفرادیت نظر آتی ہے اور یہ انفرادیت انہی کا مخصوص طریقہ کار ہے۔ وہ مزاح نگاروں کے مروجہ طریقہ کار سے ہٹ کر چلتے ہیں۔ روایتی مضحکہ خیز کردار اور واقعات تشکیل کرنے کی بجائے اپنے فطری و فکاہی رجحان کو بروئے کار لاتے ہیں۔ اپنی شخصیت میں گھلی مزاح کی چاشنی کا برجستہ استعمال کرتے ہوئے کالم کو رنگین اور مزاحیہ بناتے ہیں اور اس صلاحیت کی بدولت وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کو مسخر کر لیتے ہیں اور اس حد تک مسخر کرتے ہیں کہ اس کی ہیئت تک بدل ڈالتے ہیں۔ مثلاً طربیہ موضوع کو اپنے اسلوب سے ایسا فکاہی یا مضحکہ خیز بنا دیتے ہیں کہ قاری مزاح کے اثر میں سنجیدہ بات کو بھی ہضم کر لیتا ہے۔ وہ ناگوار بات کو بھی گوارا کر لیتا ہے۔ مزاح کے لبادے میں کڑوی کسیلی اور اصلاحی باتیں بھی کر جاتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی عام لوگوں کے مسائل، ان کی سرگرمیوں اور ان کے معاملات کو اپنے کالموں کا موضوع بناتے ہیں لیکن ان کو پیش کرنے کا انکا مخصوص انداز ہے جس کے ذریعے قاری کو کالم میں

ایک اصلیت کی بو محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے وہ پنجابی کے روز مرہ کے الفاظ کا استعمال بھی کرتے نظر آتے ہیں جس سے نہ صرف تحریر میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے بلکہ مصنوعی پن کا شائبہ تک نہیں گزرتا۔ یوں لگتا ہے کہ پیش کردہ حالات واقعات سامنے ہو رہے ہیں۔ ملک کی سیاسی حالات کی عکاسی کرتے ہوئے کالم نگار کئی اصطلاحات کی اختراع یا ایجاد کرتا ہے جو ان کی تحریروں کو تخلیقی رنگ کے ساتھ حقیقی رنگ بھی عطا کرتا ہے۔ اسی اسلوب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خالد اختر عطاء الحق قاسمی کے بارے میں اپنی رائے ان الفاظ میں دیتے ہیں۔

> "ایک دن کی زندگی پانے والی وقتی تحریریں، مگر ان میں اتنی شگفتگی، اتنی انبساط انگیزی ہے کہ ان کا اسلوب اتنا قدرتی، اتنا روشن ہے کہ میری رائے میں (اور اس کے دوسرے پڑھنے والوں کی رائے میں) وہ ادب کے قریب آجاتی ہیں۔ ان میں سے چند ایک تو ادب پارے ہیں۔ اعلیٰ معیار کی طنز اور ظرافت کے نثری ٹکڑے جنھیں آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا۔"(۲)

ایک کالم کو جی ٹی روڈ پر نہیں بلکہ پگڈنڈیوں پر چلنا چاہیے۔ کالم نگار کو چاہیے کہ وہ گرجے کم اور برسے زیادہ۔ ان توقعات پر عطاء الحق قاسمی کا کالم پورا اترتا ہے جو کہ توقعات سے بے نیاز ہو کر لکھا جاتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کے ہاں بھی وہی بے نیازانہ انداز نظر آتا ہے۔ وہ معاشرتی، معاشی اور سیاسی کوتاہیوں اور ناہمواریوں کے خلاف شدید احتجاج کرتے ہیں۔ ظالم اور مظلوم کی نشاندہی ان کے کالموں میں اکثر نظر آتی ہے۔ وہ ظلم کے خلاف جہاد کرتے ہیں۔ طنز کو وہ عینک کی مانند پہنتے ہیں کہ اپنے چہرے کے سوا سب کچھ نظر آتا ہے۔ اس کا دھاوا دفاعی اور رفاہی ہوتا ہے۔ ان کے کالموں کی مقبولیت کا راز اس کے سوا دے طرزِ تحریر میں مضمر ہے۔ ان کی نثر میں کار فرما جراحی کا وہ طلسم بھی موجود ہے جو نثر کے ایک عام سے ٹکڑے کو ادب کی پرت عطا کرتا ہے اور جنھیں میر نے شعور سے جنون کرنا کہا ہے۔ یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا مخصوص انداز کالم کو کالم سے ہٹکر اور کالم سے بڑھ کر کوئی چیز بناتا ہے۔

اردو کے منفرد کالم نگاروں کی فہرست بڑے بڑے ناموں سے پُر ہے اور ان پہاڑوں کے بیچ میں اپنی الگ روش، الگ پہچان تراشنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مگر "روزنِ دیوار" کے نام سے حسین بادلوں کے ایک ایسے جھرمٹ کو بڑی تیزی سے ابھرتا دیکھتے ہیں جو کسی بھی تحریر کی مخصوص چھاپ کہلا سکتا ہے۔ اس کے جملے ایک قطار میں کسی فوج کے جوانوں کی طرح قدم سے قدم ملا کر اٹھتے ہیں۔ اس کی سوچ میں تازگی اور صداقت نظر آتی ہے۔ طبیعت کی بے اندازہ شگفتگی کالم کی ایک دن کی زندگی کو شیر کی زندگی بنا دیتی ہے اور

اس کی روایتی "وقتیت" میں عصری تاریخ کی ایک تصویر متحرک ہوتی ہے یا یوں کہیں کہ معاصر حالات کی ترجمانی کرتے یہ کالم آفاقیت کی حد کو چھوتے ہیں۔

یوں تو آرٹ ایک بدمست گھوڑے کا نام ہے۔ لیکن جس کمالِ قدرت سے عطاء الحق قاسمی نے اس کو رام کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ وہ موضوعات اور اسلوب میں روایت پسندی کی روش کو ترک کرتے ہوئے ذاتی پسند کے محاذ پر لے آیا ہے اور اس لائحۂ عمل نے صرف اس کے کالموں کی چھب ڈھب کو بدلا ہے بلکہ اجنبیت کے مقابلے میں اپنائیت کا رنگ بھی پیدا کر دیا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اردو کالم نگاری میں پہلی بار اپنا پن نظر آتا ہے۔ عطاء الحق پاکستان کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں پر غیر متزلزل ایمان رکھتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کے کالم، عسکری کالم کی طرح سینہ سپر ہوتے ہیں اور آربی نہر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کے فکاہیہ کالموں میں یوٹوپیائی عناصر

طرح عطاء الحق قاسمی کے کالموں میں جو ماحول کردار اور فضا نظر آتی ہے یوٹوپیاہی کی طرز پر وہ ایک دکھاوا ہے۔ وہ بظاہر کہانی کے کرداروں، اس کی فضا اور کرداروں کے مکالمات کی مدد سے اپنے دل کی بات کہہ دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کالم کے ذریعے جو اخلاقی مقصد اس کے ذہن کے دریچوں میں نہاں ہوتا ہے وہ اسے سامنے لاتے ہیں۔ بقول شفیق الرحمٰن:

"عطاء الحق قاسمی پاکستان کا آرٹ بکوالڈ ہے۔"(۳)

اپنے کالم "الحم للہ سے ایکسکیوزمی تک" میں کالم نگار نے مزاحیہ انداز میں گزرے دور کے ادب اور تہذیب کی تعریف کی ہے اور نئے دور میں اپنائے جانے والے انداز جسے modernism کہا جاتا ہے، پہ دبے الفاظ میں طنز بھی کیا ہے:

"ایک وقت تھا کہ بھری محفل میں اگر کسی کو چھینک آجاتی تو وہ اس شان سے چھینکتا کہ درو دیوار ہل جاتے تھے اور ارد گرد بیٹھی پبلک پر اس کی دھاک بیٹھ جاتی تھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ بلا خوف و خطر چھینکتا تھا بلکہ ایسے موقع پر وہ الحمد للہ کہہ کر خدا کا شکر بھی ادا کرتا تھا۔ اس کے جواب میں حاضرین یرحکم اللہ کہتے تھے یعنی اسے داد دیتے تھے کہ خدا تم پر رحم کرے۔"(۴)

اس کالم میں کالم نگار کا نقطۂ نظر Nostalgic یا ماضی پرستی کے ساتھ ساتھ روایت پسندانہ بھی نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ اسلام کے طور طریقوں کی بھی تعریف کرتے ہیں اور معاشرے میں دن بدن پھیلتی ہوئی جدیدیت پر تنقید کرتے نظر آتے ہیں۔ حقیقت نگاری کے ساتھ کالم میں لطیف پیرائے میں تنقید بھی کی گئی ہے۔

"آدھے پہلوان سے ایسی "ادی پچدی" کہانیاں سن سن کر ہم بھی آہستہ آہستہ اس کے رنگ میں رنگے جا رہے ہیں۔ چناں چہ اب یہ عالم ہے کہ کوئی دوست کسی فلم ہی کی نہیں کسی جلسے جلوس کی کہانی بھی ہمیں سنانے کے لیے کہتا ہے تو ہم اسے اسی طرح کی "ادی پچدی کہانیاں" سناتے ہیں۔ مثلاً گزشتہ دنوں ہم نے ایک جلسے میں عوام کی حیثیت سے شرکت کی اور دوستوں نے اس کی اسٹوری سنانے کو کہا تو ہم نے انھیں بتایا کہ پہلا مقرر جب سٹیج پر آیا تو اس نے کچھ کہا پھر دوسرے مقرر نے کچھ کہا حتیٰ کہ سب مقرروں نے کچھ کہا۔"(۵)

یہاں مصنف نے ایک تصوراتی ماحول پیش کیا ہے۔ عام لوگوں کو عام حالات و واقعات میں پیش کرتے ہوئے انھوں نے ان کے مسائل بیان کیے ہیں۔ گو کہ کالم کی فضا اور ماحول تصوراتی ہے لیکن انھوں نے جن مسائل کو پیش کیا ہے، ان کا تعلق حقیقی لوگوں اور حقیقی زندگی سے ہے۔ حقیقت پسندی کا تو یہ عالم ہے کہ کالم نگار نے زبان بھی ان لوگوں کی استعمال کی ہے، جس نے اس کے اسلوب کو ایک قدرتی پن کی سچائی (Originality) اور منفرد انداز عطا کیا ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل ذکر کیا گیا ہے کہ کالم نگار کے ہاں علاقائی رنگ نمایاں ہے اور ان کے کالموں کو Swift کے ناول کی طرح معانی کی کئی سطحوں پر دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات کالم نگار کالم کا اختتام ذو معنی الفاظ یا جملوں کے ساتھ کرتے ہیں جس طرح اس کالم کے انجام پر کہتے ہیں کہ ہم جو آدھی کہانی سناتے ہیں اور وہ جو پوری کہانی سننا چاہتے ہیں سب آدھے پہلوان ہیں۔ ہماری آدھی عمر کڑھائیاں مانجھتے گزر گئی ہے اور باقی بھی گزر ہی جائے گی۔ اس جملے میں ایک کرب اور ایک دکھ ہے اور ساتھ مصنف کا شخصی تاثر بھی نظر آتا ہے۔ کالم ملک کی موجودہ صورتِ حال پر ایک گہرا طنز ہے لیکن یہ طنز ڈھکے چھپے انداز میں کیا گیا ہے جس کے لیے مصنف نے فرضی ماحول اور فرضی کرداروں کا انتخاب کیا ہے۔ ایک فرضی ماحول پیدا کر کے کالم نگار در پردہ اپنے دل کی بات کہہ جاتا ہے جس کو پڑھنے والا پڑھتا اور سمجھنے والا سمجھ جاتا ہے۔

جہاں تک حقیقت نگاری کا تعلق ہے تو مصنف اگر اپنے کالموں میں حقیقت کو پیش بھی کرتے ہیں تو ڈھکے چھپے الفاظ میں، مثلاً ملک کی موجودہ سیاسی صورتِ حال، عوام کی کسمپرسی اور حکمرانوں کی بے حسی کو کالم نگار نے نہایت خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے کہ حکمرانوں کی طبع نازک پر بھی یہ بات گراں نہیں گزرتی اور لوگوں کے دکھ درد کو بھی بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس کالم میں مصنف نے علامتی انداز میں ملک کے مسائل کو بیان کیا ہے جس میں طنز کا عنصر بھی نظر آتا ہے۔

"مگر فی الحال یہ نوبت نہیں آئی اور عوام حیران ہیں کہ کب گھوڑا اپنی خودی بلند کر لے اور پھر یہ خدا اپنے ان بندوں سے پوچھے کہ بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟ اور آگے اسے یہ کورس میں کہیں: میوہ! مگر فی الحال یہ نوبت نہیں آئی اور عوام حیران ہیں کہ آخر یہ نوبت کیوں نہیں آئی؟"(٦)

اس کالم میں انھوں نے ملک کے مسائل کی ایسی حقیقی تصویر کشی کی ہے کہ اس پر حقیقت کا گماں بالکل نہیں ہوتا ہے بلکہ ایک یوٹوپیا ایک تصوراتی دنیا دکھائی گئی ہے جو امید پر قائم ہے۔ اس کے ساتھ ہی کالم نگار قارئین اور عوام کو یہ نصیحت بھی کرتے ہیں کہ اگر ہم اسی طرح آنے والے اچھے وقتوں کا فقط انتظار ہی کرتے رہیں گے تو وہ وقت خود چل کر ان کے پاس کبھی نہیں آئے گا۔ یہ لوگ خوابِ خرگوش میں ہیں اور حکمران گزشتہ کئی برسوں سے ان کے حصے کا کھانا کھانے میں مشغول ہیں۔ یہ اسی طرح پچھلی لائن میں لگے جمائیاں لیتے رہے تو انھیں مزید ایک طویل عرصے تک یہی سننا پڑے گا کہ میوے کی ٹہنی ٹوٹ گئی ہے۔ درزی بلایا گیا ہے اور درزی کی سوئی ٹوٹ گئی ہے۔ لوہار کو بلانے کے لیے گھوڑا بھیجا گیا مگر اس کا پاؤں زخمی ہو گیا ہے۔ اس زخمی پاؤں پر ہلدی لگائی جا رہی ہے اور بس اب میوہ تیار ہوا چاہتا ہے۔ کھانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

کالم نگار نے اس کالم میں طنز و مزاح اور علامت نگاری کا نہایت خوب صورتی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ در حقیقت یہ دونوں کالم نگار کے ہاتھوں میں ایسے ہتھیار ہیں جن کی مدد سے وہ تلخ سے تلخ بات کو نہایت سہل انداز میں بیان کر دیتے ہیں اور قارئین پر بھی ایک خوشگوار تاثر چھوڑتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ الفاظ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں اور وہ انھیں اپنی مرضی و منشا سے جس طرح چاہے استعمال کر لیتے ہیں۔ اسی لیے کرنل محمد خان نے ان کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ،

"سدا بہار مزاح نگار عطاء الحق قاسمی اپنی تحریروں اور طبیعت کی وجہ سے پاکستان کے لیے بیش بہا قدرتی وسیلوں میں سے ایک ہیں۔"(٧)

اپنے کالم "آقاؤں کے لیے ایک کالم" میں انھوں نے بہ حیثیت قوم ہماری غلامانہ روش پر طنز کرنے اور اور اس کے ساتھ ساتھ ہلکے پھلکے انداز میں ان غلاموں کو کچھ نصیحتیں بھی کی ہیں جن سے قارئین نہ صرف لطف اٹھاتے ہیں بلکہ اس کے اندر چھپے طنز کو بھی محسوس کر لیتے ہیں۔ یہ تمام مشورے دراصل کالم نگار نے اپنے ماک یوٹوپیا کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے دیے ہیں۔

> "خاندانِ غلاماں کے علمائے کرام کے لیے ہم تجویز کریں گے کہ ان کے گلے میں "امیر کی اطاعت تم پر واجب ہے"، کے کلمات تعویز کی صورت میں لٹکا دیے جائیں کہ وہ یوں بھی عوام کو اسی طیب جملے کے خبیث معنی بتاتے ہیں۔ غلام استادوں کے لیے یہ حکم ہونا چاہیے کہ وہ نہ صرف اپنے ماسٹر کے سامنے بلکہ عام معاشرتی زندگی میں بھی خود کو ماسٹر کہلوانا ترک کر دیں تاکہ ان کے اس بہانے کی شناخت ہو سکے۔"(۸)

بظاہر نئے اور پرانے زمانے میں بہت فرق نظر آتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو فرق زیادہ نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ پرانے زمانے میں غلاموں کی منڈیاں لگا کرتی تھیں، غلاموں کی پیشانیاں داغی جاتی تھیں لیکن آج کے دور میں تو سبھی پیسے کے غلام ہیں کوئی بھی اپنے فرض، اپنے پیشے سے وفادار نہیں ہے۔ ہر وقت بکنے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ کوئی اچھے دام لگانے والا ہو اور یہی غلام یہی بکاؤ مال آگے چل کر حکومتوں کی تشکیل و تخریب میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ کالم نگار نے اس کالم میں حقیقت پسندی کا سہارا لیا ہے۔ علامت نگاری کا عنصر نمایاں ہے۔ ہم تو اس قدر غلام در غلام ہیں کہ خاندانِ غلاماں نے بھی ہم پر کئی سو برس حکومت کی ہے۔ موجودہ کالم میں وہ صورتِ حال سے مایوس نظر آتے ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ کالم ڈسٹوپیا کی مثال ہے۔

> "ان تمام اطلاعات میں سے ہمیں یہ آفر زیادہ معتبر معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ جو بلی چوہے کا شکار کرنا جانتی ہے، وہ بھوکوں نہیں مرتی اور یوں ہمیں یقین ہے کہ یہ بلی نہ صرف یہ کہ ان دنوں بھی اپنی ملازمت پر موجود ہے بلکہ یہ کافی حد تک قابلِ قبول ہے کہ اس کے درجات بھی بلند ہوئے ہوں گے۔" (۹)

اس کالم میں انھوں نے علامتی انداز اختیار کیا ہے۔ اپنے مخاطب کا نام صیغۂ راز میں رکھتے ہوئے انھوں نے بلی چوہے کا یہ کھیل کھیلا ہے۔Guiliver's Travel کی طرح مصنف کے اکثر کالموں میں تمثیل

کاری(allegory) کے اثرات نظر آتے ہیں۔ حریفوں اور حلیفوں کو ان کے ناموں سے پکارنے کے بجائے وہ ان کی خصوصیات سے مماثل جانوروں کو سامنے لائے جس طرح Swift نے سیاسی منافرت سے بچنے کے لیے اپنے وقت کی سیاسی جماعتوں کو Whigs اور Torries کے بجائے High Heel اور Low Heel کہہ کر پکارا ہے۔ ان تحریروں میں علامتی انداز لانے کے لیے مصنف کو فکر اور اسلوب دونوں میں عبور حاصل ہونا چاہیے۔

اسی بنیاد پر عبد اللہ حسین نے عطاء الحق قاسمی کے کالموں کے بارے میں ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے:

> "عطاء الحق قاسمی کے کالم یک طرفہ آئیڈیالوجیکل جذبات سے آزاد ہیں اور دشمنوں کے خلاف روایتی برہمی کے اظہار کی بجائے حقیقت کے آئینے میں ان کا تجزیہ کیا گیا ہے۔"(۱۰)

کالم نگار نے اکثر کالموں میں مکالمہ کا انداز کا منتخب کیا ہے اور اس لیے وہ اپنے فرضی کرداروں کو فرضی ماحول میں لے جا کر ان کی گفتگو کو تیسرے شخص کے طور پر تحریر کرتے ہیں۔ ان کے کردار دراصل ان کے دل کی آواز ہوتے ہیں جن کی مدد سے وہ اپنا نقطۂ نظر پیش بھی کرتے ہیں اور اس پر بحث بھی کرتے ہیں۔ اپنے کالم "بے خواب آنکھوں کا سفر" میں انھوں نے یہی طریقہ استعمال کیا ہے۔

> "ملکی استحکام کا دارومدار جمہوریت پر ہے۔ ملک میں جمہوری اداروں کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا جانا چاہیے۔ کیوں کہ اس صورت میں عوام اسلام کے حق میں فیصلہ دیں گے اور اسلامی نظام ہی ملکی استحکام کا باعث بن سکتا ہے کیوں کہ اس ملک کی بنیاد اسلام ہی پر ہے۔"(۱۱)

کالم نگار اپنے فرضی کرداروں کو اپنا آلہ کار بنا کر اپنے دل کی بات ان کے ذریعے کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں، ملک کے لیے بہترین طرزِ حکومت صرف اور صرف جمہوریت ہے اور آج تک ملکی مسائل کی سب سے بڑی وجہ شاید یہی ہے کہ ملک میں جمہوریت کی ریل کو ہمیشہ پٹری سے ہٹانے کی کوشش کی گئی اور جمہوریت کی پٹری کو توڑنے کی، اس کو سبوتاژ کرنے کی بھی بہت کوشش کی گئی ہے۔ جمہوریت پر چل کر ملک کو فلاحی ریاست بنایا جا سکتا ہے جس کی مدد سے مصنف کا یوٹوپیا حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی بحث کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے کالم نگار نے اس کے متبادل راستے سمجھائے ہیں۔ جیسے کہ کچھ لوگوں کے خیال میں اسلامی نظام ملک میں بہتری لا سکتا ہے لیکن اس میں بھی دو رائے سامنے آتی ہیں کہ کون سا اسلام۔ مولانا مودودی کا طبقۂ فکر

یا پھر ابوذر غفاری کا اسلام جو غریبوں کی پشت پناہی کرتا اور انھیں حوصلہ دیتا ہے۔ ایک طبقۂ فکر اس بات کا حامی نظر آتا ہے کہ جب دعوتِ اسلامی نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے گی اس وقت انھیں اس کی خبر مہلت طے کرنے میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی کیوں کہ کئی برس پیش تر تمام فرقوں کے علما اسلام کے بنیادی اصولوں پر اتفاقِ رائے کا اظہار کر چکے ہیں۔ بس میں بیٹھے لوگ مختلف طبقہ ءفکر کے حامی ہیں لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ یہ کسی بھی نتیجے پر نہیں پہنچ پاتے ہیں۔ یہاں معاشرے کے طرزِ فکر پر گہرا طنز بھی نمایاں ہے۔

مصنف کے اکثر کالموں میں ایک فرضی فضا نظر آتی ہے جس کے لیے وہ فرضی کردار تخلیق کرتے ہیں لیکن ان کرداروں کا تعلق اس کے اردگرد سے ہوتا ہے اور وہ ان کرداروں کو علامتی انداز میں پیش کرتے ہیں۔

> "دراصل میرا دوست غمگین سلیمانی کی فکر سے بہت متاثر ہے۔ غمگین سلیمانی ان دنوں ایک ٹی وی چینل سے وابستہ ہے اور اس کا کہنا ہے کہ اچھی خبر، خبر ہی نہیں ہوتی صرف بری خبر، خبر کے ضمن میں آتی ہے۔ اس کے چینل کا نیوز بلٹین اس نوع کی خبروں سے بھرا ہوتا ہے: بس الٹنے سے ۱۴ لوگ ہلاک، فلائے اور گرنے سے ۲۴ افراد جاں بحق، وغیرہ وغیرہ۔" (۱۲)

مندرجہ بالا کالم مصنف کے علامتی انداز کے ساتھ ساتھ معاشرے کے منفی رویے پر ایک طنز ہے۔ جیسے یہ کہنا کہ ہم بحیثیت قوم غم پسندی کے مرض میں مبتلا ہیں۔ ہم جب خود غم میں مبتلا ہوتے ہیں تو دوسروں کو ایسی کیفیت میں دیکھ کر خوشی حاصل کرتے ہیں۔ یہ معاشرے کے منفی اقدار پر گہرا طنز ہے۔

> "امریکا میں لوگوں کی صحتیں بہتر نظر آتی ہیں تو اس کی وجہ بہتر خوراک نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ انتہائی مہنگے علاج کے خوف سے بیمار نہیں ہوتے۔" (۱۳)

امریکا کو بیش تر کالم نگاروں نے اپنا یوٹوپیا قرار دیا ہے اور وجہ اہلِ امریکا کا بہترین اور قابلِ رشک اندازِ زندگی ہے لیکن عطاء الحق قاسمی کی نگاہ نے اس کو بھی موک یوٹوپیا بنا دیا ہے۔ اس کی وجہ بھی انھوں نے نہایت دلچسپ بیان کی ہے کہ ہمیں امریکیوں پر رشک نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اگر وہ بیمار نہیں پڑتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بیماری کے اخراجات برداشت کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ مزید وہ اپنے ملک کے حکمرانوں کو بھی

از راہِ مذاق یہی مشورہ دیتے ہیں جس کی مدد سے لوگوں کی صحت کو بہتر بنایا جاسکتا ہے اور محکمہ صحت کے اخراجات کو بھی کم کیا جاسکتا ہے۔

رومانویت کے علاوہ مصنف کے کالموں میں اکثر ہمیں مثالیت پسندی بھی نظر آتی ہے۔ اپنے ایک کالم میں انھوں نے ایک گوراصاحب دکھایا ہے جس کا مذہب تو عیسائیت ہے لیکن اس کے دل میں ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے لیے محبت کا جذبہ ہے۔ جس طرح افلاطون نے اپنی کتاب Republic میں ایک مثالی ریاست کا تصور پیش کیا، اسی طرح کالم نگار نے اپنے کالم "شعر دان" میں ایک mock utopia کا تصور دیا ہے۔ افلاطون نے جس مثالی ریاست کا تصور پیش کیا، اس میں اس نے شاعروں کو خارج کر دیا تھا۔ اس لیے مصنف نے بھی شاعروں کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک ایسی ریاست کی تجویز پیش کی ہے جس میں "شعر دان" قسم کی کوئی چیز ایجاد ہونا چاہیے تاکہ جہاں بھی کسی شاعر کو شعر اگلنے کی ضرورت محسوس ہو تو شعر دان اس کے آگے رکھ دیا جائے۔ مثالیت پسندی اور رومانویت کے علاوہ ان کے اکثر کالموں میں علامت پسندی اور تمثیل نگاری نظر آتی ہے۔ مثلاً اپنے ایک کالم "طوطے اور طوطے" میں کالم نگار نے مندرجہ ذیل الفاظ میں انسانی معاشرے پر در پردہ طنز کیا ہے:

> "یہ طوطے معمولی طوطے نہیں ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ سیاسی طوطے ہیں اور کچھ ادبی اور صحافتی طوطے ہیں۔ کچھ انقلابی طوطے ہیں اور اسلام پسند طوطے ہیں۔" [۱۴]

جوناتھن سوفٹ کی طرح کالم نگار نے طوطوں کے اندر انسانی خوبیاں دکھائی ہیں۔ ان کو داتا جانور دکھلایا ہے اور انسانوں کو فقط ان کا رکھوالا قرار دیا ہے۔ یہ انسان کے غلام نہیں ہیں بلکہ انسان خود ان کا غلام ہے جو نسل در نسل غلامی کا سلسلہ قبول کرتا ہے۔ کالم نگار نے نہایت خوب صورتی سے اپنے ملک اور اس کے باسیوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کا دل اس غلامانہ فطرت کو دیکھ کر خون کے آنسو روتا ہے۔ وہ کبھی ڈھکے چھپے الفاظ میں اور کبھی ببانگِ دہل اپنی اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم کب غلامی کے اس طوق سے آزادی حاصل کر کے باوقار قوموں کی طرح زندگی گزاریں گے؟۔ اس خواہش کو ان کا یوٹوپیا ہی کہا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ اس خواہش کا حصول اس دنیا میں تو ممکن نہیں ہے یا دوسری طرف سیاسی، ادبی اور صحافتی میدان میں کام کرنے والوں کو طوطا کہا ہے جو تخلیقی صلاحیت سے محروم طوطوں کی طرح فقط فعال اور نقال ہیں۔

جیسے کہ ایک کالم میں مزاحیہ انداز میں بکروں کی محفل منعقد کی جاتی ہے اور اس طرح وہ اپنا پیغام پہنچاتے ہیں لیکن در حقیقت یہ مصنف کے دل کی بات ہے۔ اپنے کالم " بکروں کا آخری اجتماع " میں بھی کالم نگار نے ایک علامتی منظر پیش کیا ہے۔ انھوں نے Swift کی طرح بکروں کا ایک اجلاس پیش کیا ہے جس میں بکرے اپنے دل کی بات کر رہے ہیں۔

> " سٹیج پر تین چار بکرے بیٹھے ہیں۔ ایک نوجوان بکرا جو اسٹیج سیکریٹری ہے، مائیک پر آتا ہے۔
> اسٹیج سیکریٹری: شروع کرتا ہوں ساتھ نام اللہ کے جو بڑا مہربان اور رحم والا ہے۔ "[۱۵]

کالم نگار نے ان بکروں میں انسانی اوصاف دکھائے ہیں۔ کالم علامتی ہے۔ الفاظ کا چناؤ خوبصورت اور ذو معنی ہے۔ جسے پڑھ کر قاری نہ صرف لطف محسوس کرتا ہے بلکہ کالم نگار کے دل کی بات اور طنز بھی سمجھ لیتا ہے۔ وہ اس معاشرے پر طنز کرتا ہے کہ جس میں انسان کی قدر و قیمت شاید ان بکروں سے بھی کم تر ہے کیونکہ وہ کسی کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ علامتی انداز کے ساتھ ساتھ اندازِ فکر میں بھی سوئفٹ کی جھلک نظر آتی ہے جس نے موک یوٹوپیا کی مدد سے نہ صرف معاشرے کے انداز و اطوار پر نہ صرف طنز کیا ہے بلکہ بہتری کی راہ بھی دکھائی ہے۔

کالم نگار کے اکثر کالموں میں ناسٹلجیا یا ماضی پرستی بھی نظر آتی ہے۔ اپنے ایک کالم "اک اور بت" میں وہ ماضی کی خوب صورت روایات کو یاد کرتے ہیں جب ٹی وی، فریج اور وی سی آر جیسی خرافات وجود میں نہیں آئی تھیں۔ لوگ گھڑوں کا ٹھنڈا پانی پیتے تھے، بوریت دور کرنے کے لیے راتوں کو محفلیں سجا کرتی تھیں۔ اولڈ ہوم نہیں ہوتے تھے اور لوگ اپنے بزرگوں کو اپنا قیمتی سرمایا گردانتے تھے۔ کالم کے اختتام پر انھوں نے اپنے بیٹے کا نقطۂ نظر بیان کیا ہے جو اس نظام اور اس ماحول کو فرسودہ گردانتا ہے، وہ اپنے نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں کرتا ہے:

> "تو ڈیڈ! گویا آپ لوگوں کے ہاں فرد کی آزادی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ آپ کو بڑھوں کے چونچلے برداشت کرنا پڑتے تھے، شادی کے بعد مرد کو ساری عمر ایک عورت اور ایک عورت کو ساری عمر ایک مرد کے ساتھ گزارنا پڑتی تھی۔ "[۱۶]

اسی طرح ان کے اکثر کالموں میں ماضی پرستی نظر آتی ہے۔ ان کے کالم " مسافتیں " وہ ماضی کے ان حالات و واقعات سے پردہ اٹھایا ہے جب پاکستان آزاد ہوا تھا۔ وہ ایک بھنگی کا واقعہ سناتے ہیں۔ جب ایک

نوجوان مسلمان عورت نے اس کے گھر میں پناہ لی تھی اور اس نے اسے ایک پوٹلی بطور تحفہ دے کر رخصت کیا۔ کیوں کہ اس کے پاس اس سے زیادہ کچھ دینے کو نہ تھا۔

"خود مجھے یوں لگا میں ۱۹۷۷ء کی بجائے ۱۹۴۷ء میں سانس لے رہا ہوں۔ میں نے چشمِ تصور میں دیکھا کہ جوان مردوں اور بوڑھی عورتوں کی لاشوں سے یہ میدان اٹا پڑا ہے اور وحشی درندے شراب کے نشے میں دھت بھیانک قہقہے لگاتے ہوئے بچیوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور وہ اپنے والدین اور غیر واقربا کی لاشوں کو پھلانگتی ہوئی اس کنویں کے پاس آتی ہیں اور ایک ایک کر کے اس میں چھلانگ لگا دیتی ہیں۔"[۱۷]

یہی مصنف کا موک یوٹوپیا ہے۔ جس میں آگے چل کر وہ بتاتے ہیں کہ، ایک بھیانک خواب لیکن خوشی، تسلی کی بات یہ ہے کہ اب انڈیا میں ان کا استقبال انھی ہندوں اور سکھوں کی آنے والی نسلوں نے کیا اور یہ الفاظ بھی کہے کہ تم اور ہم لوگ معصوم ہیں اور یہ کنویں بھی معصوموں کی لاشوں سے اٹے پڑے ہیں۔ اگر تاریک طوفانی راتوں میں آپ کو ان کنوؤں سے چیخوں کی آوازیں سنائی دیں تو ان کو ضرور غور سے سننا کیونکہ یہ تمہارے آباؤ اجداد کی امانتیں ہیں جو اب تمہارے سپرد ہیں۔ اس لیے بچے اس دنیا میں خدا کے سفیر ہوتے ہیں۔

اپنے کالم "داناخر دپوری کے اقوالِ زریں" میں کالم نگار نے معاشرے کے شائستہ اور مہذب لوگوں کے رویوں پر طنز کیا ہے۔ ایسے لوگ جن کو معاشرے میں اعلیٰ ظرف اور تعلیم یافتہ سمجھا جاتا ہے لیکن درحقیقت وہ ان حساس اقدار اور مذہبی روایات سے کس قدر دور ہوتے ہیں۔ کالم نگار نے اپنے ایک مضمون میں ایک عام آدمی اور بڑے آدمی کے فرق کو دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کے بقول:

"ایک عام آدمی قبرستان جاتا ہے تو وہ کہتا ہے السلام علیکم یا اہلِ قبور لیکن بڑا آدمی اگر قبرستان میں قدم رنجہ فرمائے تو وعلیکم السلام لیٹے رہیے، لیٹے رہیے۔ تاہم میرے ایک دوست دانا خردپوری کا کہنا ہے کہ بڑا آدمی ٹھیک کہتا ہے، لفٹ ہمیشہ زندہ آدمی کو کرانا چاہیے۔"[۱۸]

حالات وواقعات کے ساتھ ناموں کا استعمال بھی ذو معنی ہے۔ داناخر دپوری کا مطلب ہے نہایت عقل مند شخص۔ درحقیقت ہمارے معاشرے میں اس خود غرضی اور مفاد پرستی کو اتنا سراہا جاتا ہے کہ ایسے لوگوں کو عقل مند سمجھا جاتا ہے۔ کالم معاشرے کے رویے پر علامتی انداز سے گہرا طنز ہے لیکن در پردہ نہ صرف

حالات و واقعات بلکہ ناموں کا انتخاب بھی علامتی اور گہرا ہے جو اس کے اعلیٰ فکری اور فنی ذوق کی عکاسی کرتا ہے۔

مصنف نے اپنے فکاہی کالموں میں مختلف صعوبتوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ صعوبتیں دراصل تخلیقی نہیں بلکہ ادبی نوعیت کی ہیں۔ ایسے ہی ایک کالم میں وہ ایک غیر ملکی کے سفر نامہ کی روداد بیان کر رہے ہیں۔ جس میں انھوں نے نہایت مزاحیہ انداز میں ادب کی ان اصناف اور شاعروں کا ذکر کیا ہے جنھیں پڑھ کر قارئین لطف اٹھاتے ہیں:

> "پاکستان کے متعلق میرا تاثر یہ تھا کہ صنعتی طور پر بھی خاصا پسماندہ ملک ہے۔ چناں چہ ابھی تک اس معاملے میں پوری طرح خود کفیل نہیں ہو سکا مگر لاہور میں چند روزہ قیام کے دوران مجھ پر بھی انکشاف ہوا کہ پاکستان میں صنعتوں کا جال بچھا ہوا ہے بلکہ یہاں ایسی ایسی صنعتیں موجود ہیں جو ابھی تک تمام ترقی کے باوجود یورپ وغیرہ میں بھی قائم نہیں ہو سکیں۔ مثلاً صنعتِ اشتقاق، صنعتِ شبہ اشتقاق اور صنعتِ طباق، وغیرہ۔"(۱۹)

مزید ان کی تفصیل بیان کرتے ہوئے وہ ان صنعتوں سے منسلک مزید صنعتیں مثلاً صنعتِ تجنیس، تجنیس تام اور تجنیس تام متوفی وغیرہ سمجھانے کے باوجود بھی وہ ان صنعتوں کی اصل نوعیت نہ سمجھ سکے اور اس بات پر زیادہ حیران ہوئے کہ ان صنعتوں سے کسی کو روز گار نہ حاصل ہو سکا بلکہ اس بات پر بھی حیران ہوئے کہ ان صنعتوں سے منسلک شاعر حضرات اکثر بے روز گار ہوتے ہیں۔

ملک میں بڑھتی ہوئی کرپشن اور بد عنوانی کو کالم نگار نے نہایت مزاحیہ انداز میں اور گوراصاحب کے مشاہدات کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہاں صحافیوں کے ایک طبقے میں بلکہ بعض ادیبوں اور دانشوروں میں بھی یہ بات خوش آئند نظر آتی ہے کہ بین الاقوامی بھائی چارے، امن، دوستی اور بقائے باہمی کے اصولوں پر کار بند ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف مختلف سفارت خانوں میں آتے جاتے ہیں بلکہ ان کے ساتھ خوشگوار تعلقات استوار رکھتے ہیں کیونکہ یہ ان کی ضرورت ہے۔

> "خیر سگالی کی یہ فضا یک طرفہ نہیں تھی بلکہ یہ سفارت کار ان کے گھروں میں آتے جاتے تھے اور ان کے لیے بوتلیں اور ان کے بچوں کے لیے چوسنیاں اور تحفے تحائف لاتے تھے۔ یہ فضا اتنی خوش گوار تھی کہ پاکستانی صحافی ادیب اور دانشور بھی جب چاہتے ان کے ہاں چلے

جاتے پاکستانی صحافیوں اور ادیبوں کے اس مخصوص طبقے اور مختلف سفارت کاروں کے مابین خوشگوار تعلقات کا یہ عالم تھا کہ یہ سفارت کار بین الاقوامی بھائی چارے، امن، دوستی اور عوام سے تعلقات مستحکم کرنے والے منصوبوں میں ان کا ہاتھ بٹاتے اور دامے، درمے اور سخنے بھی امن کی مدد کرتے تھے۔ یہ عظیم لوگ ہیں۔ ہٹیس آف مار دیم؟"[۲۰]

یہ کالم موک یوٹوپیا کی جیتی جاگتی مثال ہے جس میں مصنف نے ایک ایسی دنیا کا نقشہ کھینچا ہے جو بظاہر اس کے لیے بھی اور سننے والوں کے لیے ایک یوٹوپیا لگتی ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے اور حقیقتِ حال سے واقف شخص اس کے طنز کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ بظاہر اچھے اور خوشگوار تعلقات دراصل باطن میں اپنا الو سیدھا کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ ان اچھے تعلقات کے درپردہ مفاد پرستی اور خود غرضی کا جو الاؤ سلگ رہا ہے اس سے دیکھنے اور پڑھنے والا واقف نہیں لیکن سمجھنے والا ضرور ان حالات سے آگاہی رکھتا ہے۔

علامت نگاری اور طنز یہ دونوں وہ ہتھیار ہیں جن کی مدد سے وہ معاشرے کی خامیوں اور برائیوں کو سامنے لاتا ہے۔ وہ ان پر روشنی ڈالتا ہے اور ان کو حل کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ اپنے کالم "ژولیدہ بیان مکڑی" میں وہ ایک افسانہ نگار کے حالاتِ زندگی، اس کی کسمپرسی کو اس خوب صورت انداز سے بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو اس سے ہم دردی محسوس ہونے لگتی ہے۔

"گھوڑے" کے عنوان سے تحریر کردہ کالم میں انھوں نے وہ تمام انسانی خصوصیات جن کے باعث ایک انسان فخر محسوس کرتا ہے اور ان کو اپنی ذات میں ایک مثبت اضافہ سمجھتا ہے، وہ تمام خوبیاں گھوڑوں میں دکھائی ہیں۔ یہ گھوڑا محنتی اور فرض شناس ہے، وقت کا پابند ہے۔ انسانوں کی مانند گھوڑوں کے اندر بھی طبقاتی تقسیم ہوتی ہے۔ انسانوں کی طرح اس کے اندر بھی بزدلی ہوتی ہے جسے اچھے الفاظ میں وضع داری کا نام دیا جاتا ہے۔ مثلاً تانگے میں جوتے جانے والے گھوڑے کے متعلق کالم نگار نے کچھ ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے:

"تانگے میں جوتے جانے والے گھوڑے کے عموماً بال بچے نہیں ہوتے، یہ ساری عمر تجرد گزر بسر کرتا ہے۔ اس کی کئی وجوہ ہیں جن میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس نے بچپن میں اپنے والد بزرگوار اور والدہ محترمہ کو بھی تانگے میں جتا دیکھا اور وہ خود تانگے کے پچھلے حصے میں

بندھی رسی کے ذریعے سارا دن ان کے ساتھ ساتھ گھسٹتا اور پھر بالغ ہونے پر تلاشِ معاش کے لیے اسے ان سے بچھڑنا پڑا ہوا۔"(۲۱)

انھیں احساسِ غلامی سخت ستاتا ہے۔ اس لیے وہ بارہا اپنی تحریروں کی مدد سے قوم کے اندر احساسِ خودی اور آزادی کی قدر و قیمت جگانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ نہ صرف مصنف کا اندازِ فکر بلکہ ان کا اسلوب بھی swift سے مماثلت رکھتا ہے۔ swift نے بھی اپنے ناول Guiliver's Travel میں گدھوں کے اندر انسانی خصوصیات دکھائیں اور انسانوں کو گدھوں سے مماثل دکھایا ہے جو صرف طنز کا ایک طریقہ ہے۔ اپنے کالم "سپیئر پارٹس" میں مصنف نے اپنا یوٹوپیا کچھ اس طرح سے بیان کیا ہے:

"وہ دن دور نہیں جب انسانی اعضا کے "سپیئر پارٹس" بھی بازار سے اسی طرح دستیاب ہوا کریں گے جس طرح ان دنوں کار یا موٹر سائیکل کے سپیئر پارٹس دستیاب ہوتے ہیں۔ اس صورت میں ٹانگیں اور بازو وغیرہ تو باہر کسی کنڈے کے ساتھ لٹکے ہوں گے، جب کہ آنکھ، کان اور دل وغیرہ چھوٹے پیکٹوں میں بند شوکیسوں میں سجے نظر آئیں گے۔ گاہک دکان دار سے کوئی عضو طلب کرلے گا تو وہ خود کپڑے سے لٹکا کر اس کی خدمت میں پیش کر دے گا۔"(۲۲)

ایسے حالات تو واقعی خواب میں ہی نظر آسکتے ہیں اور حقیقت سے ان کا دور کا واسطہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ایک ایسی خیالی تصوراتی اور مثالی دنیا جس کو مصنف پانا چاہتا ہے اور محسوس کرنا چاہتا ہے۔ اس کے مطابق کان، آنکھیں، ہونٹ، بازو اور زبان بازار سے سستے داموں فروخت ہوں گے۔ بقول غالب:

اور لے آئیں گے بازار سے گر ٹوٹ گیا
ساغر جم سے میرا جام سفال اچھا ہے

آگے وہ لکھتے ہیں کہ، کئی لوگ کانوں کے کچے ہوتے ہیں وہ اگر چاہیں تو بازار سے ایک جوڑی کانوں کی لے آئیں گے اور جو لوگ تمام عمر آنکھیں بند کر کے گزار دیتے ہیں ان کے لیے آنکھوں کا تحفہ نہایت قیمتی ثابت ہو گا۔ مصنف کے نزدیک ان تمام اعضا میں سب سے زیادہ منافع بخش خرید و فروخت غالباً بازوؤں کی ہو گی جس کی وجہ یہ ہے کہ حالیہ تحریک کے دوران اسلام ہمارا دین ہے، کے نعرہ بازوں کا دایاں بازو بھی آہستہ آہستہ دم توڑ رہا ہے اور سوشلزم ہماری معیشت ہے، کے ڈھنڈوروں کے باوجود ان کا "بایاں بازو" بھی ناکارہ

ثابت ہوا ہے۔ اسی یوٹوپیا کے بارے میں کالم نگار نے اپنے ایک کالم میں بڑی خوب صورت بات کی ہے۔ انھوں نے یوٹوپیا کو ایک خوب رُو محبوبہ سے تشبیہ دی ہے جس پر ہماری قوم گزشتہ پینتیس سال سے فریفتہ ہے اور یہ خوب رو خوابوں کی وہ منزل اور خوش حالی کا وہ سفر ہے جس کو ہم کل بھی حاصل کرنا چاہتے تھے اور جس کو ہم آج بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ مثالی ریاست، وہ خوش حال زمین۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا جانے ان پینتیس برسوں میں کتنے شہزادے اس شہزادی کا خواب دیکھتے دیکھتے مر گئے یا ویران رستوں میں بھٹک گئے۔ وہی ویران رستے اور بھول بھلیاں جن میں ہماری قوم آج تک بھٹک رہی ہے لیکن اس سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ان کی منزل یہ شہزادی تھی مگر ان کی عمریں ہر موسم میں ایک سبل کا سفر کرتے گزر جاتی ہیں۔

"میٹ لیس ڈے" کا تصور دیتے ہوئے کالم نگار نے اپنے mock-utopia کے لیے کچھ اور تجاویز بھی پیش کی ہیں جس کے مطابق جس طرح میٹ لیس سویٹ لیس اور ہیٹ لیس ڈنر ہوتے ہیں بالکل اسی طرح سے وطنِ عزیز میں سٹیس لیس ڈے کا انعقاد بھی ہونا چاہیے۔ اس روز کرسی کے استعمال پر مکمل پابندی عائد ہونی چاہیے۔ کیوں اس کرسی نے ہماری معاشرتی اور سیاسی زندگی کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ دفتروں میں اس کی وجہ سے سارے کام رک جاتے ہیں اور ایوانوں میں بھی بے سکونی کی یہ ایک بڑی وجہ ہے۔ وہ یہ بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اس روز تمام کرسیوں پر پابندی لگ جانی چاہیے۔ اس روز کوئی کرسی سے اٹھے اور تخت پر جا بیٹھے اور کہے کہ شکر ہے کرسی سے جان چھوٹی اور باقی عمر تخت پر گزاریں گے۔ یہاں کالم نگار نے بہ حیثیت قوم ہمارے معاشرتی رویوں پر گہرا طنز کیا ہے۔ ہمارے ملک میں وی آئی پی کلچر کو جو فروغ ملا ہے، اس کی بدولت غریب کی زندگی اور معمولاتِ زندگی بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ جن کے باعث وہ ایک لاعلاج احساسِ کمتری کا شکار ہو گیا۔ کالم نگار نے نہ صرف معاشرتی رویوں پر ہلکے انداز سے طنز کیا ہے بلکہ اس بیماری سے نجات دلانے کی ایک راہ بھی سجھائی ہے جو نہ صرف آسان بلکہ عملی بھی ہے۔

یوں تو مصنف کے اکثر کالموں کا آغاز و اختتام مزاحیہ یا ہلکے پھلکے انداز میں ہوتا ہے لیکن بعض اوقات وہ حالات کے باعث یا پھر کسی اور نازک معاملے میں سنجیدہ بات بھی کر جاتے ہیں جس کا مطلب بھی واقعی سنجیدہ ہی ہوتا ہے۔ جیسے کہ اس سے قبل بارہا کالموں میں انھوں نے وطن کی آزادی اور اہلِ وطن کے اندر بڑھتی غلامی کی روش کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اپنے ایک اور کالم میں جس کا عنوان بھی انھوں نے "امریکا کی

غلامی "رکھا ہے، اس مسئلے کو زیرِ بحث لاتے ہوئے اس کو تمام مسائل کی جڑ قرار دیا ہے اور اس غلامی سے نجات کو وہ ملک کے تمام مسائل کا حل گردانتے ہیں۔

> "حل تو شاید اس کے سوا کچھ نہیں ہم اپنے ملک کے دس کروڑ لوگوں کے دلوں میں وطن کے لیے اتنی شدید محبت کے جذبات پیدا کریں کہ وہ بڑے سے بڑے ظالم کی بالا دستی قبول کرنے سے انکار کریں اور اس کے لیے ٹھوس بنیادوں پر عادلانہ نظام نافذ کرنا پڑے گا، ایسا عادلانہ نظام جو تاریک گھروں کو روشن کر دے، جو پچکے گالوں کو بھر دے، جو بے رنگ ہتھیلیوں میں رنگِ حنا بھر دے اور جو خمیدہ کمر کو سرو کے بوٹے کی طرح سیدھا کر دے۔"(۲۳)

ان کے مطابق یہ ایک ایسا عادلانہ نظام ہو گا جس کے قیام سے دس کروڑ لوگوں کو یہ احساس ہو گا کہ ہندوؤں کے چنگل سے چھٹکارا پانے کے بعد ایک اسلامی ریاست میں انھوں نے دوبارہ جنم لیا۔ ایک ایسی اسلامی ریاست جس میں انسانوں کو وہ تمام ضروری آسائشیں مہیا ہوں گی اور جس کے باعث ان کے دل میں ایک احساسِ ذمہ داری پیدا ہو گا کہ وہ اپنے ملک کے لیے جان کی بازی لگا دیں گے۔ اس قومی احساس کے نتیجے میں یہ ۲۰ کروڑ انسان اپنے وطن کی آزادی کے لیے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں گے۔ اس کے ساتھ یہ منصفانہ نظام قوموں کی برادری میں ہماری عزت اور ساکھ کو بہتر بنائے گا۔ اقوامِ عالم کے ساتھ ہمارے تعلقات ہماری مرضی کے تابع ہوں گے اور ہمارے اندر ایک احساسِ تفاخر پیدا ہو گا۔

اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے مصنف نے اگلے کالم میں ایک مثالی ریاست کا تصور پیش کرتے ہوئے فیض کی شاعری کا سہارا لیا ہے۔

مقتل میں کچھ تو رنگ جمے جشنِ رقص کا
رنگین لہو پنجۂ صیاد کچھ تو ہو

کہ تن پہنیں، زبان سہی، آزاد کچھ تو ہو
دشنام، نالہ ہاؤ ہو فریاد کچھ تو ہو

بولو کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو
بولو کہ روز عدل کی بنیاد کچھ تو ہو

کالم نگار کے یوٹوپیا کا ایک اہم ستون اسلاموٹوپیا بھی ہے۔ وہ اسلام کے اصولوں پر مبنی ایک اسلامی ریاست کے خواہاں ہیں۔ اس کے ساتھ وہ حکمرانوں میں بھی ایک مثالی حکمران کی خوبیاں دیکھتے ہیں اور باقی کالم نگاروں کی طرح ان کا آئیڈیل بھی خلفائے راشدین کا طریقہ ہے جو سنت کے عین مطابق ہے۔ خدا اور رسول ﷺ پر ایمان لانے کے بعد ایک مسلمان کی ذمہ داریاں اس قدر بڑھ جاتی ہیں کہ اسے ایک پیاسے کتے کی پیاس کا بھی حساب دینا پڑتا ہے اور خصوصاً جو حکمران اسلام کا شیدائی ہو تو وہ ذاتی کام کرتے وقت سرکاری دِیا بجھا دیا کرتے تھے۔ ان کے لباس پر پیوند لگے تھے اور وہ اس وقت تک قیمتی لباس زیبِ تن کرنا پسند نہیں کرتے جب تک کہ ان کی رعایا اس قابل نہیں ہو جاتی کہ وہ بھی ایسا لباس پہن سکیں۔ اگر ان کا غلام گھوڑے پر سوار ہونے کی حیثیت نہیں رکھتا تو وہ بھی گھوڑے پر نہیں سوار ہوتے ۔ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح رعایا کے حالات معلوم کرنے کے لیے ساری رات گشت کرتے ہیں۔ اپنے حکام کو ذراسی بدعنوانی پر کڑی سزائیں دیتے ہیں۔ خود خیمے میں رہتے ہیں ، دوپہر کو کسی کھجور کے درخت کے نیچے تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے لیٹ جاتے ہیں۔ یہ ہے اعلیٰ درجے کے مسلمانوں ، حکمرانوں کا معیار جو صرف عبادات اور ذاتی خوبیوں تک محدود نہیں ہے۔

آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے رہنماؤں کو اپنے نظریے اور عقیدے کے معیار کے مطابق جانچنا چاہیے۔ اسلام کی تعلیمات کے عین مطابق حکمران کو خراج سے نہیں بلکہ کثرتِ رائے سے منتخب ہونا چاہیے۔ حکمرانوں کے اوصاف قرآن مجید اور احادیث نبوی کے مطابق ہونے چاہئیں جن کا علمی نمونہ خلفائے راشدین کے دورِ حکومت میں نظر آتا ہے یا پھر آج کی جدید غیر مسلم فلاحی ریاستوں میں اس کی مثال نظر آتی ہے جہاں یتیموں، بیواؤں ، معذوروں اور بے روز گاروں کو حکمرانوں کی خداترسی کی ضرورت نہیں ہوتی ہے بلکہ اسلامی فلاحی ریاست یہ حق خود انھیں دیتی ہے۔ جمہوریت مصنف کا پسندیدہ طرزِ حکمرانی ہے۔ ان کے نزدیک جمہوریت اور پاکستان لازم وملزوم ہیں۔ ملک میں جمہوریت کو پنپنے کے مواقع ملنے چاہئیں۔ جمہوریت کے فوائد گنوانے کے ساتھ ساتھ مصنف اس کے مضر اثرات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ اس ضمن میں اکرام ناصر کی غزل کا حوالہ دیتے ہیں:

شجر ہر کوئی فرزند شجر باقی نہیں رہتا
مرا مطلب ہے ان پر بھی ثمر باقی نہیں رہتا

ہمارے شہر میں عیشہ قدوں کی حکمرانی ہے
جو ان کے سر سے اونچا ہو وہ سر باقی نہیں رہتا

مجموعی طور پر کالم نگار ایک مثبت سوچ رکھنے والی پر امید شخصیت ہیں۔ ان کے کالم فکاہی ہوتے ہیں اس لیے اکثر سنجیدہ بات کو بھی ہنسی میں اڑا دیتے ہیں لیکن کبھی کبھی صورتِ حال سے دلبر داشتہ اور مایوس ہو کر ملک کی حالتِ زار کو پیش کرنے کے لیے وہ مزاحمتی شعرا کی شاعری کا سہارا بھی لیتے ہیں جو اُن کے دردِ دل کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔ اس کا مقصد حکمران طبقے کی توجہ اس جانب مبذول کروانا ہے۔ کیوں کہ شاعری بطورِ خاص ہر ایک نہیں پڑھتا لیکن اس طرح سے یہ اشعار لوگوں کی نظروں سے گزرتے ہیں۔

بے وقار آزادی ہم غریب ملکوں کی
سر پہ تاج رکھا ہے بیڑیاں ہے پاؤں میں

منیر اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

ہمیں تسلیم ہے تم نے کلام رب اٹھایا ہے
دکھی انسانیت کا بوجھ لیکن کب اٹھایا ہے

اور آگے چل کر یہ شعر کہ:

ہر درد کی حد ہوتی ہے یوں لگتا ہے جیسے
اس درد کا نہ زماں ہے نہ مکاں

اور اس شعر میں تو کالم نگار مایوسی کی انتہا پر نظر آتے ہیں:

خدا نہ کرے کسی قوم پر یہ وقت آئے
کہ خواب دفن رہیں شاعروں کے سینوں میں

کالموں میں فرضی کرداروں اور فرضی ماحول کی مدد سے مصنف دل کی بات بھی کر دیتے ہیں۔ تنقید بھی کرتے ہیں اور جس کے بارے میں کہا جاتا ہے، اس کو برا بھی محسوس نہیں ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک جگہ مصنف نے اپنا کالج کا واقعہ بیان کیا ہے کہ میں نے اپنے کو لیگ سے کسی جائز بات پر اختلاف کیا لیکن بحیثیت قوم ہمیں یہ تنقید اور اختلاف کی عادت ہی نہیں ہے۔ ان کے کالموں میں مثالیت پسندی بھی غالب نظر آتی ہے۔ مثلاً ان کے کالم "عدل کو بھی صاحبِ اولاد ہونا چاہیے" میں انھوں نے سابق چیف جسٹس ارشاد حسن خان کا اس طرح ذکر کیا ہے:

"پاکستان کے سابق چیف جسٹس ارشاد حسن خان کی آپ بیتی پڑھنے کے بعد ایک بات کی داد دینا پڑتی ہے اور وہ ہے ان کی صاف گوئی۔ انھوں نے اپنی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں چھپایا۔ سادہ سی زبان میں اپنی زندگی کی کہانی بیان کی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جو شخص پاکستان کے اہم ترین عدالتی عہدے پر براجمان رہا، اسے اپنے ماضی میں غربت میں گزارے ایام پر کوئی شرمندگی نہیں، یہ ان کے لیے باعثِ فخر ہیں بلکہ ان واقعات پر ہم سب کو فخر ہونا چاہیے۔"(۲۴)

مزید بتاتے ہیں کہ ایک ایسا شخص جو بچپن میں ہی یتیم ہو گیا جس کے پاس سرکاری سکول کی فیس بھی جمع کروانے کے پیسے نہ تھے لیکن اس نے اپنی محنت اور یقینِ کامل سے کامیابی کی منزلیں طے کیں اور فخر سے یہ کہ محنت میں عار نہیں ہم انگریزوں کے کتے نہلانے والوں کی اولاد نہیں ہیں، ہماری میراث علم اور تربیت ہے۔

ملک میں انصاف کی عدم دست یابی کا ذکر بھی مصنف نے اپنے کالم "انصاف کا جنازہ" میں بڑے ہلکے پھلکے انداز میں کیا ہے:

"مجھے جب کسی عدالتی فیصلے کے بارے میں رائے لینا ہوتی ہے تو میں استادِ محترم انصاف علی انصاف سے رجوع کرتا ہوں۔ بفضلِ خدا وہ فوت ہو چکے ہیں مگر ان کا فیض ابھی تک جاری ہے۔"(۲۵)

اس کالم میں طنز کا عنصر نمایاں ہے۔ کالم نگار کے نزدیک ہمارے ملک میں انصاف کا قتل ہو چکا ہے ،اس کا جنازہ پڑھایا جا چکا ہے۔ان سطروں میں نظامِ انصاف پر گہرا طنز ہے۔ انصاف جس کا وجود بقول کالم نگار ختم ہو چکا ہے لیکن کرشماتی انداز سے اس کے ثمرات ابھی تک سمیٹے جا رہے ہیں۔

علاوہ ازیں ان کے کالموں میں سوانحی یا ذاتی اثرات کم نظر آتے ہیں لیکن کبھی کبھی جب ان کے مزاج میں رومانوی اثرات نمودار ہوتے ہیں تو کالموں میں بھی وہ رنگ نظر آتا ہے۔ اپنے کالم "میرے بچپن کے دن" میں انھوں نے ۱۹۴۷ء کی ہجرت کا ذکر کیا ہے۔جب وہ امرتسر سے وزیر آباد ہجرت کر کے آئے تھے۔ بچپن کے خوب صورت دن، سکول کی دلچسپیاں، دوستیاں، ہنسی مذاق، وہ سب کو یاد کرتے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ ایک سماں سا بندھ گیا ہے۔

وہ غلامی سے نفرت کرتے ہیں، آزادی ان کی معشوقہ ہے۔اس لیے دنیا میں ہر آزادی کی جنگ لڑنے والا سپاہی ان کا آئیڈیل ہے۔ مصنف نے سیّد علی گیلانی کی رحلت پر ایک کالم لکھا جس میں انھوں نے اس حریت پسند رہنما کو خراجِ تحسین پیش کیا اور ان کے اعزاز میں ایک نظم درج کی :

"میری آنکھوں میں اک ستارہ خوشی سے رقصاں
پلک کی دہلیز تک پہنچتا ہے اور حیرت سے ستارے بدلے ہوئے مناظر کو دیکھتا ہے
مگر یہ قصہ بہت پرانا سا ہو گیا ہے
"میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا،
کہ چار سو روشنی ہے اور بے شمار آنکھیں غزالی آنکھیں
میرے لہو میں اتر رہی ہیں
میں پوچھتا ہوں کہ اس نگر میں یہ روشنی کا غبار کیسا؟
ہواؤں میں یہ خمار کیسا؟
فضاؤں میں اک صدا ابھرتی ہے
اور کہتی ہے،
یہ شہیدوں کے خون کی مشعلیں ہیں

نگر نگر میں ہوا چراغاں
یہ ماؤں بہنوں کی بیٹوں کی سروں سے اتری رداکا صدقہ
یہ روشنی جیسی گالوں، گلوں میں
نیزوں کو زیوروں کی طرح پرونے سے
ہر دریچے سے آرہی ہے
عجب منظر دکھارہی ہے۔"(۲۶)

وہ اپنے خیالوں کی دنیا میں ایک ایسا نگر آباد دیکھتے ہیں جس میں کشمیر کی سرزمین آزاد ہے، وہاں شہیدوں کی قربانیوں کی بدولت ہر طرف چراغاں ہے۔ روشنی ہے، آزادی ہے جو اِن شہیدوں کی ماؤں بیٹوں کے سر سے اتری رداؤں کا صدقہ ہیں۔ وہ چشمِ تصور میں کشمیر کو آزاد دیکھتے ہیں۔

"طوطا کہانی"، کے عنوان سے لکھے گئے کالم میں کالم نگار نے افسانوی کردار زہر انبالوی ولد قہر انبالوی کو متعارف کروایا ہے اور ان کے ذریعے ملک کی سیاسی صورتِ حال کو بیان کرتے ہیں۔ وہ ایسے طوطوں کی کہانی بیان کرتے ہیں جن کو ان کے مالک نے پنجرے کی بجائے سوئی سے باندھ کر رکھا ہوا ہے اور بظاہر ان کی آزادی کا تاثر دیتے ہیں لیکن درحقیقت یہ غلام ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ہمیں ان طوطوں کو بظاہر آزاد فضا مہیا کرنا ہو گی، وگرنہ دیکھنے والے کہیں گے کہ پنجروں میں بند طوطے اپنے آقا کی بولی بول رہے ہیں۔

"چناں چہ ایک طوطا ہر وقت کرپشن کرپشن کہتا رہتا ہے۔ ایک طوطا کہتا ہے جمہوریت غیر اسلامی نظام ہے، ایک طوطے کو میں نے ایک دو سیاسی لیڈروں کے نام سکھائے ہیں، وہ ہر وقت ان کو گالیاں دیتا رہتا ہے، ایک طوطے کو میں نے صرف زندہ باد کا نعرہ سکھایا ہے۔"(۲۷)

جہاں ان کے کالموں میں مزاح کا عنصر ملتا ہے، وہیں طنز بھی نظر آتا ہے۔ اس کالم میں انھوں نے ملک کے نظام حکومت اور افسر شاہی پر ڈھکے چھپے الفاظ میں طنز کیا ہے۔

"اگر کوئی معروف شخصیت ان کے پاس آ جائے تو اسے پورا احترام دیتے ہیں، چائے پلاتے ہیں اور جس کام سے وہ شخصیت ان کے پاس آئی ہوتی ہے، اسے یقین دلاتے ہیں کہ کام ہو جائے گا۔ مگر وہ کام کبھی نہیں ہوتا، تاہم خدا کا شکر ہے کہ کام ہو جائے گا مگر وہ کام کبھی نہیں ہوتا۔"(۲۸)

ان جملوں میں کالم نگار کا طنز واضح ہے۔ افسر شاہی کے رویے اور دفتری معاملات میں ہونے والی بے ضابطگیوں کا کھل کر اظہار کیا گیا ہے۔ ان پر تنقید کے ساتھ دبے لفظوں میں انھیں درست کرنے کو کہا گیا ہے۔ ۱۰ مارچ ۲۰۱۲ء کو تحریر کیے گئے کالم بہ عنوان "آزمائے ہوئے لوگ" میں عطاء الحق قاسمی نے ملک میں جاری ہونے والے ترقیاتی منصوبوں پر اطمینان کا اظہار کیا ہے:

"حکومت نے غریب عوام کو چھت فراہم کرنے کے لیے "اپنا گھر" سکیم کا آغاز کیا۔ مشرف دور میں یہ سکیم ختم نہ کی جاتی تو آج لاکھوں افراد کے سر پر ان کی اپنی چھت ہوتی۔ سندھ کے بے زمین ہاریوں میں زمینیں تقسیم کر کے انھیں مالکانہ حقوق ادا کیے۔ پاکستان کی معاشی ترقی کی شرح خطے میں سب سے زیادہ یعنی ۹ فی صد تھی جو اب خطے میں سب سے کم ۲ء۴ فی صد رہ گئی ہے۔"(۲۹)

وہ کہتے ہیں کہ معاشی اعداد و شمار کے مطابق یہ دور بہترین تھا اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مصنف کا یوٹوپیا ہے۔ ان کے نقطۂ نظر میں اگر موجودہ حکومت کو اپنی مدت پوری کرنے کا موقع ملتا ہے تو پاکستان کی قسمت بدل کر رکھ دے گی۔ ان کے مطابق اسی جماعت (مسلم لیگ ن) نے جنوبی ایشیا میں سب سے پہلے معیشت کو سرکاری کنٹرول اور بیوروکریسی کے چنگل سے آزاد کر دیا۔ موٹر وے اسی دور میں تعمیر ہوئی۔ جنوبی ایشیا کا سب سے پہلے جدید ایئرپورٹ تعمیر کیا گیا۔ خطے میں سب سے پہلے پاکستان میں جدید ترین مواصلاتی نظام کے لیے فائبر آپٹک کا انفراسٹرکچر قائم ہوا۔ گوادر پورٹ پر کام ہو رہا ہے جس کے باعث دبئی سے بڑی بندرگاہ بن سکے گی۔

"ملک کے کسی کونے میں علیحدگی کی تحریک نہیں تھی۔ لوڈشیڈنگ کا نام تک نہ تھا اور پاکستان فالتو بجلی پیدا کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ ڈوبتے ہوئے بنکوں میں دنیا کے بہترین بنکاروں کو لا کر انھیں منافع بخش اداروں میں بدلا۔"(۳۰)

مزید یہ کہ، اور اس کے ساتھ یہ اعزاز کیا کم تھا کہ شدید عالمی دباؤ اور دھمکیوں نیز ذاتی مفاد کی پیشکش کے باوجود بھارت کے پانچ ایٹمی دھاکوں کے جواب میں چھ ایٹمی دھماکے کر کے قوم کو مایوسی سے بچایا جس کے بعد بھارتی وزیر اعظم پہلی بار مینارِ پاکستان آئے جو اس بات کا ثبوت تھا کہ انھوں نے پاکستان کے وجود کو آج کی تلخ حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ اس کالم میں مجموعی طور پر حکومت کی کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کیا گیا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس صورتِ حال میں کالم نگار کے یوٹوپیا کے خدوخال سنورتے نظر آتے ہیں اور وہ پُر امید ہیں کہ اگر یہی صورتِ حال رہی اور ترقی کی یہی رفتار رہی تو انشاء اللہ پاکستان جلد ترقی پذیر ممالک کی صف سے نکل کر ترقی یافتہ ممالک کی فہرست میں جلد شامل ہو جائے گا اور ایک مثالی ریاست کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائے گا اور پاکستان ایشن ٹائیگر (Asian Tiger) بن کر خطے میں ابھرے گا۔

سوئفٹ کی طرح کالم نگار کے ہاں بھی موک یوٹوپیا نظر آتا ہے۔ موک یوٹوپیا کے بنیادی عناصر میں طنز، تنقید، علامت نگاری فرضی ماحول اور کردار شامل ہیں۔ کالم نگار سوئفٹ کی طرح بظاہر تو ملکی صورت حال کی تعریف کرتے ہیں مگر ذو معنی انداز میں وہ طنز اور تنقید کے تیر برساتے ہوئے اس بات کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ ملکی صورت حال ایک mock utopia کی مانند ہے۔ سب کچھ اچھا نظر آنے کے باوجود کچھ بھی اچھا نہیں ہے۔ کچھ کالموں میں کالم نگار واضح الفاظ میں اپنا موقف دیتے ہیں اور تھامس مور کے انداز میں ملک کی بہتری کے لیے کچھ تجاویز بھی پیش کرتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ان کے کالموں میں علامت نگاری اور فرضی فضا قاری کو لطف بھی دیتی ہے اور وہ اس کا مدعا بھی سمجھ جاتا ہے۔

۲۔ منو بھائی بحیثیت فکاہی کالم نگار

منو بھائی ۶ فروری ۱۹۳۳ء کو وزیر آباد میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک صحافی، کالم نویس، شاعر اور پاکستان کے معروف مصنف تھے۔ ان کا اصل نام منیر احمد قریشی تھا۔ اپنے ادبی سفر کا آغاز انھوں نے اخبار میں بطور مترجم کے کیا پھر اس کے بعد بطور ڈراما نویس کام کا آغاز کیا۔ بطور ڈراما نگار منو بھائی کا سب سے مشہور ٹی وی ڈراما "سونا چاندی" ہے جو ۱۹۸۲ء میں نشر ہوا۔ ۲۰۰۷ء میں انھیں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے نوازا گیا۔ منو بھائی نے ۱۹ جنوری ۲۰۱۸ء کو وفات پائی۔

منو بھائی اپنی صحافتی زندگی کے آغاز میں کافی عرصہ رپورٹنگ کے شعبے سے بھی منسلک رہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ معاشرے کا کوئی پہلو اور زندگی کا کوئی بھی رُخ بھی ان کی تاک نظروں سے بچ نہ سکا۔ انھوں

نے تمثیل نگاری کا فن کسی استاد سے نہیں بلکہ زمانے سے سیکھا۔ اس کے بعد ۱۹۵۰ء میں راولپنڈی کے اخبار میں کام شروع کیا۔ اس کے بعد اور احمد ندیم قاسمی کی وساطت سے روزنامہ "امروز" سے وابستہ ہوگئے اور اسی اخبار میں "گریبان" کے عنوان سے کالم لکھتے رہے۔ اسی مستقل عنوان سے بعد میں وہ روزنامہ "مساوات" اور پھر تاحیات روزنامہ "جنگ" میں کالم تحریر کرتے رہے۔

انھیں معاشرے کا ضمیر بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ اپنے کالموں کے ذریعے سماج میں پائی جانے والی برائی پر نہ صرف لعن طعن کرتے ہیں بلکہ معاشرے کی اصلاح کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ روزنامہ "جنگ" میں اپنے فکاہیہ کالم "گریبان" کے ذریعے معاشرے کی برائیوں اور لوگوں کے رویوں پر اپنی روایتی شگفتگی سے طنز کے تیر برسائے۔ کالم کے علاوہ ان کے لیے اپنے جذبات کا دوسرا ذریعہ اظہار پنجابی شاعری ہے۔ ان کی نظم "اجے قیامت نئیں آئی" میں اپنے اردگرد ہونے والے ظلم پر اپنے مخصوص انداز میں طنز اور نشتر برستے محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ دراصل وہ اس دشت کی سیاحی میں طویل جدوجہد اور سیاست کے گہرے مشاہدات کو اپنی شاعری، کالم نگاری اور تمثیل نگاری میں شامل کیے بغیر نہ رہ سکے۔ اسی لیے ان کا لکھا معتبر ٹھہرا۔ اس کے علاوہ انھوں نے غیر ملکی شاعری کے تراجم بھی کیے۔

منو بھائی کا تعلق ایک تعلیم یافتہ اور اَدبی خاندان سے تھا۔ پنجابی کے مشہور شاعر شریف کنجاہی ان کے ماموں تھے۔ ان کا اصل نام نذیر احمد تھا۔ ۱۹۴۷ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد منو بھائی نے گورنمنٹ کالج کیمبل پور کا رُخ کیا جہاں انھیں علم دوست اساتذہ کی سرپرستی حاصل ہوئی اور انھوں نے پنجابی شاعری میں طبع آزمائی کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد منو بھائی نے ۱۹۵۰ء کی دہائی کے اواخر میں راولپنڈی کے ایک اخبار میں "اوٹ پٹانگ" کے نام سے کالم نگاری کا آغاز کیا۔ انھیں منو بھائی کا لقب مشہور شاعر و دانشور احمد ندیم قاسمی نے عطا کیا اور اسی نام سے وہ باقی زندگی پہچانے جاتے رہے۔ احمد ندیم قاسمی کے زیرِ سایہ منو بھائی نے صحافتی ذمہ داریاں نبھانے کے ساتھ ساتھ "گریبان" کے نام سے کالم نگاری کا آغاز بھی کر دیا۔ یوں تو منو بھائی اپنی زندگی میں مختلف اخبارات سے وابستہ رہے لیکن آخر میں ان کی وابستگی فقط اخبار جنگ تک محدود ہوگئی اور تادم مرگ روزنامہ جنگ میں "گریبان" کے نام سے کالم لکھتے رہے۔ غریب اور پسے ہوئے طبقے کے مسائل ان کے کالموں کا موضوع ہوتے ہیں۔ انسانیت سے محبت کرنے والے منو بھائی نے تھیلیسیمیا، ہیموفلیا اور بلڈ کینسر جیسے

امراض میں بچوں کے لیے اپنی زندگی کا آخری حصہ وقف کر رکھا تھا۔ ان مریضوں کے لیے انھوں نے ادارہ بھی قائم کیا جو آج ان کی وفات کے بعد بھی ان مریضوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

منو بھائی کی کالم نگاری میں یوٹوپیا

انھوں نے اپنے تفریحی کالموں پر مشتمل کتاب "جنگل اداس ہے" شائع کروائی۔ صحافت اور شاعری سے ادبی زندگی کا آغاز کرنے والے منو بھائی تقریباً چھ دہائیوں تک ادب اور صحافت کے افق پر چھائے رہے۔ ان کے کالم "گریبان" میں فکاہیہ کالموں کی روایتی شگفتگی اور روزمرہ کے ہلکے پھلکے واقعات پر تبصرہ کے ساتھ عالمی سیاست، تاریخ اور معیشت کا گہرا مطالعہ اور شعور بھی نظر آتا ہے جو ان کی تحریر کی سادگی اور حقیقت پسندانہ روش کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ اس کالم میں اس نے ملک کے سیاسی حالات میں مثبت تبدیلی کی جانب توجہ دلائی ہے۔

> "۵۰ سال پہلے پاکستان پیپلز پارٹی کی تشکیل اور جناب ذوالفقار علی بھٹو کی سیاست میں آمد تاریخ کا وہ دور تھا جو بقول کارل مارکس "جب حالات تیار ہو جائیں تو وہ تبدیلی کے لیے ایسا لیڈر تلاش کر ہی لیتی ہے جو تبدیلی کے عمل کو منطقی انجام تک لے جا سکے۔" ذوالفقار علی بھٹو ایسی شخصیت تھے جن کے ہاتھ عوام کی نبض پر تھے اور حالات کی پرکھ تاریخی تناظر میں کوئی ہی شاید ان سے بہتر کر سکتا ہو۔"[۳۱]

عطاء الحق قاسمی اور دوسرے سیاسی و سماجی کالم نگاروں کی مانند منو بھائی کے کالموں میں بھی مثالیت پسندی کا رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جب تک سیاسی و عملی میدان میں ملک کو ایسے حکمران نصیب نہیں ہوں گے جن کی شخصیت مکمل اور قابلِ تقلید ہو گی، جن کے قول و فعل میں تضاد نہیں ہو گا۔ اس وقت تک ملک کی تقدیر بدلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تبدیلی کی توقع اس وقت تک نہیں کر سکتے ہیں جب تک ہمارے حکمران خود بہتر نہیں ہوں گے اور جب تک ان کی شخصیت ملک و ملت کے لیے مثبت اور مخلص نہیں ہو گی اس وقت تک کسی بہتری کی توقع کرنا فضول ہے۔ مصنف کی پسندیدہ شخصیت اور ان کا آئیڈیل ذوالفقار علی بھٹو ہے جس سے ان کے بقول قوم نے بھی بہت سی امیدی بھی وابستہ کر رکھی تھیں اور ایسا نہیں ہے کہ وہ پوری نہیں ہوئیں۔ تبدیلی کے عمل کو ان کے دور میں مہمیز ملی۔ ملکی ترقی اور سلامتی کے لیے ناگزیر اقدامات اٹھائے گئے جن کے ثمرات سے قوم آج بھی اٹھا رہی ہے۔

"جمہوری نظام کو اپنانے والے ملکوں میں تمام فیصلے جمہوریت کے ہوتے ہیں۔ لوگوں میں اختلافات اتنی زیادہ اہمیت نہیں حاصل کر سکتے کہ قومی ترقی کا پہیہ ہی جام کر کے رکھ دیں۔ تاریخ کا چہرہ بگاڑ دیں اور جغرافیہ کا حلیہ ہی تبدیل کر دیں۔ جمہوری نظام کو اپنانے والے ملکوں میں اختلافات ہوتے ہیں بھی ہیں تو نظریاتی، آئین اور قانون، ذاتی، گروہوں، مفاداتی جاگیر دارانہ عالمی طاقتوں کے اشاروں کو بنیاد بنا کر نہیں ہوتے۔"(۳۲)

Utopia یا مثالی ریاست کے لیے بنیادی لوازم میں ایک موزوں ترین طرزِ حکومت ہے اور منو بھائی کے نزدیک یہ جمہوریت کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ ان کے بقول، جمہوریت عوام اور حکمران رویوں کو صبر تحمل اور برداشت کا سبق دیتی ہے۔ دوسرے کی رائے سننے اور اس کا احترام کرنے کا درس دیتی ہے۔ اختلافات کو سننے اور ان کو برداشت کرنے کا حوصلہ جمہوری نظام کے اندر ہوتا ہے۔ اس میں آزادی رائے اور اختلافِ رائے کا حق عوام کے پاس ہوتا ہے اور عوام ہی طاقت کا اصل سرچشمہ ہیں۔ کسی ایک پاکستانی نظریہ کسی دوسرے پاکستانی کے سے نہیں ملتا، قائدِ اعظم کے بارے میں بھی ہر شخص کا ایک اپنا تصور ہے۔ ان تمام تصورات اور نظریات کو جمع کر دیا جائے تو پاکستان کی حالت وہ بن جاتی ہے جو ہم نے گزشتہ نصف صدی کی محنت شاقہ سے بنائی ہے۔ ۱۴ / اگست ۲۰۱۷ء کے حوالے سے اتنا ہی کہ ہم سب قائدِ اعظم کے اصل نظریۂ پاکستان کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں اور کسی نئے پاکستان کو نہیں بلکہ پرانے پاکستان کو کھوج نکالیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ آج کل نئے پاکستان کے بہت چرچے ہیں اور اس کے حصول کی تگ و دو میں سب لگے ہیں۔ ان کے مطابق پرانا پاکستان بھی کچھ اتنا خراب نہیں تھا۔ ہم محنت سے اس کو درست کر سکتے ہیں۔ مصنف نے ہلکے پھلکے انداز میں نئے پاکستان کے تصور کا مذاق اڑاتے ہوئے روایت پسندی اور حقیقت پسندی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ان کا بنیادی نقطۂ نظر ملک کی سیاسی اور نظریاتی اساس ہے۔ ان کے مطابق، اگر اہلِ وطن اس اساس کو سمجھ لیں گے تو وہ اپنے علیحدہ قومی تشخص اور وطنیت کا دفاع کر سکیں گے۔

"لوگوں کے دکھوں کے سارے مداوے حکومتوں کی پالیسیوں کے بس میں نہیں ہوتے۔ اس سلسلے میں عام لوگوں اور غریب انسانوں کا کردار واجب الاحترام دکھائی دیتا ہے جس کے

ذریعے بیماروں کے علاج کی سہولت، بھوکوں کو کھانا کھلانے کی کوشش اور محتاجوں کی محتاجی
دور کرنے کی خواہشوں کی بھی قدر کرنا پڑتی ہے۔"(۳۳)

مصنف نے بالواسطہ طریقے سے اسلامی فلاحی ریاست کا تصور دیا ہے اور رویہ حقیقت پسندانہ ہے۔ انھوں نے لوگوں کو کوئی خواب نہیں دکھائے اور کوئی بلند و بالا باتیں نہیں کی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ، عوام کے دکھ درد کا خیال رکھنا صرف اور صرف حکومت کا فرض نہیں ہے بلکہ ایسے لوگ جن کو اللہ نے اپنی بیش بہا نعمتوں سے نوازا ہے، ان کا یہ بھی فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے مال میں سے غریبوں، یتیموں اور مسکینوں کا حصہ نکالیں۔ اسلام نے بھی زکوٰۃ ان لوگوں پر فرض کی ہے اور یہ حکم ہے کہ وہ اپنے مال کا چالیسواں حصہ ان لوگوں کو دیں جو اس کے مستحق ہیں۔ یہاں کالم نگار اسلاموٹوپیا کے قریب نظر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حقوق العباد کی ہمارے دین میں بہت تلقین کی گئی ہے اور اللہ کا حکم ہے کہ میں اپنے حقوق تو اپنے بندوں پر معاف کر سکتا ہوں لیکن اپنے بندوں کے حقوق کو معاف نہیں کر سکتا۔ ہمسائے کے حقوق کی اس قدر تلقین کی گئی ہے کہ رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ شاید ہمسائے کو وراثت میں حق دار ٹھہرانے کا حکم نہ دیا جائے۔ ایک ایسا مذہب جو ہمسائے کو بھوکا سونے پر سرزنش کرتا ہے بلکہ ایمان کی کمزوری کا دعویٰ کرتا ہے وہ بیماروں، مسکینوں اور محتاجوں کی مدد کو کیوں کر دینی فریضہ نہیں قرار دے گا۔ ان ہی حقوق و فرائض کی بنیاد پر ایک ایسی فلاحی ریاست کا قیام عمل میں آتا ہے جس میں سب ایک بند مٹھی کی مانند ایک ہوتے ہیں۔

وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ فلاحی ریاست کا تصور سب سے پہلے مذہب اسلام نے دیا ہے لیکن وہ آج برطانیہ میں فلاحی ریاست (Welfare state) قائم ہے۔ ایک ایسی مملکت جو غریبوں کو راشن، بیماروں کو علاج اور بے روزگاروں کو امداد مفت فراہم کرتی ہے۔ اس لیے اس ملک میں ایک ایسی صحت مندانہ فضا قائم ہے جس میں ہر ایک دوسرے کی مدد کر کے خوشی محسوس کی جاتی ہے۔ برطانیہ کے مسلمانوں نے غیر مسلم تاجروں اور سپر سٹورز کے مالکان کے اس جذبے قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور امید ظاہر کی ہے کہ اس جذبے کا اظہار پورے ماہ کے دوران جاری رہے گا۔ اگرچہ یہ ایک چھوٹی خبر ہے لیکن اس کے اندر ایک جذبہ سچا ہے۔ برطانیہ کے تمام لوگ بیس سے تیس فی صد تک سستی اشیائے خورد و نوش حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے اور ان کے دلوں اور ذہنوں میں اپنے ملک کی مسلم کمیونٹی کی قدر و منزلت بڑھے گی۔ عام مذاہب کی عزت و احترام دینِ اسلام کی تعلیمات میں صرف شامل ہی نہیں بلکہ لازم ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ

ہم کسی کے دین کا احترام کریں گے تو کوئی دوسرا ہمارے دین کا احترام کرے گا۔ اگر اسلام نے دیگر مذاہب کے مقابلے میں زیادہ مقبولیت حاصل کی ہے تو اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ دین و مذہب کے معاملے میں زبردستی سے گریز کیا جاتا ہے۔ اسلام کی تعلیمات پر چلنے والے اللہ کو مشرق، مغرب، جنوب اور شمال تمام سمتوں میں سانس لینے والی انسانیت کا خدا سمجھتے ہیں اور سب کی بہتری اور سب کی نجات کو مقدم قرار دیتے ہیں۔

جنتِ ارضی تعمیر کرنے کی کوشش میں مصروف بزرگان پاکستان کی ثقافت، تہذیب و تمدن کی رونقوں اور سرگرمیوں میں اضافہ کے ذریعے اپنے ملک کے تخلیقی تاثر کو پیش کرنے میں ہمارے ملک کی تہذیبی اور ثقافتی گھرانوں کا بنیادی تعلق رہا ہے اور وہ تہذیب کے آسمان پر ستاروں کی طرح روشنی بکھیر رہے ہیں۔ ان گھرانوں میں امتیاز علی تاج، سے یاسمین اور بیگم نسیم طاہر تک آنے والے گھرانے شامل ہیں۔ اس فہرست میں ترقی پسند ادیبوں کے نام بھی آتے ہیں جس کی ابتدا روشن خیالی سے ہوئی ہے اور یہ امید بھی رکھنی چاہیے کہ پاکستان میں بھی ایسے والدین کی معقول تعداد موجود ہے جو اپنے ملک کو اور اپنے بچوں کی جائز ضروریات پوری کرنے والے جنتِ ارضی میں تبدیل کرنے کی طاقت اور صلاحیت رکھتے ہیں۔

یہ سب بتانے کے بعد وہ کہتے ہیں کہ ہمارا فرض یہ ہے کہ اپنے قابلِ قدر اور لائق احترام بزرگوں کے مثبت پہلوؤں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں، ان کے محبت، پیار اور انسانیت کی خدمت کے پیغامات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ ان کے حوالے یا بہانے سے اپنے اندر کے غصے اور اخلاقی مواد کو بروئے کار لانے اور گندگی پھیلانے کی کوشش نہ کریں۔ دوسرے لفظوں میں فیض احمد فیض، ندیم احمد قاسم اور ندیم جیسے بزرگوں سے ملنے والے سرمائے کو برباد کرنے یا اجاڑنے کی بجائے مناسب اور موزوں انداز میں سب کے بھلے کے لیے استعمال کریں کہ اس میں ہم سب کی بہتری ہے۔ ہماری نجات کا بھی یہی مثبت راستہ ہو گا۔

اپنے ایک اور کالم میں وہ ایک ڈاکٹر کے حوالے سے انسانی فہم کے حوالے سے اپنے یوٹوپیا کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> "ڈاکٹر اسلم صاحب نے یہ بھی بتایا کہ زمانے اور وقت کے ساتھ انسان دماغ میں تین گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ یہ اضافہ دماغ کی طاقت اور سوچ بیچار کی قوت کا ہے۔ کبھی انسانی دماغ بندر کی طرح سنگل تھا پھر علم اور معلومات اور فرائض کی ادائیگی کی اہلیت کے اساتھ انسانی دماغ

> ڈبل یعنی دگنا ہو گیا۔ اس کے بعد انسانی فہم اور فراست میں اضافہ کی ضرورت کے تحت اس کی طاقت تین گنا ہو گئی۔ اب انسانی زمانہ مستقبل کے تقاضے پورے کرنے کے لیے چار گنا ترقی پانے والا ہے۔" (۳۴)

آگے لکھتے ہیں کہ، کچھ بتایا نہیں جا سکتا کہ چار گنا طاقت کے دماغ کا میدانِ عمل کہاں تک وسیع ہو گا لیکن یہ تو سوچا جا سکتا ہے کہ جو کچھ ہو گا حیران کن ہو گا۔ کچھ بعید نہیں کہ بقول شاعر:

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
یہ ٹوٹا ہوا تارہ کامل نہ بن جائے

منو بھائی انسانیت کے مستقبل کے بارے میں پر امید نظر آتے ہیں۔ وہ ڈارون کے نظریہ ارتقا کی حمایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر انسان محنت کرے اور اپنے ذہن کو استعمال کرے تو وہ جو چاہے حاصل کر سکتا ہے۔ مذکورہ کالم میں ان کی رجائیت پسندی نمایاں ہے اور اپنی بات کو انھوں نے ہلکے پھلکے انداز میں بیان کیا ہے۔ جس میں روشن خیالی اور مستقبل کے متعلق اچھے اشارے نظر آتے ہیں جو یوٹوپیا کی بنیاد ہیں۔

"فیض اور ندیم قاسمی کی مشترکہ صدی" کے عنوان سے لکھے کالم میں کالم نگار نے پاکستان اور پاکستانیوں کی نجات کا ذریعہ اچھے لوگوں کی پیروی کرنے میں بتایا ہے۔

> "جو قومیں اور جو معاشرے سو فی صد شرح خواندگی کا خواب دیکھتے ہیں وہ شرح خواندگی میں اضافے کے لیے ملک اور معاشرے میں تعلیمی ایمرجنسی نافذ کرتی ہیں اور باقی تمام کام روک کر تعلیمی ترقی کے کاموں پر توجہ دینے کا فرض ادا کرتی ہیں اور مہاتیر محمد کی طرح اپنے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں کامیاب بھی ہوئیں۔" (۳۵)

اس سلسلے میں وہ مزید لکھتے ہیں کہ ترقی کی رفتار کو تیز کرنے اور اپنے خوابوں کے یوٹوپیا کے حصول کے لیے شرحِ خواندگی میں اضافہ بہت ضروری ہے اور اس کے لیے ہمیں ترقی یافتہ قوموں کے راستے اور ان کے طریقے اپنانے ہوں گے۔ اس سلسلے میں کالم نگار ملائشیا کے صدر مہاتیر محمد کی پالیسیوں کو سامنے لاتے ہیں جنھوں نے خواندگی کے فروغ کو اپنے ملک کی اولین ترجیح قرار دیا اور صورتِ حال یہ ہے کہ دس سال سے بھی کم عرصے میں ملائیشیا کے عام مزدور بھی بی اے کی سطح کی انگریزی بولتے ہیں۔ اس کے لیے مہاتیر محمد نے

خواندگی کی شرح میں اضافہ کرنے کے لیے عام لیکچرار اور استادوں کی تن خواہیں لاکھوں روپے کی مالیت تک پہنچادی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ علاقوں کے پڑھے لکھے لوگ ملائشیا میں تعلیم دینے کی ملازمتوں کی تلاش میں آگئے اور پاکستان کی صورتِ حال یہ ہے کہ یہاں سے پڑھے لکھے لوگ روزگار کی تلاش میں بیرونِ ملک جاتے ہیں۔

پاک چین اقتصادی راہداری کے حوالے سے وہ مستقبل کے یوٹوپیا کو اپنے ایک کالم میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

"یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ پاکستان میں اقتصادی راہداری کے منصوبے میں وسط ایشیا کی ریاستیں بھی شامل ہو جائیں گی۔ وسط ایشیا کی ریاستوں کے شامل ہو جانے سے اس منصوبہ کی اہمیت اور افادیت نہر سویز کی افادیت سے بھی بڑھ جائے گی۔ علامہ اقبال کا نوے سال پہلے کا خواب پورا ہو جائے گا اور انیسویں صدی ایشیا کی صدی بن جائے گی۔"(۳۶)

یہاں مصنف کا وطنِ عزیز کے متعلق خواب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتا دمکتا نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے تو گوادر کی قدرتی بندرگاہ دبئی کی بندرگاہ کو بھی پیچھے چھوڑ جائے گی۔ روس کی ریاستوں تک پاکستان کو رسائی حاصل ہو گی، ان کی معدنیات کی دولت سے پاکستان مستفید ہو گا اور وہ زرعی شعبے میں پاکستان کی ترقی سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ پاکستان کے ساتھ مل کر دہشت گردی کی لعنت کے خلاف مشترکہ لڑائی لڑیں گے اور یوں اکیسویں صدی ایشیا کی صدی بن جائے گی۔ اس بارے میں وہ مزید کہتے ہیں کہ پاکستان کے اندر اور اس کے باہر پاکستان کے مخالف یہ بات کرتے ہیں کہ کالا باغ ڈیم اور دیامیر بھاشا منصوبہ کبھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ پائے گا لیکن ان کا خیال ہے کہ اس کے مخالفین ہی ایک دن خود اس کی تعمیر کا مطالبہ کریں گے۔ کیوں کہ پاکستان کا خطے میں اکلوتا مخالف ہندوستان ہی اقتصادی راہداری کے ٹرک اور پاکستان کی موٹروے کو اپنی درآمدات کی ترسیل کے لیے استعمال کرے گا۔

"اکانومسٹ، جیسے سرمایہ داری نظامِ معیشت کے تین معتبر اور دوسرے حوالوں نے دعویٰ کیا ہے کہ پاکستان کی معیشت امریکا اور کینیڈا کی معیشتیوں سے بھی بہتر انداز اور رفتار سے چل رہی ہے۔"(۳۷)

کالم نگار نے اس مصدقہ خبر پر بڑے دلچسپ انداز سے تبصرہ بھی کیا ہے۔ اس کے مطابق یہ خبر اس قدر حیرت انگیز اور عقل کے چودہ طبق روشن کرنے والی ہے کہ میرے حواسِ خمسہ تو اس کی صداقت اور سچائی دونوں پر یقین کرنے سے قاصر ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ " میں خوشی سے مر نہ جاؤں اگر اعتبار ہوتا!"۔ آگے مزید لکھتے ہیں کہ، اگر بات واقعی ایسی ہے تو پھر ہمیں یہ حقیقت چلتی بلکہ دوڑتی ہوئی کیوں نظر نہیں آتی ہے ہمیں تو معیشت رکی ہوئی بلکہ خود اپنے بوجھ سے دھنسی ہوئی نظر آتی ہے اور اگر صورتِ حال فی الحقیقت ایسی ہی ہے تو امریکا اور کینیڈا کے ماہرین اپنی معیشتوں کو پاکستان کے انداز میں چلانے کے لیے جناب احسن اقبال سے مشورہ ضرور لیں۔ خود پروفیسر صاحب کا ہی ان کو مشورہ دینے کے لیے جانا باعثِ فخر ہو گا اور دوسری طرف حرام گوشت کی روک تھام کے لیے حکومت گدھے کی کھال کی برآمد پر پابندی عائد کر رہی ہے۔ پورے یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا ہے مگر سوچ کہتی ہے کہ مندرجہ بالا خبر کے اندر سے جو دانش مندی جھلک رہی ہے وہ پاکستان کی معیشت کو ترقی یافتہ ممالک کی معیشتوں سے بہتر بنا رہی ہے۔ اب ان سے امریکا اور کینیڈا کی معیشت کیسے مقابلہ کر سکے گی جو گدھے کی کھالیں اتار کر اس کا گوشت بھی بکرے کے داموں فروخت کر رہے ہیں اور جب ہم لوگ گدھوں کو کھا کر ان کی طرح سوچنے اور سمجھے بھی لگیں گے تو یقیناً بیچاری معیشت ترقی کرے گی۔

اس کالم میں منو بھائی کی حسِ ظرافت و لطافت اپنے عروج پر ہے۔ انھوں نے معاشرے کی معیشت پر طنز بھی کیا ہے لیکن اس کا انداز اس قدر ہلکا پھلکا ہے کہ پڑھنے والے کو برا محسوس نہیں ہوتا ہے اور وہ ازراہِ مذاق اسے برداشت کر لیتا ہے۔ معاشرے میں بڑھتی ہوئی بدعنوانی کے رجحان کو بھی وہ نہایت خوب صورت انداز سے سامنے لاتے ہیں۔ ایک کالم نگار کا بالعموم اور ایک فکاہی کالم نگار کا بالخصوص یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ حالاتِ حاضرہ کی عکاسی اور معلومات کی فراہمی کے ساتھ معاشرے کی اصلاح کا بیڑا بھی اٹھائے اور منو بھائی نے یہ تینوں فرائض بڑے اچھے انداز سے نبھائے ہیں۔

وہ اپنے ایک کالم میں تھیلسیمیا کے حوالے سے کام کرنے والی ایک تنظیم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "کہا جا سکتا ہے کہ چراغ سے چراغ جلتے ہیں۔ پہیے سے پہیہ چلتا ہے اور چھوٹے چھوٹے خوابوں کی کامیابی بڑے بڑے خواب دیکھنے کا حوصلہ دیتی ہے مگر ان سب کے پیچھے خلوص اور اَن تھک کوششیں موجود ہوتی ہیں۔ بلاشبہ تحسین کے مستحق ہیں سندس فاؤنڈیشن کے وہ پر خلوص اور ان تھک کارکن جنھوں نے ۱۹۹۸ء سے شروع ہونے والی تیرہ سالوں میں

تھیلیسیمیا، ہیموفلیا اور بلڈ کینسر جیسی خون کی نامراد بیماریوں کی اذیت میں مبتلا ہوں اور ان کے والدین کی پانچ ہزار سے بھی زیادہ تعداد کو خون فراہم کیا۔"(۳۸)

مندرجہ ذیل کالم میں کالم نگار کی رجائیت پسندانہ سوچ واضح ہے جس کی بنیاد وہ ایسے معجزے کے منتظر ہیں جو ملک کے سارے مسائل حل کر دے گا۔

"اگرچہ معجزوں کا زمانہ گزر چکا ہے مگر اسے معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ گزشتہ دس سالوں میں پاکستان کے غربت کی لکیر سے نیچے ہونے والے یا کیے جانے والے لوگوں کی تعداد میں ناقابلِ یقین حد تک کمی آگئی ہے۔ اور وہ بغیر کسی عملی کوشش کے ملک کی مجموعی آبادی کی ایک تہائی یا ۳۴ فی اعشاریہ پانچ فی صدی سے کم ہو کر صرف بارہ اعشاریہ چار فی صد رہ گئے ہیں اور اس میں موجودہ حکومت کی ایک سال پر پھیلی ہوئی معاشی اور اقتصادی پالیسیوں کا کوئی دخل نہیں ہے۔"(۳۹)

کالم نگار نے ہلکے پھلکے انداز میں معاشرے کی سست روی اور غیر ذمہ داری پر طنز کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ترقی کا کوئی اور طریقہ اگر باقی نہ بھی رہا تو ہمارے ہم وطن کاغذات میں ہیرا پھیری سے ایک mock progress ضرور کر سکتے ہیں اور یوں بھی ملک میں ترقی کے تمام اعداد و شمار فقط کاغذوں تک ہی محدود ہیں، ان کی ٹھوس حقیقت نہیں ہے۔ یہاں ان کے انداز میں طنز کا عنصر واضح نظر آتا ہے۔ ان کے مطابق حقیقت میں تو شاید مشکل ہے لیکن ہم اعداد و شمار کے ہیر پھیر سے ماک پروگریس کے ذریعے یوٹوپیا نہیں لیکن ماک یوٹوپیا حاصل کرنے میں شاید کامیاب ہو جائیں۔

سوفٹ کی طرح عطاء الحق قاسمی کے کالموں میں موک یوٹوپیا نظر آتا ہے ان کے موک یوٹوپیا کے بنیادی عناصر ہیں۔ طنز، تنقید، علامت نگاری، فرضی ماحول اور فرضی کردار شامل ہیں۔

کالم نگار سوفٹ کی طرح بظاہر اپنے کالموں میں ملکی صورت حال کی تعریف کرتا ہے مگر ذو معنی انداز میں طنز اور تنقید تیر برساتے ہوئے اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ ملک کی صورت حال یوٹوپیا کی بجائے موک یوٹوپیا ہے سب کچھ اچھا نظر آنے کے باوجود در حقیقت کچھ اچھا نہیں ہے۔ اپنے بعض کالموں میں کالم نگار واضح الفاظ میں تنقید کرتا نظر آتا ہے جبکہ بیشتر کالموں میں تھامس مور کے انداز میں حالات میں بہتری کے لیے تجاویز بھی حکمرانوں کے سامنے رکھتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی ان کے کالموں میں علامت نگاری اور فرضی ماحول قاری کو جہاں لطف فراہم کرتا ہے وہاں بین السطور وہ اس کا مدعا بھی سمجھ لیتا ہے۔

حوالہ جات

۱. شفیق جالندھری، اردو کالم نویسی، علمی کتب خانہ، کبیر سٹریٹ، لاہور، ص:۵۶۲

۲. شفیق جالندھری، اردو کالم نویسی، علمی کتب خانہ، کبیر سٹریٹ، لاہور، ص:۵۶

۳. محمد خالد اختر (دیباچہ نگار)، روزن دیوار سے، ص:۱۳

۴. عطاء الحق قاسمی، کالم تمام، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴، ص:

۵. عطاء الحق قاسمی، کالم تمام، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴، ص:۳۶

۶. عطاء الحق قاسمی، کالم تمام، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴، ص:۳۹

۷. عطاء الحق قاسمی، کالم تمام، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴، ص:۴۱

۸. ایضاً ص:۴۳

۹. ایضاً

۱۰. ایضاً ص:۴۵

۱۱. عطاء الحق قاسمی، کالم تمام، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، دیباچہ

۱۲. ایضاً، ص:۶۹

۱۳. ایضاً، ص:۸۱

۱۴. ایضاً، ص: ۹۲

۱۵. ایضاً، ص:۱۳۸

۱۶. ایضاً، ص:۱۷۰

۱۷. ایضاً، ص:۱۹۴

۱۸. ایضاً، ص:۳۰۶

۱۹. ایضاً، ص:۳۰۹

۲۰. ایضاً، ص:۳۶۸

۲۱. ایضاً، ص:۳۷۹

۲۲. ایضاً، ص:۴۹۳

۲۳. ایضاً، ص:۵۰۱

۲۴. عطاء الحق قاسمی، روزن دیوار سے، انصاف کا جنازہ، ۷ اگست ۲۰۲۱ء، روزنامہ جنگ

۲۵. عطاء الحق قاسمی، روزن دیوار سے یکم ستمبر ،۲۰۲۱ء، روزنامہ جنگ

۲۶. عطاء الحق قاسمی، روزن دیوار سے، طوطا کہانی، ۲۰ مارچ ۲۰۱۵ء، روزنامہ جنگ

۲۷. عطاء الحق قاسمی، روزن دیوار سے، ۱۶ مارچ، ۲۰۱۱ء، روزنامہ جنگ

۲۸. ایضاً، روزن دیوار سے، ۱۰ مارچ ۲۰۱۲ء، روزنامہ جنگ

۲۹. ایضاً، روزن دیوار سے، ۲۱ دسمبر ۲۰۱۵ء، روزنامہ جنگ، "بلاول بھٹو زرداری بسلسلہ میں تے منو بھائی"

۳۰. منو بھائی، گریبان، ادارتی صفحہ، روزنامہ جنگ، ۸ دسمبر ۲۰۱۷ء

۳۱. منو بھائی، گریبان، "گو عوام گو کا نعرہ"، روزنامہ جنگ، ۸ ستمبر ۲۰۱۷ء

۳۲. منو بھائی گریبان، "گائے گائے باز خواں، روزنامہ جنگ، ۱۴ اگست ۲۰۱۷ء

۳۳. منو بھائی، گریبان، "قدرت نے درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو، روزنامہ جنگ، ۲۲ جون ۲۰۱۷ء

۳۴. منو بھائی، گریبان، ۱۶ اپریل ۲۰۱۶ء

۳۵. منو بھائی، گریبان، انسانی دماغ کی طاقت چار گناہ ہو گی تو پھر کیا ہو گا، روزنامہ جنگ، ۱۳۱ اکتوبر ۲۰۱۶ء

۳۶. منو بھائی، گریبان، "فیض اور ندیم قاسمی کی مشترکہ صدی، روزنامہ جنگ، ۲۵ دسمبر ۲۰۱۶ء

۳۷. منو بھائی، گریبان، "پاکستان، امریکہ اور کینیڈا کی معیشتیں، روزنامہ جنگ "۳ ستمبر ۲۰۱۵ء

۳۸. منو بھائی، گریبان، نیک دل خوابوں کی تعبیر مشکل ہوتی ہے، روزنامہ جنگ، ۱۲ اگست ۲۰۱۴ء

۳۹. منو بھائی، گریبان، روزنامہ جنگ، ۶ جولائی ۲۰۱۴ء

ماحصل:

مجموعی جائزہ

یوٹوپیا انسان کی ایک ازلی خواہش ہے اور ایک نفسیاتی رجحان کا نام بھی ہے۔ ایک ایسا رجحان جو فراریت کی انسانی سرشت کی جانب نشان دہی کرتا ہے۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے دنیا کے کسی بھی خطے سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے جو ادب تخلیق کیا ہے۔ اس میں یہ رجحان کہیں نہ کہیں ضرور نظر آتا ہے۔ جس کی بنیادی وجہ انسان کی بالعموم اور تخلیق کاروں کی بالخصوص تکمیل پسندی کے خواہش کا وجود ہے جس کو انگریزی زبان میںperfectionism کہا جاتا ہے۔

ڈراما نگار، شاعر، ناول اور افسانہ نگار تو تخیل کے باسی ہوتے ہیں لیکن کالم نگاروں کا واسطہ حقیقی زندگی اور اس کے مسائل سے ہوتا ہے۔ اس لیے ان کے یوٹوپیا کا گزر کسی حد تک حقیقت یا موجودہ حقیقت سے ہوتا ہے۔ ان کے ہاں یوٹوپیا تو نہیں لیکن ایک بہتر اور Worth-living زندگی کا تصور نظر آتا ہے۔ یوٹوپیا کی مختلف صورتیں ہمیں مختلف کالم نگاروں کے ہاں نظر آتی ہیں کبھی وہ مغرب کی فلاحی ریاست کو مثالی قرار دیتے ہیں اور کبھی چین کا معاشی نظام انھیں قابلِ تقلید نظر آتا ہے جب کہ بعض کے ہاں اسلامی ریاستِ مدینہ مکمل آئیڈیل نظر آتی ہے۔ جن تک رسائی ان کے مطابق کم از کم انسانی کوشش سے ممکن ہو سکے گی۔ کیونکہ خوب صورت سڑکوں اور جدید ترین ذرائع آمد و رفت نے ویل کے یوٹوپیا کو بھی باغِ عدن بنا دیا تھا۔ افلاطون کی "ریاست" کو ناقدین نے ایک اوسط درجے کے انگریزی قصے سے تشبیہ دی ہے جب کہ کیٹ کے یوٹوپیا کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اس نے کسی حد تک کمیونزم کو طرزِ حکومت قرار دیا ہے اور موجودہ یوٹوپیا جو ۲۰ویں صدی کے آغاز میں منظرِ عام پر آیا اور یہ دونوں تضادات کا نتیجہ ہے۔ ویل کے مطابق ایک ایسا یوٹوپیا جو فقط آلات اور انتظامات سے متعلق ہے اور محض سطحی حد تک ایک خواب دکھاتا ہے، نامکمل ہے لیکن اصل مسئلہ دراصل حجم کا ہے جو اس لباس کے اندر ہے اور جس کے اخلاقی اور زمینی مسائل کو آج تک کسی نے زیرِ بحث نہیں لیا۔ دراصل ویل اس انسان کی اخلاقی تربیت کرنا چاہتا ہے۔

کالم انگریزی زبان کا لفظ ہے جو صحافتی زبان میں مستقل عنوان کے تحت کسی اخبار یا رسالے میں باقاعدگی سے شائع ہونے والی شگفتہ و سنجیدہ تحریر کو کہا جاتا ہے اور عموماً لکھنے والے کے نام یا قلمی نام کے ساتھ شائع کی جاتی ہے۔

مذکورہ تحقیقی مقالہ میں جہاں ایک طرف ادب اور نفسیات کے تعلق کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے تو دوسری جانب غیر افسانوی ادب میں یوٹوپیائی عناصر کا تجزیہ و تحقیق بھی کی گئی ہے۔ ادب کو اسلوب اور موضوع کے اعتبار سے دو اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے: افسانوی ادب اور غیر افسانوی ادب، افسانوی ادب میں افسانے، ناول اور ڈرامے شامل ہیں جب کہ غیر افسانوی ادب میں سفر نامے، کالم، انشائیے اور مضمون وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔

کالم نگار عطاء الحق قاسمی کے مطابق اخبار میں تین چیزیں ہوتی ہیں: ایک اداریہ جس میں ادارے کی رائے شامل ہوتی ہے، دوسرا تجزیہ جس میں اعداد و شمار ہوتے ہیں اور تیسرا، کالم جو اخبار میں قاری کے لیے سب سے شائستہ اور غیر جانب دار ہوتی ہے۔ اگر کالم نگاری اور یوٹوپیا کے تعلق کی بات کی جائے تو کالم نگار خوابوں کی سوداگری کرتے ہیں۔ کچھ لوگ معاصر مغرب کے قصے سناتے ہیں اور کچھ ماضی کی کہانیاں اور یوں کالم نگار ناسٹلجیا اور یوٹوپیا کو یکجا کر کے قاری کے لیے ایک ایسی چیز لاتا ہے جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ دل فریب بھی ہوتی ہے۔

برصغیر میں صحافت کا باقاعدہ آغاز ۱۷۸۰ء میں ہوا اور کالم نگاری کا آغاز خبروں کی صورت میں ہوا جس میں خبروں کو کالم کی صورت میں تحریر کیا جاتا تھا۔ ان میں بعض خبروں میں فکاہیہ کالم کی شگفتگی بھی نظر آتی تھی۔ جب کہ دوسرے دور میں کالم نے ایک باقاعدہ صورت اختیار کر لی۔ قیامِ پاکستان کے بعد کالم نویسی کے چوتھے دور کا آغاز ہوا جس کے بعد مختلف تبدیلیوں سے گزرتا ہوا کالم صحافت کی انتہائی اہم صنف کا درجہ اختیار کر چکا ہے۔

کالم نگار معاشرے کی تصویر کو اپنے خیالات، نظریات اور فکر کے ذریعے قلم کی زبان عطا کر کے الفاظ کے روپ میں ڈھالتا ہے۔ وہ معاشرے میں پائے جانے والے افکار کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس مشاہدے کی طاقت سے معاشرے اور اس میں ہونے والے تمام افعال کو الفاظ کی تصویر پہناتا ہے۔

کالم کو موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے تقسیم کیا جاتا ہے جن میں طبی کالم، قانونی کالم، دینی کالم، نفسیاتی کالم، معاشی کالم، کھیلوں کا کالم، پامسٹری اور نجوم، امور خانہ داری اور فیشن شامل ہیں۔

اسلوب کے لحاظ سے کالم کی مندرجہ ذیل اقسام ہیں۔

فکاہیہ کالم، سنجیدہ کالم، اقتباہی کالم، مکتوباتی کالم، ترکیبی کالم، علامتی کالم، مشاہداتی کالم، سفر نامہ / سیاحتی کالم اور شہر نامہ یا ڈائری نما۔

پاکستان کے اہم اخبارات جن میں باقاعدگی سے کالم لکھے جاتے ہیں ان میں روزنامہ نوائے وقت، روزنامہ جنگ، جسارت اخبار اور روزنامہ دنیا شامل ہیں۔

علمِ نفسیات کی رو سے یوٹوپیزم Utopianism کسی بھی مصنف کی مجموعی گفتگو ہے یا دوسرے لفظوں میں معاشرے اور اس میں بسنے والے لوگوں کے متعلق اس کا نقطہ نظر ہے۔ جہاں تک افسانوی ادب کا تعلق ہے تو یہ مصنف کی مجبوری ہوتی ہے کہ اس کے لیے ایک پلاٹ اور وقت کی پابندی ضروری ہوتی ہے لیکن یوٹوپیائی ادب (Utopian Literature) میں مصنف زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر ایک ماورائی دنیا کی تشکیل کرتا ہے۔ افسانوں اور مناظر کی منطقبت کو وہ اپنے جذباتی تجربے کے زیرِ اثر منظر سے منقطع کر دیتا ہے جس کو ادب کی اصطلاح میں متن کی تخفیف (decontextualization of Text) کہا جاتا ہے اور اس عمل میں وہ ناول یا افسانے کی کہانی کو کبھی ماضی اور کبھی مستقبل میں لے جا کر اپنا یوٹوپیا یا جنت ارضی تشکیل کرتا ہے جس میں وہ تجرید، شعور کی رو اور آزاد تلازمہ خیال جیسے ذہنی عوامل کا سہارا لیتا ہے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یوٹوپیا، فرد کی ذہن کی تشکیل ہے جس کا حقیقی زندگی میں تصور کرنا مشکل ہے اور ذہن اور اس کی افعال یا اس کی کارکردگی براہِ راست علمِ نفسیات کے دائرے میں آتی ہیں۔ اس لیے علمِ نفسیات میں یوٹوپیا اور نوسٹلجیا جیسے ذہنی رجحانات کا مطالعہ نظریہ فراریت کے پس منظر میں کیا جاتا ہے جس کے مطابق جب زندگی کی حقیقت انسان کے اطمینان کے لیے ناکافی ہوتی ہے تو وہ اس سے فرار کی راہ تلاش کرتے ہیں اور نتیجے میں ان دونوں رجحانات میں پناہ لیتے ہیں۔

فراریت کا رجحان ماہر نفسیات فرائڈ نے دیا ہے۔ مزید فرائڈ کے Pleasure Principle میں بھی فرد کے فرار کا رجحان اور یوٹوپیا کی تشکیل کا ذکر ملتا ہے۔ یوٹوپیا کے دو بنیادی عناصر ہیں: آئیڈیلزم اور پرفیکشنزم۔ کسی بھی یوٹوپیا کی تشکیل ان دو بنیادی عناصر کے بغیر نامکمل ہے۔ فرائڈ کے نظریہ فراریت کے اثرات فلسفے میں بھی نظر آتے ہیں۔ بریڈلے F.H.Bradley نے سولپسزم Solipisicim کا نظریہ پیش کیا جس کے مطابق انسانی ذہن حتمی (Omniscient) ہے اور خیال چونکہ اس کی اختراع ہے اس لیے وہ جو کچھ سوچتا ہے وہ حتمی ہے۔

انگریزی ادب میں یوٹوپیا کا لفظ پہلی مرتبہ تھامس مور نے ۱۵۱۶ء میں اپنی کتاب میں استعمال کیا۔ جو دو یونانی الفاظ اوٹوپس (outopos) اور یوٹوپس (Utopos) سے مل کر بنا ہے جس کا مطلب بیک وقت اچھی مگر ایسی جگہ سے مراد ہے جس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یوٹوپیا(Utopia)سے مراد ایک ایسی جگہ ہے جو بیک وقت اچھی اور مثالی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا وجود اس دنیا میں ممکن نہیں ہے۔ یوٹو یا خوابوں کا ایک طلسماتی جزیرہ ہے جو مصنف کے خوابوں کی تصویر پیش کرتا ہے۔

انگریزی ادب میں یوٹوپیائی رجحانات کا آغاز یونان سے ہوا۔ سب سے پہلے افلاطون نے اپنی کتاب ری پبلک (Republic) میں یوٹوپیا کا لفظ استعمال کیا۔ تھامس مور نے ۱۵۱۶ ءمیں لاطینی زبان میں کتاب لکھی جس کا نام یوٹوپیا (Utopia) رکھا گیا تھا۔

اس کا آغاز ہمیں ابتدائی دور میں تحریر کی گئی داستانوں میں نظر آتا ہے جن میں مافوق انظریات عناصر کی موجودگی کو یوٹوپیا کی علامت ہی کہا جا سکتا ہے۔ اردو شاعری میں رومانویت پسند شعرا فیض، فراز اور احمد ندیم قاسمی کے ہاں بھی اس جنتِ گم شدہ کی تلاش نظر آتی ہے۔ یوٹوپیائی ادب سے مراد ایسے قصے اور ناول ہیں جس میں ادب مستقبل کی مختلف صورتیں دکھاتا ہے۔ جہاں تک اردو ادب میں یوٹوپیا کا تعلق ہے تو ۲۱ویں صدی میں چند ایک ناول اور فسانے ہیں جن میں یہ رجحان نظر آتا ہے۔ ان میں اختر رضا سلیمی کے ناول "جاگے ہیں خواب میں"، شمس الرحمٰن فاروقی کا "کئی چاند تھے سر آسمان"، شرف عالم ذوقی کا "پو کے مان کی دنیا" اور شمس الرحمٰن فاروقی کا ناولٹ " قبضِ زماں "شامل ہے۔ افسانہ نگاروں میں انور سجاد کے ہاں یہ رجحان نظر آتا ہے جب کہ سفر ناموں میں مستنصر حسین تارڑ کے افسانوں میں ناسٹلجیا اور یوٹوپیا کے رجحانات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

ادب کے حوالے سے یوٹوپیا کی ۵ اقسام ہیں۔

ٹیکنو کریٹک یوٹوپیا، سماجی یوٹوپیا، تانیثی یوٹوپیا، اسلامو یوٹوپیا اور موک یوٹوپیا

فلسفیانہ اعتبار سے جن لوگوں نے یوٹوپیا کی تشکیل میں ٹھوس بنیادیں فراہم کی ہیں، ان میں افلاطون، ڈیکارٹ اور ایف ایچ بریڈلے کے نام نمایاں ہیں۔ سماج میں یوٹوپیا کی عملی شکل کو جن لوگوں نے دیکھا، ان میں

سر فہرست افلاطون کا نام ہے۔اس کے بعد منو، تھامس فور اور مارکس اور ہیگل نے ایسے سماج کا تصور دیا جو مثالی تھا۔

موضوعات کے لحاظ سے کالم کو سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی کالموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔مذہبی کالموں میں یوٹوپیائی رجحان کو اسلاموٹوپیا کا نام دیا جاتا ہے۔جو بنیادی طور پر ایک نظریہ اور طبقۂ فکر ہے اس کا نقطۂ نظر آغاز عربوں کے ویلوٹ انقلاب (۱۹۷۸-۱۹۸۹)اور ایران کے اسلامی انقلاب میں نظر آتا ہے۔اس کی بنیاد حسن النبیا اور اس کے حامیوں نے رکھی جن کے نزدیک مسلم امہ کو درپیش مسائل تمام مسائل کا حل صرف ایک جملے میں ہے۔اسلام تمام مسائل کا حل ہے (Islam is the solution) ۔ان کا دوسرا لائحۂ عمل ایک مذہبی اور سیاسی امر کی تشکیل ہے جس کا بنیادی مقصد خالص اور بنیادی اسلام کی جانب واپسی کا سفر ہے اس کو انھوں نے Ingenius hermenautic method کا نام دیا ہے جس کے ذریعے قرآن و حدیث کی مدد سے ایسے طرزِ حکومت کی تلاش شامل ہے جو اسلام کے اصولوں کے مطابق ہوں اور لوگوں کے مسائل کا حل ہوں۔

اوریا مقبول جان کا شمار پاکستان کے صفحۂ اول کے مذہبی کالم نگاروں میں ہوتا ہے۔اپنے نام کی طرح ان کے خیالات و افکار بھی منفرد نوعیت کے ہیں۔طالبان کے افغانستان کی مسند حکومت پر جلوہ گر ہونے کے بعد ان کے خیالات گویا ایک عملی شکل اختیار کر گئے۔حرفِ راز کے نام سے ان کے کالم جنگ اخبار میں شائع ہوتے ہیں۔مذہبی موضوعات پر مبنی کالم "مجھے ہے حکمِ اذاں" ضربِ مؤمن اخبار میں چھپتا ہے۔"حرفِ راز" کے نام سے ان کے کالموں کے ۷ مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ریاست کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کو ایک جملے میں سمویا جاسکتا ہے۔ State become invisible ۔یعنی کامیاب ریاست وہ ہے جو نظر نہ آئے۔ پولیس کا وجود نظر نہ آئے لیکن چوراہے پر کوئی قانون کی خلاف ورزی نہ کرے، ہجوم نہیں ہے لیکن انتظام و انصرام کمال کا پرتو ہے۔اوریا مقبول جان کی کالم نگاری میں ایک مخصوص نقطۂ نظر کی چھاپ نظر آتی ہے۔وہ Pan Islamism کے حامی ہیں۔ان کے اکثر کالموں میں اسلاموٹوپیا کا رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ان کے نزدیک ہمارا مذہب، ہمارا نظامِ تعلیم اور نظریۂ حیات سب ایک مثالی ریاست کی تشکیل میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ایک ایسی ریاست جو صحیح معنوں میں فلاحی ہو اور اس میں زیرِ تعلیم طالب علم ملک و قوم کا نقشہ تبدیل کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔وہ ماضی کے جھروکوں سے پرانی درسگاہوں کا عروج اور تمکنت یاد کرتے ہوئے

ماضی پرست (Nostalgic) ہو جاتا ہے۔ جہاں تک تانیثی یوٹوپیا (Feminist-Utopia) کی بات ہے تو کالم نگار نے آج کی ترقی یافتہ دنیا کی مادر پدر آزادی کے مقابلے میں عورت کو اس مقام و مرتبے کی یاد دلائی ہے جو دینِ اسلام نے اسے عطا کیا ہے۔ کالم نگار کا یوٹوپیا ریاست مدینہ ہے۔

خورشید ندیم اسلامی سکالر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک منجھے ہوئے روشن خیال کالم نگار ہیں۔ وہ ۲۰۱۲ء سے روزنامہ دنیا سے منسلک ہیں اور "تکبیر مسلسل" کے نام سے کالم تحریر کر رہے ہیں۔ ان کا کالم ہفتے میں تین یا چار بار چھپتا ہے۔ کالمز کا بنیادی موضوع مذہبی مسائل اور ان کا حل ہوتا ہے۔ اسلامی ریاست کی تشکیل کے بارے میں ان کا نقطہ نظر باقی علما سے قدرے مختلف ہے۔ ان کی سوچ میں مذہبی روایت پسندی اور شدت پسندی کا عنصر کم نظر آتا ہے۔ اسلامی ریاست یا مثالی ریاست یا یوٹوپیا کے بارے میں وہ ایک منفرد نقطہ ء نظر کے حامی ہیں۔ اس سلسلے میں میں وہ نہ تو سیکولر ازم کی حمایت کرتے ہیں اور نہ ہی لبرل ازم کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ ایسی اسلامی ریاست کے خواہاں ہیں جو قائدِ اعظم کے نقطۂ نظر اور اقبال کے خواب کی تکمیل ہو۔

مذہب کو مصنف ریاست کی تشکیل کا بنیادی عنصر سمجھتا ہے کیوں کہ مذہب وہ اخلاقی بنیاد فراہم کرتا ہے جو سماج کو متوازن اور صحت مند بناتا ہے۔ اس کے مطابق مثالی ریاست یا ریاستِ مدینہ یا خلافتِ راشدہ ایک معجزہ ہے۔ یہ مختصر دورانیے کی حکومت خدا کی خاص منشاء اور رسول ﷺ کی سنت کا ظہور تھا لیکن یہ اگر عملی تصور ہے بھی تو اس کا وجود آج کے دور میں ممکن نہیں ہے۔ اس کے مطابق اگر عوام معاصر اہلِ سیاست کو مثال سمجھتے بھی ہیں یا وہ ان کو مثالی روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ بذاتِ خود ایک رومان پرور خیال کو فروغ دے رہے ہیں۔ ان کے مطابق جمہوریت خلافت کے قریب تر ہے کیوں کہ دونوں میں طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں لیکن خلافت میں طرزِ حکومت کے ساتھ ساتھ حکمران کا طبقہ آئیڈیل ہونا ضروری ہے۔ ایسے شخص کو مسلمانوں کا خلفہ بنایا ہی نہیں جا سکتا ہے جو صادق اور امین کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ (قانون 58-2B کے مطابق) اس کی مثال یزید کی حکومت کے خلاف نواسۂ رسول ﷺ کا اعلانِ جنگ ہے۔ دونوں کالم نگاروں کے مطابق آئیڈیل یا مثالی طرزِ حکومت اسلامی ہے لیکن خورشید ندیم اس کی تشکیل کے لیے عقلی توضیحات اور عملی لائحۂ عمل تجویز کرتے ہیں۔ اسکے متضاد اور یا مقبول جان کے ہاں تخیل کی حکمرانی اور ماضی پرستی کا عنصر نمایاں ہے۔ معجزے آج بھی جنم لے سکتے ہیں اگر فضائے بدر پیدا کی جا سکے جب کہ خورشید ندیم اس بات کی

عقلی توجیہ بیانکرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آج نہ وہ ایمان کی قوت ہے اور نہ ہی طاقت اس لیے بدر کے مجاہدین کے مقابلے میں آج دس گنا زیادہ افرادی قوت درکار ہے۔ طالبان کی حکومت اور یا مقبول جان کے مطابق خلافتِ راشدہ کا تسلسل ہے جب کہ خورشید ندیم کے مطابق اگر وہ عملی ریاست ہوتی تو اس کا وجود اس قدر جلد صفحۂ ہستی سے نہ مٹ جاتا۔

خورشید ندیم کے مطابق ریاستِ مدینہ ایک یوٹوپیا تھی جس کا تسلسل حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت تک رہا تھا۔ اس سے قبل حضرت یوسف علیہ السلام کا دورِ حکومت ایک یوٹوپیا کہا جا سکتا ہے لیکن یہ کیا کہ اس دور میں کوئی خامی نہیں تھی۔ یہ ممکن نہیں ہے کیوں کہ سیاست اور ریاست دونوں ایک ارتقاء پذیر عمل سے گزرتی ہے۔ اور اگر ہم جمہوری عمل میں کامیابی حاصل نہیں کر سکے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ہمیشہ سے ایک نجات دہندہ کے انتظار میں رہے ہیں۔ جمہوریت ان کے نزدیک بہترین طرزِ حکومت ہے کیونکہ اس میں اختیارات کی تقسیم ہوتی ہے۔ یہ ایسے ادارے بناتی ہے جن کی مدد سے طاقت کے ارتقا کے مواقع کم نظر آتے ہیں۔ مغرب بھی مختلف آزمائشوں سے گزر کر اب اس نہج پر پہنچ گیا ہے کہ وہ جمہوریت کے ثمرات سمیٹنے کے قابل ہو گیا ہے۔ خلافت کے مدِ مقابل وہ جمہوریت کے خواہاں ہیں۔ کیوں کہ خلافت میں ایک شخص اقتدار کا منبع ہوتا ہے۔ ریاستِ مدینہ کا قیام ان کے مطابق ایک الہامی فیصلہ ہے۔ وہ ایک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزاتی عمل تھا اور انھوں نے ایک مثال قائم کرنی تھی۔ اب رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا، اس لیے ایسا کوئی فیصلہ نہیں آئے گا لیکن وہ ہمارے آئیڈیل ہیں جن کو حاصل کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ مثالی ریاست کا بنیاد فرض کمزوروں اور محتاجوں کو تحفظ فراہم کرنا ہے۔ ریاست کا کام کسی مذہب کا نفاذ یا تبلیغ نہیں ہے اس لیے ان کے خیال میں اسلامو ٹوپیا ریاست کے مسائل حل نہیں ہے۔ اسلام میں جبر نہیں ہے اور نہ ایک اسلامی ریاست کا مقصد اسلام کا نفاذ ہے۔ اس کا نام تمام مذاہب کے پیروکاروں کو آزادی فراہم کرتا ہے۔ ان کے خیال میں اسلام انفرادی عبادات کا مجموعہ ہے نہ کہ اجتماعی رسومات کا۔ فلاحی ریاست کا مقصد لوگوں کے لیے ایسے قوانین بنانا ہے جو لوگوں کی زندگیوں کو آسان بنائیں۔ امر بالمعروف نہی عن المنکر کا حکم دیا گیا ہے۔ حکمران کو لیکن اس میں جبر کا عنصر شامل نہیں ہے۔ اسلامی ریاست میں بھی سب کے لیے آزادی اور سہولتیں یکساں تھیں۔ اگر فی زمانہ بات کی جائے تو چین ایک کمیونسٹ ملک ہے جب کہ مغربی ممالک کو مصنف اپنا آئیڈیل قرار دیتے ہیں۔ ریاستِ مدینہ ایک اسلامی ریاست تھی مذہبی ریاست نہیں طالبان کی حکومت ایک مذہبی

ریاست تھی اس لیے یہ قائم نہ رہ سکی۔ خلافت ایک سیاسی اصطلاح ہے مذہبی نہیں اس لیے اس کو قائم کرنا بھی ایک مذہبی فریضہ نہیں ہے۔

امریکہ اور مغربی ممالک مذہبی آزادی کی بنیاد پر آپ کی سرگرمیوں کو منظم کرتے ہیں۔ فی زمانہ سعودی عرب اور ایران میں مذہب کے حوالے سے جس کا عنصر حاوی ہے۔ ان کے مطابق مذہبی سرگرمیوں خصوصاً نمازِ جمعہ کا خطبہ ایک اہم کردار ادا کرتا ہے اور حکومت کو چاہیے کہ اس کو نافذ کرے۔ اس کی مدد سے فرقہ بندی کو کم کرنے میں مدد ملے گی۔

جاوید چودھری کے یوٹوپیا کا بنیادی ستون مثالیت پسندی ہے۔ وہ اسی شخصیات کو بطورِ آئیڈیل پیش کرتے ہیں جو ان کے نقطۂ نظر میں ملک کی تقدیر کو بدل سکتے ہیں یا پھر بدلنے کی کوشش ضرور کریں گے۔ اس لحاظ سے وہ خلفائے راشدین، سکندرِ اعظم، چنگیز خان، اشوک اور شیر شاہ سوری کی مثالیں دیتے ہین جس کے نام آج تک زندہ ہیں اور وجہ ان کی انسانیت کے لیے عظیم خدمات ہیں۔ آئیڈلزم اس لیے بھی اسکے یوٹوپیا کا اہم ستون ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ایک مثالی معاشرہ یا نظامِ حکومت کا ادارومدار ان لوگوں پر ہوتا ہے جو ان کو چلا رہے ہوتے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ ملک کا نظم ونسق چلانے والے لوگ اگر دیانت دار، مخلص اور صادق اور امین ہوں گے تو وہ یقیناً ایک مثالی ریاست تشکیل دے سکیں گے۔

ان کے خیال میں سیکولر اور جمہوری حکومت ملک کے لیے بہترین ثابت ہو سکتی ہیں۔ ایک ایسی مثالی سلنطت جہاں قانون اور انصاف کا بول بالا ہو۔ ان کے کالموں میں ایک تصوراتی یا تخیلاتی فضا کا وجود بھی نظر آتا ہے۔ جس کی مدد سے بعض اوقات وہ یوٹوپیا تشکیل دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے ملک میں ایسا نظام یا منظر دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ اکثر ایسے کالم سنجیدگی کا تاثر لیے ہوتے ہیں۔

کالم نگار ایک ایسی فلاحی ریاست کے خواہاں ہیں جس کی بنیاد ریاستِ مدینہ ہے اور جس کی عملی شکل خلفائے راشدین کے دور میں نظر آتی ہے۔ ان کے مطابق اگر ہم اپنے حالات میں کوئی تبدیلی یا انقلاب لانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے نظامِ تعلیم میں بنیادی سطح پر تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں وہ جاپان، امریکا اور برطانیہ کے تعلیمی نظام کی مثالیں دیتے ہیں۔ کالم نگار کے خیالات عملی ہیں، وہ اس بات پر متفق ہیں کہ ہم خلافتِ راشدہ یا ریاستِ مدینہ کے معیار تک نہیں پہنچ سکتے کیوں کہ وہ معجزاتی اور کرشماتی شخصیات اور عوامل کا نتیجہ تھا لیکن آج کے دور میں رہتے ہوئے آج کے ترقی یافتہ ممالک کا تو مقابلہ کر سکتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ

ایڈورڈ کوک کا ۳۵۸ برس قبل قول دہراتے ہیں کہ معاشرے اس وقت تک مہذب نہیں ہو سکتے جب تک ان پر قانون کی بجائے بادشاہ حکمران رہیں۔

سیاسی کالم نگاروں کے کالموں میں بھی یوٹوپیائی عناصر پائے جاتے ہیں۔ یہ کالم نگار ملک کی حقیقی صورتِ حال پیش کرتے ہیں۔ ملک کے مسائل کو بیان کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے حل کے لیے تجاویز بھی پیش کرتے ہیں۔ ان تجاویز میں وہ ان ممالک کی مثالیں دیتے نظر آئے ہیں جو ان کے خیال میں مثالی ہیں اور اگر ان کو رول ماڈل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ معروف کالم نگار جاوید چودھری نے بھی اپنے کالموں میں ایسی صورتِ حال پیش کی ہے۔ ان کے یوٹوپیا کی عمارت چار ستونوں پر کھڑی نظر آتی ہے۔ جن میں اسلاموٹوپیا، جمہوری طرزِ حکومت اور سیکولر نظامِ حکومت اور آئیڈیل یا مثالی حکمران اور طرزِ حکمرانی شامل ہے۔ اسلام ایک مکمل ضابطہء حیات ہے اوراس میں تمام زمانوں اور تمام بنی نوعِ انسان کے لیے راہِ ہدایت ہے۔

ایک مثالی ریاست کی تشکیل کے لیے جاوید چوہدری نے جو ترتیب بتائی ہے اس کے مطابق کریڈیبلسٹی، استقامت، تبلیغ، ہجرت اور امن پر بنی چھوٹی سی ریاست کا قیام عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ اس ترتیب میں جہاد سب سے آخر میں آتا ہے۔

کالم نگار جاوید چودھری کے مطابق بھی ایسی مثالی ریاست کا وجود ممکن نہیں تھا اور نہ ایک آئیڈیل معاشرے کا وجود نہیں ہے۔ ہم مختلف معاشروں کو ان کی خوبیوں کے مطابق درجہ بندی کرتے ہیں لیکن آئیڈیل کی تلاش جاری ہے لیکن ان کے خیال میں مذہب کی بنیاد پر کسی مثالی ریاست کا حصول ممکن نہیں ہے۔ وہ مذہبی ریاست کے حق میں نہیں ہیں کیوں کہ مذاہب تقسیم اور بنیاد پرستی کا باعث بنتے ہیں۔ ریاست کو کسی عقیدے کا قائل نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن ریاست کو چاہیے کہ اپنے رہنے والوں کو عقیدے کی آزادی دے۔ جمہوریت ان کے نزدیک ارتقائی اور بہترین طرزِ حکومت ہے جو ایک عام آدمی کو بھی بادشاہت کا موقع فراہم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ۹۵ فی صد ممالک میں جمہوریت رائج ہے اور اس کی پٹڑی پر چل کر ہم معاشرے اور ریاست کو برقرار رکھنے اور بہتر بنانے کے قابل بنا سکتے ہیں۔ ریاستِ مدینہ کو بھی وہ ایک مثالی ریاست تصور نہیں کرتے جس کی وجہ خلفا کی شہادت اور ان کا بھیانک انجام تھا۔ وہ آج کی زندگی میں سانس لینے والے شخص ہیں اور یوٹوپیا کو ایک اضافی اصطلاح مانتے ہیں۔ اس بات پہ یقین رکھتے ہیں کہ تعلیم میں بنیادی

تبدیلی لا کر حالات کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ افلاطون، تھامس مور اور ایچ جی ویل کی طرح وہ بھی معاشرے کو بہتر بنانے پر یقین رکھتے ہے۔ ان کے خیال میں یوٹوپیا اس دنیا میں قابلِ حصول نہیں ہے ہاں ایک بہترین معاشرے کا قیام ان کی تجاویز کو سامنے رکھ کر عمل میں لایا جاسکتا ہے۔

کشور ناہید ادبی اور تانیثی کالم نگاری میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ وہ ایک تانیثی نقطۂ نظر رکھنے والی ادیب اور شاعرہ ہیں۔ عورت کی آزادی اور اس کی ترقی کو ملک کے بیشتر مسائل کا حل سمجھتی ہیں اور اس مقصد کے لیے وہ کوئی ہوائی قلعے تعمیر نہیں کرتی ہیں۔ اس کے بجائے حکومتِ وقت اور عوام کو کالموں کے ذریعے مفید مشوروں سے نوازتی ہیں۔ کشور ناہید کے کالموں میں بالعموم اور ان کی ادبی تحریروں نثر اور شاعری میں بالخصوص ان کا اندازِ فکر اور مخصوص نسائی نقطۂ نظر نمایاں ہے۔ اس حوالے سے وہ ان تمام ممالک کی مثالیں دیتی ہیں جہاں بظاہر عورت کو شخصی اور فکری آزادی حاصل ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان ترقی یافتہ ممالک میں اس کو اپنا یوٹوپیا نظر آتا ہے۔ اس کے مطابق ایک تعلیم یافتہ اور معاشی لحاظ سے آسودہ حال ماں ہی اپنے بچوں کی بہتر پرورش کر سکتی ہے۔ کشور ناہید نے واضح طور پر اپنے کالموں میں نسائی شعور کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور پورے شعور و ادراک سے اپنی تحریروں میں اس استحصال کا ذکر کیا ہے جو عورت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

سماجی کالم نگاروں میں ہارون الرشید کے ہاں یوٹوپیا کے عناصر واضح نظر آتے ہیں۔ ان کے کالموں کے جائزہ کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کے نزدیک یوٹوپیا کے قیام کے لیے چند خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ شخصیت پرستی وہ صحیح شخص صحیح جگہ پر (Right man in the right place) کا تصور پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر لوگ اچھے ہیں تو حالات میں بہتری کی توقع کی جاسکتی ہے۔ ان کے مطابق عظیم لوگ قوموں کی زندگیاں بدل سکتے ہیں۔ تاریخِ اسلام میں صلاح الدین ایوبی، شیر شاہ سوری، چنگیز خان اور قائدِ اعظم ان کے آئیڈیل (Ideal) ہیں۔

رجائیت پسندی ان کے کالموں کی بنیادی خصوصیت ہے۔ وہ پُر امید ہین کہ جذبہ، لگن اور خلوص سے ہم حالات کو بہتر بنا سکیں گے۔ ماضی پرستی، کالم نگار اپنے اکثر کالموں میں اسلام کے اس شاندار ماضی میں کھو جاتا ہے جب مسلمانوں کو عروج حاصل تھا اور وہ چشم تصور میں اس دور کو واپس لانے کی خواہش کرتے ہیں۔

رومانویت پسندی بھی ان کے یوٹوپیا کا اہم رُخ ہے۔ وہ اکثر کالموں اسلام کے اصولوں پر عمل کر کے لائی جاسکتی ہے۔ اسلام کی تعلیمات میں ہمارے تمام مسائل کا حل موجود ہے۔

اپنے یوٹوپیا کے حصول کے لیے انھوں نے عملی اقدامات تجویز کیے ہیں جن میں تعلیمی نظام میں بنیادی اصطلاحات، مخلص قیادت اور انقلابی اقدامات کی ضرورت ہے۔

معروف صحافی اور تجزیہ کار ارشاد بھٹی ایک محنتی صحافی اور تجزیہ کار ہیں۔ ان کا آئیڈیل مغربی جمہوری نظام ہے لیکن وہ اپنے ملک اور اس کے لوگوں کو اس کے مزاج کے مطابق نہیں سمجھتے ہیں۔ وہ آج کے حکمرانوں کے رویوں پر طنز کرتے ہیں کہ ان کی باتیں اور خیالات تو ریاستِ مدینہ قائم کرنے کے ہیں لیکن ان کے اعمال اور کردار اس کے مطابق نہیں۔ دوسرے کالم نگاروں کے برعکس حقیقت پسندی ان کے کالموں اور شخصیت کا اہم حصہ نظر نہیں آتی بلکہ وہ اس کے متضاد وہ ملک اور معاشرے سے نالاں نظر آتے ہیں۔ کالم نگار کے چند کالموں میں رومانویت پسندی کا عصر نظر آتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی وہ ایک حقیقت پسند نقطۂ نظر رکھنے والے شخص ہیں جو زندگی گزارنے کے لیے منطق اور دلیل کی راہ کو اپنانے کی تلقین کرتے ہیں۔ دوسرے کالموں کے برعکس ان کے ہاں رجائیت پسندی کا فقدان نظر آتا ہے۔

فکاہیہ کالموں میں ۲۱ویں صدی میں تحریر کیے گئے فکاہی کالموں میں عطاء الحق قاسمی اور منو بھائی کے کالموں میں طنز و مزاح کے ساتھ ساتھ یوٹوپیا کا رجحان پایا جاتا ہے لیکن یہ یوٹوپیا کی ایک قسم موک یوٹوپیا ہے۔ ان کالموں کا مقصد معاشرے میں موجود برائیوں کو سامنے لانا ہے۔ سنجیدہ موضوعات کے مقابلے میں فکاہیہ کالم اپنے اسلوب اور انداز کے باعث دوسرے کالموں سے مختلف ہوتا ہے۔ فکاہیہ کالم نگار جہاں لسانیاتی اور اسلوبی نقطۂ نگاہ سے فن کی بلندیوں پر نظر آتا ہے وہاں فکری لحاظ سے بھی وہ فن کی کاری گری دکھاتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی اپنے فرضی کرداروں کو اپنا نمائندہ بنا کر دل کی بات کرتا ہے۔ حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ ان کے کالموں میں تصوراتی اور رومانوی فضا نظر آتی ہے۔ کئی کالموں میں ماضی پرستی یا ناسٹلجیا بھی نظر آتا ہے اور اسلام سے گہری محبت بھی اکثر کالموں میں جھلکتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو بحیثیت مجموعی کالم نگار مثبت سوچ رکھنے والے، پُر امید شخصیت کے مالک ہیں لیکن ان تمام عناصر کو وہ فکاہی انداز میں اپنے کالموں میں بیان کرتے ہیں اور اسی اسلوب کے ذریعے وہ کالموں میں اپنا یوٹوپیا تشکیل دیتے ہیں۔

منو بھائی ایک صحافی کالم نویس اور شاعر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی کی طرح ان کے کالموں میں بھی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ملک کو جمہوریت کی پٹڑی پر چلتا دیکھ کر ترقی کرنے کے خواہاں ہیں۔ وہ انسانیت کے مستقبل کے بارے میں پُر امید نظر آتے ہیں۔

انگریز ادیب جوناتھن سوئفٹ کی طرح ان دونوں کالم نگاروں کے ہاں موک یوٹوپیا نظر آتا ہے جس کے بنیادی عناصر میں طنز تنقید، علامت نگاری، فرضی ماحول اور کردار شامل ہیں۔

مندرجہ بالا تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ مختلف کالم نگار (سیاسی، سماجی، مذہبی اور فکاہی) زندگی کو مختلف زاویوں سے پرکھتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ایک بہتر زندگی کا تصور ان کی ترجیحات میں شامل ہے۔

نتائج

۱۔ کالم نگار معاشرے کا عکاس ہے اس لیے کالم پر داخلی حالات سے زیادہ خارجی، واقعات اثر انداز ہوتے ہیں۔

۲۔ کالموں میں یوٹوپیائی رجحان سماج کے اضطراب اور بے اطمینانی کی علامت ہوتا ہے اس لیے کالم نگار موجودہ حالات میں تبدیلی لانے کے لیے اپنے آئیڈیل کو بطور یوٹوپیا پیش کرتا ہے۔

۳۔ ادب اور نفسیات دونوں میدانوں میں یوٹوپیا ایک متفرق رجحان کے طور پر سامنے آیا ہے۔ علم نفسیات میں اس رجحان کی موجودگی فرد کے داخلی و خارجی رجحانات سے فرار کی علامت ہے لیکن منتخب کالم نگاروں کے ہاں اس نفسیاتی رجحان کی بنیاد تکمیل پسندی اور مثالیت پسندی کی خواہش ہے۔

۴۔ منتخب کالم نگاروں کے ہاں یوٹوپیا کا رجحان فراریت کے برعکس (Lewis Mumford) کے نظریہ تشکیل نو (Reconstruction) کی نمائندگی کرتا ہے۔

۵۔ منتخب موضوعات پر تحریر کیے گئے کالموں میں کالم نگار ایسے مثالی حالات پیش کرتے ہیں اور وہ حالات کی تبدیلی کا خواہاں نظر آتا ہے۔

۶۔ منتخب کالم نگاروں کا تصور یوٹوپیا ان کی عملی رجائیت پسندی کے نقطہ نظر کی عکاسی کرتا ہے۔

سفارشات

۱۔ تحقیق کے نتیجے میں یہ بات واضح ہوئی ہے کہ یوٹوپیا کی مختلف اقسام ہیں لیکن یوٹوپیا کی اقسام پر انفرادی سطح پر مزید تحقیق کی گنجائش ہے۔

۲۔ اسلاموٹوپیااور فیمنسٹ یوٹوپیا کا تحقیقی مطالعہ مختلف کالم نگاروں کے ہاں کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ فیمنسٹ یوٹوپیا پر الگ سے تحقیقی کام کی گنجائش نظر آتی ہے کیونکہ کالم نگاروں کی طویل فہرست اس کی حامی نظر آتی ہے۔

۴۔ ایک جیسے رجحان کے تحت کالم لکھنے والے کالم نگاروں کا تقابلی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً اوریا مقبول جان اور خورشید احمد ندیم کا اسلاموٹوپیا کے رجحان کی بنیاد پر تقابلی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

۵۔ موضوعاتی کالموں کا تقابلی جائزہ لیا جاسکتا ہے مثلاً دینی، سیاسی اور سماجی کالم نگاروں کا یوٹوپیا کے رجحان کے تناظر میں تقابلی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

۶۔ فکاہی کالم نگاروں کے ہاں mock. Utopia یا dystopia کے رجحان کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ ہو سکتا ہے۔

۷۔ مختلف ادب پاروں میں نوسٹلجیا کے رجحان کا تحقیقی جائزہ لینے کے بعد ان کا تقابل بھی کیا جاسکتا ہے۔

۸۔ اکیسویں صدی میں تحریر کردہ افسانوی اور غیر افسانوی ادب میں مذکورہ رجحان کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ جو تقابلی تحقیق (Comparative Research) میں ایک اہم حصہ ثابت ہوسکے گا اور اس تناظر میں انگریزی اور اردو ادب کا تقابل بھی کیا جاسکتا ہے۔

۹۔ اسلاموٹوپیا کے رجحان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مسلم سماج اور سیکولرزم کے مختلف پہلوؤں کو زیرِ بحث لایا جاسکتا ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

۱. ابوالاعجاز حفیظ صیدیقی "کشاف تنقیدی اصطلاحات"، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء
۲. ارشاد بھٹی، مہمان کالم، روزنامہ جنگ، لاہور، ۱۴ جولائی ۲۰۲۰ء
۳. اوریا مقبول جان، حرف راز ۱، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۸ء
۴. اوریا مقبول جان، حرف راز ۲، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۶ء
۵. اوریا مقبول جان، حرف راز ۳، ۲۰۱۳ء
۶. اوریا مقبول جان، حرف راز ۴، ۲۰۱۳ء
۷. اوریا مقبول جان، حرف راز ۵، ۲۰۱۳ء
۸. اوریا مقبول جان، حرف راز ۶، ۲۰۲۰ء
۹. اوریا مقبول جان، حرف راز ۷، ۲۰۲۰ء
۱۰. اوریا مقبول جان، مجھے ہے حکم اذاں، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۲ء
۱۱. جاوید اقبال "اپنا گریبان چاک "خود نوشت سوانح حیات" سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء
۱۲. جاوید چودھری، زیرو پوائنٹ ۱، علم و عرفان پبلشرز، اردو بازار لاہور، مطبع، زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۹ء
۱۳. جاوید چودھری، زیرو پوائنٹ ۲، علم و عرفان پبلشرز، اردو بازار لاہور، مطبع، زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور، اکتوبر ۲۰۰۹ء
۱۴. جاوید چودھری، زیرو پوائنٹ ۳، علم و عرفان پبلشرز، اردو بازار لاہور، اشاعت دوم، اپریل ۲۰۱۰ء
۱۵. جاوید چودھری، زیرو پوائنٹ ۴، علم و عرفان پبلشرز، اردو بازار لاہور، اشاعت دوم ۲۰۱۰ء
۱۶. جاوید چودھری، زیرو پوائنٹ ۵، الرشید پرنٹرز، لاہور، ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۹ء
۱۷. جاوید چودھری، زیرو پوائنٹ ۶، طاہر سنز پبلشرز، اردو بازار لاہور، ۱۱ اکتوبر، ۲۰۰۹ء
۱۸. حضرت سید عبد الکریم بن ابراہیم جیلانی، "انسان کامل"، مترجم مولوی فضل میراں، نفیس اکیڈمی بلال سٹریٹ کراچی، ۱۹۸۰ء

۱۹. خورشید احمد ندیم، "سماج، ریاست اور مذہب"، متبادل بیانیہ، سہیل الطاف پرنٹرز، راول پنڈی، جون ۲۰۱۹ء، اشاعت دوم
۲۰. خورشید احمد ندیم، مسلم سماج اور سیکولرزم (دیباچہ)، ادارہ تعلیم و تحقیق، اسلام آباد، ۲۰۲۰ء
۲۱. خورشید عبد السلام، "فن صحافت"، مرکزی اردو بورڈ لاہور، ۱۹۲۸ء
۲۲. رشید امجد، کشور ناہید۔ ایک چیلنج مشمولہ نئے زمانے کی برین، از مرتب اصغر ندیم سید، افضال احمد، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۰ء
۲۳. فرہاد زیدی، ریت پر لکھا، رب پبلشرز کراچی، ۲۰۰۶ء، ص۹
۲۴. قادری سید اقبال، رہبر اخبار نویسی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۸۹ء، ص ۳۱۲
۲۵. کالم تمام، عطاء الحق قاسمی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء
۲۶. کشور ناہید، مہمان کالم، روزنامہ جنگ، کراچی، ۱۸ مارچ ۲۰۱۵ء
۲۷. محمد اسلم ڈوگر، انگریزی کتب فیچر کالم اور تبصرہ"، ۱۹۹۹ء، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد
۲۸. محمد شمس الحق، پیمانہ غزل (جلد دوم)، نیشنل بک فاؤنڈیشن، کراچی ۲۰۰۸ء
۲۹. محمد منصور عالم "شمس الرحمن فاروقی کی تنقید نگاری"، مختار احمد پرنٹ آرٹس کریم گنج بودھ گیا، نومبر ۲۰۰۸ء
۳۰. مفتی ابولبابہ، شاہ منصور، "تحریر کیسے کریں"، الفلاح کراچی، ۲۰۰۸ء، ص ۳۸۵
۳۱. منو بھائی، ادارتی صفحہ، روزنامہ جنگ، ۱۴ اگست ۲۰۱۷ء
۳۲. ہارون رشید، کالم "ناتمام" روزنامہ دنیا، لاہور، ۳ فروری ۲۰۲۲ء
۳۳. وحید الرحمن خان، "خانہ بگوش ایک مطالعہ"، اکادمی بازیافت لاہور، فیروز سنز ۲۰۰۴ء

اردو اخبارات:

۱. روزنامہ دنیا، ۲۰ اکتوبر ۲۰۲۱ء
۲. روزنامہ جنگ، ۱۷ دسمبر ۲۰۲۱ء، راولپنڈی
۳. روزنامہ جنگ، ۱۷ مئی ۲۰۲۱ء، راولپنڈی
۴. روزنامہ جنگ، ۱۳ جنوری ۲۰۲۱ء، راولپنڈی
۵. روزنامہ جنگ، ۱۷ اکتوبر ۲۰۲۰ء، راولپنڈی

۶. روزنامہ جنگ، ۱۸ جنوری، ۲۰۲۰ء، راولپنڈی

۷. روزنامہ جنگ، ۱۴ دسمبر ۲۰۱۹ء، راولپنڈی

۸. روزنامہ دنیا، ۱۸ نومبر ۲۰۱۹ء، راولپنڈی

۹. روزنامہ دنیا، ۱۲ اکتوبر ۲۰۲۱ء، کراچی

۱۰. روزنامہ دنیا، ۱۵ اگست ۲۰۲۱ء، کراچی

۱۱. روزنامہ دنیا، ۸ جولائی ۲۰۲۱ء، راولپنڈی

۱۲. روزنامہ دنیا، ۲۹ جون ۲۰۲۱ء، راولپنڈی

۱۳. روزنامہ دنیا، ۶ مئی ۲۰۲۱ء، راولپنڈی

۱۴. روزنامہ دنیا، یکم اپریل ۲۰۲۱ء، راولپنڈی

۱۵. روزنامہ دنیا، ۱۸ فروری ۲۰۲۱ء، راولپنڈی

۱۶. روزنامہ دنیا، ۹ مئی ۲۰۲۰ء راولپنڈی

۱۷. روزنامہ دنیا، ۱۵ فروری ۲۰۲۰ء، راولپنڈی

۱۸. روزنامہ دنیا، ۱۳ اگست ۲۰۱۹ء، راولپنڈی

۱۹. روزنامہ دنیا، ۳۱ دسمبر ۲۰۱۹ء، راولپنڈی

۲۰. روزنامہ دنیا، ۲۹ مئی ۲۰۱۸ء، راولپنڈی

۲۱. روزنامہ دنیا، ۲۱ جنوری ۲۰۱۷ء، راولپنڈی

۲۲. روزنامہ دنیا، ۲۴ اگست ۲۰۱۶ء، راولپنڈی

۲۳. روزنامہ دنیا، ۲ مئی ۲۰۱۶ء، راولپنڈی

۲۴. روزنامہ دنیا، ۱۵ اگست، ۲۰۱۵ء، راولپنڈی

۲۵. روزنامہ دنیا، ۲۵ اگست ۲۰۱۵ء، راولپنڈی

۲۶. روزنامہ دنیا، ۱۱ مارچ ۲۰۱۴ء، راولپنڈی

۲۷. روزنامہ دنیا، ۱۲ اپریل ۲۰۱۳ء، راولپنڈی

۲۸. روزنامہ دنیا، ۱۳ اپریل ۲۰۱۳ء، راولپنڈی

۲۹. روزنامہ دنیا، ۲۳ مارچ، ۲۰۱۹ء، راولپنڈی

۳۰. روزنامہ دنیا، ۱۹ فروری ۲۰۱۹ء، کراچی

۳۱. روزنامہ دنیا، ۲۹ مارچ ۲۰۱۹ء، کراچی

۳۲. روزنامہ دنیا، ۲۷ مارچ ۲۰۱۹ء، کراچی

۳۳. روزنامہ دنیا، ۱۹ فروری، ۲۰۱۹ء، راولپنڈی

۳۴. روزنامہ دنیا، یکم نومبر ۲۰۱۸ء، راولپنڈی

۳۵. روزنامہ دنیا، ۹ دسمبر ۲۰۲۱ء، راولپنڈی

۳۶. روزنامہ دنیا، ۳۱ مارچ ۲۰۱۲ء، کراچی

۳۷. روزنامہ جنگ، ۱۵ نومبر ۲۰۲۱ء، راولپنڈی

۳۸. روزنامہ جنگ، ۳۱ مئی ۲۰۲۱ء، راولپنڈی

۳۹. روزنامہ جنگ، ۹ نومبر ۲۰۲۰ء، راولپنڈی

۴۰. روزنامہ جنگ، ۱۴ مئی ۲۰۲۰ء، راولپنڈی

۴۱. روزنامہ جنگ، ۱۲ دسمبر ۲۰۱۹ء، راولپنڈی

۴۲. روزنامہ جنگ، ۱۰ جولائی ۲۰۱۹ء، راولپنڈی

۴۳. روزنامہ جنگ، ۴ مارچ ۲۰۱۹ء، راولپنڈی

۴۴. روزنامہ ۹۲ نیوز، ۳ فروری، ۲۰۲۲ء، راولپنڈی

۴۵. روزنامہ ۹۲ نیوز، ۲۵ اپریل ۲۰۲۲ء، راولپنڈی

۴۶. روزنامہ جنگ، ۷ اگست ۲۰۲۱ء، راولپنڈی

۴۷. روزنامہ جنگ، ۲۰ مارچ ۲۰۱۵ء، راولپنڈی

۴۸. روزنامہ جنگ، ۱۶ مارچ ۲۰۱۱ء، راولپنڈی

۴۹. روزنامہ جنگ، ۱۰ مارچ ۲۰۱۲ء، راولپنڈی

۵۰. روزنامہ جنگ، ۲۱ دسمبر ۲۰۱۵ء، راولپنڈی

۵۱. روزنامہ جنگ، ۸ دسمبر ۲۰۱۷ء، راولپنڈی

۵۲. روزنامہ جنگ، ۲۵ دسمبر ۲۰۱۲ء، راولپنڈی

۵۳. روزنامہ جنگ، ۶ جولائی ۲۰۱۴ء، راولپنڈی

انگریزی کتب

1. “Utopia” Thomas Moor, Published by Global Groy, 2018
2. “A Modern-Utopia’ by H. G. Wells, Global-Groy, e books, 2018
3. Bloom, Allam, “The Republic of Plato” Translated with notes and essays, New York: Basic Books, 1991.
4. AJ, Mine, “The Social Philosophy of English Idealism”, Rontlege Library Edition, 1989
5. M.C.Donalld, L “Early Origin of Social Sciences, MC Gill Queen, Press 1993.
6. Prof Sigmund, Freud, “An Outline of Psycholanalyss”, Text book by Charles Stangor, 1949.
7. Prof Sigmund, Freud, A General Introduction to Psychoanalysis”, Oxford Press, 1917.
8. F.H Bradley, “Appearance and Reality”, 2nd Edition, London, 1897.
9. Thomas Moor “Utopia”, Translated by Ralph Robinson, Harburg, London, 1684.
10. H.G Well “A Modern Utopia”, Published by Chapman and Hall, England, April 1905.
11. Mikhael Muhammad Knight” Islam after liberalism” Oxford University Press, London 2017.
12. Waggren, Lena: “Feminist Utopia” Literary Encyclopedia, Nov 2018
13. Thomas A. Markus, “Social Change and the Modern Metropolis” Psychology, Press 2002.
14. Eric, Mckenna, “The task of Utopia” A Pragmatism and Feminist Perspective New York: Rowman and Little field Publishers, 2001.
15. Ann Fergusan, “Images of Women in Literature”, Boston, Miffin Company, 1981.

انگریزی آرٹیکل

1. Barbar. Javed, “Social Utopia: A Study of Perfect Socio-Political Setup “University of Gondar International Journal of Research, Jan 2014.
2. Sahgal, “Legislating Utopia, violence against women”, 2006, http:itbooks
3. Mark K, and Engels, “Communist Manifesto”, Retrived from http:/www.gutenverg
4. Barclay, M.W. “Utopia, Dystopia” a doctoral dissertation, Graduate School and Research Centre, 1990.
5. Review of Riot Sarcay, Utopia by Janathan Beecher”, 2014

ثانوی ماخذ

اردو کتب

۱. "مجموعہ ڈاکٹر محمد یونس بٹ ۲"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء

۲. انور علی دہلوی، "اردو صحافت، ادارہ اکادمی دہلوی، ۱۹۸۹ء

۳. بشیر سیمفس، ڈاکٹر، "اردو میں انشائیہ نگاری، نذیر سنز پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۹ء

۴. خورشید احمد ندیم، اسلام اور پاکستان، ادارہ علم و تحقیق، اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۵. خورشید سمیع، ڈاکٹر، ادب اور نفسیات، مرتب کمال سمیع، ڈاکٹر

۶. شفیق جالندھری، صحافت وابلاغ، اے ون پبلشرز، الفضل مارکیٹ، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۸ء

۷. شفیق جالدھری، ڈاکٹر، "اردو کالم نویسی، اے ون پبلشرز، الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور، ۱۹۹۳ء

۸. شفیق جالندھری، ڈاکٹر، "فیچر نگاری"، علمی کتب خانہ، کبیر سٹریٹ اردو بازار، لاہور، ۱۹۸۳ء

۹. شکیل الرحمٰن، ڈاکٹر، ادب اور نفسیات، اشاعت گھر، پٹنہ، ۱۹۵۱ء

۱۰. شکیل الرحمٰن، ڈاکٹر، ادبی قدریں اور نفسیات، معصوم پبلی کیشنز، جواہر نگر، سری نگر، یکم ستمبر ۱۹۷۰ء

۱۱. صفدر محمود، ڈاکٹر، "پاکستان تاریخ وسیاست"، زاہد بشیر پرنٹرز بندر ۲۰۱۶ء

۱۲. طاہر مسعود، ڈاکٹر، "اردو صحافت انیسویں صدی میں "ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی ۲۰۰۹ء

۱۳. ظفر عالم ظفری ڈاکٹر، اردو صحافت میں طنزو مزاح، فیروز سنز پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء

۱۴. ظفر عالم ظفری، اُردو صحافت میں طنز و مزاح، فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۹۴ء

۱۵. عبد السلام خورشید، صحافت پاک وہند میں مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۹۲ء

۱۶. عبد الغفار کوکب، ڈاکٹر، اردو صحافت اور فکاہیہ کالم کی روایت، بیکن بکس، لاہور، ۲۰۰۷ء

۱۷. عطاء الحق قاسمی، "دنیا خوبصورت ہے"، دعا پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء

۱۸. عطاء الحق قاسمی، روزن دیوار سے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء

۱۹. کشور ناہید، "زخم برداشتہ "، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء

۲۰. کشور ناہید، "گمشدہ یادوں کی واپسی "سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء

۲۱. کشور ناہید، زخم برداشتہ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء

۲۲. مجموعہ ڈاکٹر محمد یونس بٹ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء

۲۳. مجموعہ کالم، "دوکان ہنر" کشور ناہید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء

۲۴. مجموعہ کالم، "ورق ورق" آئینہ، کشور ناہید سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء

۲۵. محمد حسنین "شگفتہ تحریروں کا انسائیکلوپیڈیا"، چوہدری غلام رسول اینڈ پبلشرز، لاہور

۲۶. منو بھائی، "جنگل اداس ہے"، ندیم یونس پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۴ء

۲۷. نذیر ناجی، "سویرے سویرے"، بک ماسٹر، لاہور، ۱۹۹۰ء

۲۸. ہمایوں ادیب "صحافت پاکستان میں" عزیز پبلشرز، اردو بازار لاہور، ۱۹۸۴ء

۲۹. وزیر آغا، ڈاکٹر، "اردو ادب میں طنز و مزاح"، مکتبہ عالیہ، اردو بازار لاہور، ۱۹۹۳ء

اردو آرٹیکل

۱. مفتی تنظیم عالم قاسمی "موجودہ عالمی حالات اور غزوہ خندق کا پیغام، حدیث دارالعلوم، نبیل الاسلام حیدر آباد، ۲۰۱۴ء

لغات

۱. فرہنگ اصطلاحات، جامعہ عثمانیہ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد مطبع اظہار سنز، پرنٹرز رنگ روڈ لاہور

۲. فیروز اللغات، فیروز سنز لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۵۴۹

۳. نور اللغات (جلد دوم)، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، نیلاب پرنٹرز، گوالمنڈی، راولپنڈی

4. Oxford Advanced Learners Dictionary of Current English by A.S Horriby Oxford.
5. Encylopedia Britanica Volumen III

مقالات

۱. رخشندہ مراد، ڈاکٹر، "پاکستان میں غیر افسانوی نثر کا اسلوبیاتی مطالعہ: تحقیقی مقالہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

۲. عبدالغفار کوکب، فکاہیہ کالم نگاری، آغاز تا حال اخبار جنگ

۳. عفیرہ احمد ڈاکٹر، "اردو زبان وادب کی ترقی میں صحافت کا حصہ ۷: تحقیقی مقالہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۴. نثار احمد، ڈاکٹر، "اردو کالم نگاری (ادبی اور لسانی تجزیہ)" مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی، نمل، ۲۰۱۵ء

۵. زینب بی بی، فکاہیہ کالم نگاری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ) مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی سرحد یونیورسٹی، پشاور، ۲۰۱۹ء

۶. جدید اردو نظم کا بدلتا منظر نامہ، یوٹوپیا سے ناسٹلجیا تک، مقالہ برائے ایم فل، مقالہ نگار ملک محمد عمر خان، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۷ء

۷. ارم ناہید، زاہدہ حنا اور کشور ناہید کے کالموں کا تقابلی مطالعہ، مقالہ برائے ایم۔اے بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۱۵ء

انگریزی کتب

1. Johnson, J. 2012m :Escapism Psychology". Acntal Retrcat from Reality, 29 April, 2012.
2. M. C. Ouffeens, Harry, 2011, Escapism Psychology" 29 April 2012.
3. George-drwell, 1984, Utopia dystopia, oxford Press.
4. Cherry Kendea "The structural Model of Personality"
5. Alex Kozulin "Psychology in Utopia" the . . ..
6. Cherry Kendra, "The Id, Ego and superego" The structural model ofPersonality. 2012.
7. David Bleich: "Utopia: The Psychology of a cultural fantasy" UMI Researach Press, Jan, 1 1984.
8. FE Manuel" Toward a Psychological History of Utopians 1965.
9. DR Fox" Psychology, Idiology, utopia and the commons, 1985.
10. Jason H. Pearl utopian Geographies the Early English Novel, UVA Press.

انٹرویو:

ذاتی انٹرویو:

جاوید چودھری (ذاتی انٹروی) (۲۲۔۸۔۳۱)

خورشید احمد ندیم (ذاتی انٹرویو) (۲۲۔۹۔۷)

انٹرویو(جاوید چودھری)

س:ایک یوٹوپیائی ریاست کے متعلق آپ کا کیا تصور ہے؟

ج: یوٹوپیا ایک Greek لفظ ہے Greeks نے کوشش کی ایسا ملک ہو جس میں برابری ہو، انصاف ہو اور عام آدمی بھی بادشاہ بن سکے۔ یونانیوں کا فلسفہ تھا پوری دنیا کوشش کرتی رہی ہے۔ ایک خواب ہے اور ہر عام آدمی اس کے لیے کوشش کرتا ہے لیکن اس وقت ممکن نہیں ہے۔ مسلم گریڈنگ کرتے ہیں۔ انصاف کے لحاظ سے ایجوکیشن کے لحاسے کون سا ملک بہتر ہے۔

س: کیا آپ کے خیال یوٹوپیائی ریاست کا وجود آج کے دور میں یا پہلے کبھی رہا ہے؟

ج: آئیڈیل دنیامین۔ نہیں ہے۔ کوئی ایسا ملک نہیں ہے جس میں بے انصافی، چوری نہ ہو تو جب ایسا ہے نہیں تو یوٹوپیا بھی نہی ہے۔ لیکن آئیڈیل کی تلاش ضرور ہے کوئی ایسا ملک نہیں ہے جس میں ہر قسم کی برائی نہ ہو۔

س:۳: آپ کے خیال میں اسلاموٹوپیا کے ذریعے یوٹوپیا کا قیام عمل میں لایا جاسکتا ہے؟

ج: مذہب کے ساتھ ایک معاشرے کو آئیڈیل نہیں بناسکتے۔ مذہب تقسیم کرتا ہے جب آپ مذہب کی بات کرتے ہیں تو اس کے پیروکار سمجھتے ہیں کہ میں ٹھیک ہوں اور دوسرے غلط ہیں۔ تمام مذاہب سمجھتے ہیں کہہ اُن کے پاس تمام مسائل کا حل ہے اس لیے دنیامیں ہم اس بات پر نہیں جی سکتے۔

س:۴ کیا آپ سمجھتے ہیں اسلاموٹوپیا (Islam is the solution) کا نعرہ ٹھیک ہے؟

ج: مذہب انسانوں کا ہوتا ہے۔ گورنمنٹ کا مذہب نہیں ہوتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ۷۰ فی صد مسلمان ۳۰ فیصد عیسائیوں کو غلط سمجھتے ہیں۔ میرے خیال میں عقیدہ سٹیٹ کا نہیں ہونا چاہیے انسانوں کا ہوتا ہے۔ عقیدے کی بنیاد پر دو ملک بنے اسرائیل اور پاکستان اور دونوں بحران کا شکار ہیں لیکن یہودی علاقوں میں بھی مساجد ہیں معاشرے کو چلانے کے لیے مذہب کو سائیڈ پر رکھتا ہو گا۔ مذہب کو لاگو نہیں کرنا چاہیے۔

س:۵ آپ کے خیال میں قائد اعظم پاکستان کو ایک مذہبی ریاست بنانا چاہتے تھے یا اسلامی ریاست؟

ج: قائد اعظم نے بعض جگہ یہ کہا کہ۔ میں مسلمانوں کے لیے ایک ملک بنا رہا ہوں۔ اسلامی ریاست اور مسلمانوں کے لیے رسالت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ قائد اعظم کی کابینہ میں ہندو، عیسائی اور قادیانی شامل تھے۔ پاکستان کا قانون بنایا۔ قائد اعظم کی کابینہ میں ہندو، عیسائی اور قادیانی شامل تھے ایئر یر فورس اور وزیرِ خارجہ بھی عیسائی اور احمدی تھے۔ ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے شامل تھے اور مختلف تھے۔ قائدِ اعظم ان کو تحفظ دیتے تھے۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ ان کا نقطۂ نظر کس قدر وسیع تھا۔ قائد اعظم ان کو تحفظ دیتے تھے۔ ان کا نقطہ نظر وہ نہیں تھا جو بعد میں بیان کیا گیا۔ ان کی نرس بھی عیسائی تھی۔ اگر آپ مذہبی ریاست بناتے ہیں تو دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کے چار فقہا ہیں اور پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس فقہ کے مطابق نظام چلے گا اور اس controversy تضاد کے نتائج خطرناک بلکہ بھیانک ہو سکتے ہیں۔

س۶۔ آپ کے خیال میں کون سا نظامِ حکومت بہتر ہے جمہوریت یا خلافت؟

ج: حکومت کے نظام (Evolve) ہوتے رہے ہیں۔ بادشاہت سے جمہوریت تک کا اور آخر میں لوگوں نے سمجھا کہ عام آدمی کو بھی حکومت کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ ۹۰ فی صد ممالک میں جمہوریت ہے کہیں پارلیمنٹ اور کہیں صدارتی نظام لیکن ہے جمہوریت۔ اگر اس order کو reverse کر دیں تو ہمیں فائدہ نہیں ہو گا۔

س۷: کیا آپ کے خیال میں یوٹوپیا کی تشکیل آج کے دور میں ممکن ہے۔

ج: یوٹوپیا تو یوٹوپیا ہے جس کی تشکیل کسی بھی دور میں ممکن نہیں تھی لیکن کم از کم ہم اس کو livcable بنا سکتے ہیں۔ یوٹوپیا تو کبھی بھی نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہو سکے گا۔

س۸: آپ اپنے کالموں میں فرضی کردار تخلیق کرتے ہیں کیا اس کی مدد سے آپ (mock.ultopia)چاہتے ہیں؟

ج: میں فرضی کردار تخلیق نہیں کرتا۔ نقاد کیا کہتے ہیں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ صحافی آج کی دنیا میں رہتا ہے اور میری تربیت بھی ایسی ہے میں بہت زیادہ پاسٹ یا فیوچر میں نہیں جاتا۔ اللہ چاہتا تھا کہ آئیڈیل سوسائٹی بنے لیکن ابھی تو نہیں بنی۔

س۹: ریاست مدینہ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: ریاستِ مدینہ ایک (controversicl) issue ہے کیونکہ چاروں شہدا کا انجام بھیانک ہوا تھا۔ ایک مثالی ریاست کا کوئی وجود نہیں تھا۔ کبھی نہیں۔State کو مذہب سے الگ کر کے رکھیں یہ حقیقت نہیں ہے۔

س۱۰: آئیڈیلزم پایا جاتا ہے۔ آئیڈیل کردار میں بڑی تبدیلی لا سکتا ہے؟

ج: again میرا آئیڈیل آپ کا ولن ہو سکتا ہے۔ (relative) اس طرح ہے۔Heroes یا (relative-villian) ہیں قائداعظم اور گاندھی) گاندھی ہمارا ولن اور سرحد پار ہیرو ہے جبکہ قائداعظم ہمارے ہیرو اور ادھر ولن ہیں۔

س۱۱: تعلیم کے ذریعے حالات کو بہتر بنا سکتے ہیں؟

ج: مختلف نظام میں(models) ہیں۔ ایجوکیشن کے جن کی مدد سے ہم یوٹوپیا تو نہیں لیکن ایک بہتر سوسائٹی بنا سکتے ہیں۔ میں ایک بہتر معاشرہ بنانے پر یقین رکھتا ہوں لیکن آئیڈیل میرے لیے ایک اضافی (relative)اصطلاح ہے۔

س۱۲: موجودہ حالات میں یوٹوپیا کی تشکیل ممکن ہے؟

ج: موجودہ حالات یا کسی بھی حالات میں ممکن نہیں ہے کیون کہ (Ideal) کا لفظ ہی میرے لیے (controvcrsial)ہے۔

انٹرویو(خورشید احمد ندیم)

س ۱: کیا ریاست مدینہ ایک مذہبی ریاست تھی؟

ج: مذہبی ریاست نہیں تھی ریاست مدینہ طالبان کی حکومت مذہبی ریاست تھی۔

س ۲: کیا خلافت ایک دینی اصطلاح ہے یا سیاسی اصطلاح؟

ج: خلافت ایک دنی اصطلاح نہیں ہے نماز روزہ کی طرح کیونکہ قرآن پاک میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

س ۳: چین مغربی ممالک یا ریاست مدینہ میں سے آپ کس کو یوٹوپیا کے قریب تر سمجھتے ہیں؟

ج: مذہبی سرگرمیوں کو ریاست کنٹرول کرتی ہے جبر کے ذریعے لیکن امریکہ اور مغربی ممالک میں آزادی کے ساتھ کام ہوتا ہے۔ مثلاً کہاں جمعہ ہوگا اور کیا کیا جائے گا ریاست اس کو منظم کر سکتی ہے۔ مسجد کو ایک مذہبی پلیٹ فارم کے طور پر سٹیٹ استعمال کر سکتی ہے حکمرانوں نے اس کام کو مولویوں کے حوالے کر دیا ہے جو حکمرانوں کا کام تھا۔ سعوی عرب میں بھی مذہب کے حوالے سے جبر ہے۔

س ۴: آپ کیا سمجھتے ہیں یوٹوپیا ممکن ہے اور ایسی ریاست ہے یا تھی جس کو آپ یوٹوپیا سمجھتے ہیں؟

ج: یوٹوپیا قائم کرنے کے دو طریقے ہیں یا ذہن میں ایک ایسی سوسائٹی تیار کریں یا پھر ماضی میں ایسا تجربہ ہوا اور میرے نزدیک نہ ماضی اور نہ حال میں ایسا تجربہ ہوا تھا۔

ماضی میں خلافت راشدہ اور اس سے قبل حضرت یوسف علیہ السلام کا دور جس کو مثالی کہا جا سکتا ہے خیالی دنیا لیکن ایک امر واقعہ ہے۔ لیکن یہ بات کرنا کہ اس دور میں کوئی خرابی نہیں تھی تو غلط ہے ایک ایسا سسٹم e volve ہوا اسے اور ایسی چیز کوئی تھی جو سیاست یا ریاست تو میرے خیال میں ویسٹ نے کوشش کی ہے اور بہتر کوشش کی ہے۔

س ۵: ہارون رشید کی طرح آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا مزاج ہی جمہوری نہیں ہے؟

ج: ہمارے کچھ خواب ہیں تاریخ ہے. ہم انتظار میں رہتے ہیں کہ کوئی آئے گا اس کو اپنا savior بنا لیں گے معاشرے کا اجتماعی سسٹم خواب دیکھنا ہے جبکہ جمہوریت اجتماعی دانش کا تصور دیتی ہے خلافت میں اختیارات ایک شخص کے پاس ہوتا ہے اور مغرب اجتماعی دانش کی تلاش میں ہے جو آگے چل کر بہتر فیصلہ کر سکتے ہین۔ کوئی divine الہامی چیز نہیں ہوتی ہے۔ فرد بھی اور معاشرہ بھی آزمائش سے گزر رہے ہیں خوب سے خوب تر کی تلاش جاری ہے۔

س۶: کیا آپ جمہوریت کو خلافت کے قریب تر سمجھتے ہیں؟

ج: خلافت آمرانہ نظام ہے اختیارات کا ارتکاز ہے۔ جمہوریت میں اقتدار کی تقسیم ہوتی ہے۔ اختیارات مقامی حکومت تک تقسیم ہوتے ہیں جبکہ اقتدار میں اختیارات کا منبع ایک ذات نہیں ہے۔

س۷: آپ نے اپنے کالموں میں ریاست مدینہ کے قیام کو ایک معجزاتی عمل قرار دیا ہے جواب ممکن نہیں ہے وضاحت کریں؟

ج: ریاست مدینہ خدائی فیصلہ تھا وہ اللہ نے پہلے سے بتایا تھا ان کے بارے میں اللہ کا خاص قانون تھا اور پیشنگوئی کی گئی تھیں۔ رسالت مآب ﷺ کا اقتدار قائم تھا فرشتے مدد کے لیے اترتے تھے۔ اب کوئی الہامی (divine) فیصلہ نہیں آنے والا ہے ہاں ہم اس کو حاصل کرنے کی کوشش ضرور کر سکتے ہیں۔

س۸: سیکولر اسلام اور پاپولر اسلام میں کیا فرق ہے؟

ج: سیکولر اسلام اور پالولر اسلام۔ اصل میں دو چیزیں ہیں سیکولرازم مکمل آئیڈیالوجی ہے پاپولر اسلام ریاست کا پورا انتظام کے مطابق ہے جس کو میں صحیح نہیں سمجھتا ہوں۔

س۹: کیا یوٹوپیا موجودہ مسائل کا حل ہے؟

ج: سٹیٹ کو بنیادی طور پر تحفظ فراہم کرنا چاہیے طاقتور کو سٹیٹ کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ سٹیٹ کو اپنا مذہب یا عقیدہ عوام پر لاگو نہیں کرتی ہے مذہب نافذ کرنا سٹیٹ کی ذمہ داری نہیں ہے جیسے خلافت راشدہ نے سب مذاہب کو تحفظ فراہم کیا اسلام ہماری تسکین کے لیے آیا ہے یہ بنیادی چیز ہے جس کو لوگ نہیں سمجھتے ہیں تبلیغ کریں لیکن زبردستی نہ کریں۔ خدا کے ہاں ہر کوئی انفرادی حیثیت میں حاضر ہوگا میں اپنے اعمال کے لیے جوابدہ ہونگا ہمارا وجود دوسرے کے لیے خیر کا باعث بنے۔ اپنے خیالات کو لاگو کرنے یا نافذ کرنے کے لیے نہیں ہے لیکن جبر سے کوئی کام کرنے کی اجازت نہیں ہے ہمارے ہاں مسئلہ یہ ہے کہ ہم نافذ کرتے ہیں۔

س۱۰: چین کے مغرب یا ریاست مدینہ میں سے آپ کس کو یوٹوپیا قرار دیں گے؟

ج: چین جبر کا نظام ہے مغرب بہتر ہے ریاست مدینہ ایک آئیڈیئل ہے جس کو حاصل کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔

EXPRE

انٹرویو(خورشید احمد ندیم)

س ۱: کیا ریاست مدینہ ایک مذہبی ریاست تھی؟

ج: مذہبی ریاست نہیں تھی ریاست مدینہ طالبان کی حکومت مذہبی ریاست تھی۔

س ۲: کیا خلافت ایک دینی اصطلاح ہے یا سیاسی اصطلاح؟

ج: خلافت ایک دنی اصطلاح نہیں ہے نماز روزہ کی طرح کیونکہ قرآن پاک میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

س ۳: چین مغربی ممالک یا ریاست مدینہ میں سے آپ کس کو یوٹوپیا کے قریب تر سمجھتے ہیں؟

ج: مذہبی سرگرمیوں کو ریاست کنٹرول کرتی ہے جبر کے ذریعے لیکن امریکہ اور مغربی ممالک میں آزادی کے ساتھ کام ہوتا ہے۔ مثلا کہاں جمعہ ہو گا اور کیا کیا جائے گا ریاست اس کو منظم کر سکتی ہے۔ مسجد کو ایک مذہبی پلیٹ فارم کے طور پر سٹیٹ استعمال کر سکتی ہے حکمرانوں نے اس کام کو مولویوں کے حوالے کر دیا ہے جو حکمرانوں کا کام تھا۔ سعوی عرب میں بھی مذہب کے حوالے سے جبر ہے۔

س ۴: آپ کیا سمجھتے ہیں یوٹوپیا ممکن ہے اور ایسی ریاست ہے یا تھی جس کو آپ یوٹوپیا سمجھتے ہیں؟

ج: یوٹوپیا قائم کرنے کے دو طریقے ہیں یا ذہن میں ایک ایسی سوسائٹی تیار کریں یا پھر ماضی میں ایسا تجربہ ہوا اور میرے نزدیک نہ ماضی اور نہ حال میں ایسا تجربہ ہوا تھا۔

ماضی میں خلافت راشدہ اور اس سے قبل حضرت یوسف علیہ السلام کا دور جس کو مثالی کہا جا سکتا ہے خیالی دنیا لیکن ایک امر واقعہ ہے۔ لیکن یہ بات کرنا کہ اس دور میں کوئی خرابی نہیں تھی تو غلط ہے ایک ایسا سسٹم ہوا اسے اور ایسی چیز کوئی تھی جو سیاست یا ریاست تو میرے خیال میں ویسٹ نے کوشش کی ہے اور بہتر کوشش کی ہے۔

س ۵: ہارون رشید کی طرح آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا مزاج ہی جمہوری نہیں ہے؟

ج: ہمارے کچھ خواب ہیں تاریخ ہے. ہم انتظار میں رہتے ہیں کہ کوئی آئے گا اس کو اپنا savior بنا لیں گے معاشرے کا اجتماعی سسٹم خواب دیکھنا ہے جبکہ جمہوریت اجتماعی دانش کا تصور دیتی ہے خلافت میں اختیارات ایک شخص کے پاس ہوتا ہے اور مغرب اجتماعی دانش کی تلاش میں ہے جو آگے چل کر بہتر فیصلہ کر سکتے ہین۔ کوئی divine الہامی چیز نہیں ہوتی ہے۔ فرد بھی اور معاشرہ بھی آزمائش سے گزر رہے ہیں خوب سے خوب تر کی تلاش جاری ہے۔

س۶: کیا آپ جمہوریت کو خلافت کے قریب تر سمجھتے ہیں؟

ج: خلافت آمرانہ نظام ہے اختیارات کا ارتکاز ہے۔ جمہوریت میں اقتدار کی تقسیم ہوتی ہے۔ اختیارات مقامی حکومت تک تقسیم ہوتے ہیں جبکہ اقتدار میں اختیارات کا منبع ایک ذات نہیں ہے۔

س۷: آپ نے اپنے کالموں میں ریاست مدینہ کے قیام کو ایک معجزاتی عمل قرار دیا ہے جواب ممکن نہیں ہے وضاحت کریں؟

ج: ریاست مدینہ خدائی فیصلہ تھا وہ اللہ نے پہلے سے بتایا تھا ان کے بارے میں اللہ کا خاص قانون تھا اور پیشگوئی کی گئی تھیں۔ رسالت مآب ﷺ کا اقتدار قائم تھا فرشتے مدد کے لیے اترتے تھے۔ اب کوئی الہامی (divine) فیصلہ نہیں آنے والا ہے ہاں ہم اس کو حاصل کرنے کی کوشش ضرور کر سکتے ہیں۔

س۸: سیکولر اسلام اور پاپولر اسلام میں کیا فرق ہے؟

ج: سیکولر اسلام اور پالولر اسلام۔ اصل میں دو چیزیں ہیں سیکولرازم مکمل آئیڈیالوجی ہے پاپولر اسلام ریاست کا پورا انتظام کے مطابق ہے جس کو میں صحیح نہیں سمجھتا ہوں۔

س۹: کیا یوٹوپیا موجودہ مسائل کا حل ہے؟

ج: سٹیٹ کو بنیادی طور پر تحفظ فراہم کرنا چاہیے طاقتور کو سٹیٹ کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ سٹیٹ کو اپنا مذہب یا عقیدہ عوام پر لاگو نہیں کرتی ہے مذہب نافذ کرنا سٹیٹ کی ذمہ داری نہیں ہے جیسے خلافت راشدہ نے سب مذاہب کو تحفظ فراہم کیا اسلام ہماری تسکین کے لیے آیا ہے یہ بنیادی چیز ہے جس کو لوگ نہیں سمجھتے ہیں تبلیغ کریں لیکن زبردستی نہ کریں۔ خدا کے ہاں ہر کوئی انفرادی حیثیت میں حاضر ہوگا میں اپنے اعمال کے لیے جوابدہ ہونگا ہمارا وجود دوسرے کے لیے خیر کا باعث بنے۔ اپنے خیالات کو لاگو کرنے یا نافذ کرنے کے لیے نہیں ہے لیکن جبر سے کوئی کام کرنے کی اجازت نہیں ہے ہمارے ہاں مسئلہ یہ ہے کہ ہم نافذ کرتے ہیں۔

س۱۰: چین کے مغرب یا ریاست مدینہ میں سے آپ کس کو یوٹوپیا قرار دیں گے؟

ج: چین جبر کا نظام ہے مغرب بہتر ہے ریاست مدینہ ایک آئیڈیئل ہے جس کو حاصل کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔